اقصیٰ کے آنسو
فلسطین کا ایک عاشق
الاقصیٰ پبلشرز

اقصیٰ کے آنسو

فلسطین کا ایک عاشق

الاقصی پبلشر

نام کتاب: .... اقصیٰ کے آنسو

مصنف: .... فلسطین کا ایک عاشق

طبع اول: ۱٤۲۷ھ 2006ء

طبع دوم: ۱٤۲۸ھ 2007ء

طبع سوم: ۱٤۲۹ھ 2008ء

ناشر: .... الاقصی پبلشر

نٹ قیمت.. [illegible] روپیہ

ملنے کے پتے

ملک بھر کے تمام بڑے بڑے کتب خانوں سے دستیاب ہے۔

الاقصی پبلشر

فہرست

لعلِ زرّیں کے نام

کتابیں عام طور پر سیاہی سے لکھی جاتی ہیں..... لیکن آپ یقین کریں کہ کاغذات کا جو پلندہ آپ کے ہاتھ میں ہے یہ کتاب تو ضرور ہے..... لیکن اس میں جو کچھ ہے وہ قلم کو سیاہی سے تر کر کے نہیں، خونِ جگر میں اُنگلیاں ڈبو کر لکھا گیا ہے۔

القدس ہمارا وہ عظیم ورثہ ہے جس کے محافظ وخادم کا منصب خالقِ کائنات نے ہمیں بخشا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے جب اس مقدس عبادت گاہ کی حرمت کا تحفظ نہ کیا، اس کی پاکیزہ فضاؤں کو اپنے زہریلے گناہوں سے آلودہ کیا اور بار بار کی تنبیہ کے باوجود باز نہ آئے تو اللہ رب العزت نے انہیں مقام "اجتبائیت" سے معزول کر کے اُمت محمدیہ کو یہ عظیم منصب سونپ دیا۔

اس دن سے ..... جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نصرتِ خداوندی سے القدس فتح کیا..... یہ بارِ امانت ہماری غیرت کا امتحان ہے۔ ہمارے ایمان کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اس کے تحفظ میں ہماری ترقی وبقا کا راز مضمر ہے اور اس کے تقدس پر حرف آیا تو ہم سے "اجتبائیت" کا منصب چھن جانے کا خطرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان! ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جب یہود بے بہبود کے قدم اس کی دہلیز تک آپہنچے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عنقریب حق و باطل کا جو عظیم ترین معرکہ بپا ہوگا، ہم اس میں اہلِ حق کے دست و بازو بن کر اس اجرِ عظیم کو حاصل کر سکتے ہیں جو نیک بختی اور خوش قسمتی کی بہت بڑی علامت ہے اور جو ہماری نجات کا ضامن اور مغفرت کی ضمانت بن سکتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی ایوبی نہیں جس کی قیادت میں معرکہ لڑا جائے جبکہ

اصل بات یہ ہے کہ ہم میں ایوبی بہت ہیں لیکن کوئی زنگی نہیں [1] جو صلاح الدین کو سلطان صلاح الدین ایوبی بنائے۔ ہم میں قدیر خان بہت ہیں لیکن انہیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان بنانے والے نہیں البتہ گودڑی کا کوئی لعل اپنی ذاتی کوششوں سے چمکتا ستارہ بن جائے تو اس کی حوصلہ شکنی اور ناقدری کا رواج عام ہے۔ یہ بربادکن روش ترک کر کے ہمیں جوہر قابل کی حوصلہ افزائی اور مردم سازی کی روایت آگے بڑھانی چاہیے کہ ذرا نم ہو تو بڑی زرخیز ہے یہ مٹی ساقی۔

دجالِ اکبر اس کائنات کا عظیم ترین فتنہ ہے۔ اس فتنے کا مرکز و محور بھی القدس کی سرزمین ہوگی اور اس کا خاتمہ و بربادی بھی یہیں ہوگی۔ اس فتنے کا آغاز تو کھلی آنکھوں نظر آ رہا ہے اور جو لوگ تقویٰ و جہاد پر کاربند رہے وہ اس کا انجام بھی دیکھ لیں گے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس فتنہ اکبری کے خلاف برسرِ پیکار عظیم انسانوں کے ہمسفر و ہمدم ہوں گے۔ یہ چند آنسو انہی عظیم ہستیوں کے نام ہیں۔

کوشش کی گئی ہے کہ یہ عاجزی و بے بسی کے آنسو نہ ہوں، یہ قہرمان اور قہر خیز بارودی فلیتے ہوں۔ ان میں موت کی ٹھنڈک نہ ہو، آتش فشاں کی حرارت ہو۔

آنسوؤں کے ان دو قطروں میں سے ایک مسجدِ اقصیٰ کے ہال کے نام ہے جو قدسی صفت ہستیوں کی سجدہ گاہ ہے اور دوسرا گنبدِ صخرہ نامی اس لعلِ زرّیں کے نام جس کے گرد مقدس روحیں حصار باندھ کر دجالی فوجوں کی یلغار کے مقابلے میں قربانی کی لازوال داستانیں رقم کریں گی۔ اللّٰھم اجعلنا منھم!

شاہ منصور

۱٤۲۸ھ کا پہلا دن

۱۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے مربّی و پیشرو سلطان نورالدین زنگی مراد ہیں جنہوں نے ایوبی میں پوشیدہ جوہر قابل کو جانچ کر اُسے اپنا جانشین بنایا تھا اور بے مثال خوبصورتی کا حامل ایک منبر بنا کر خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے مسجد اقصیٰ کی فتح کے بعد اس میں نصب کیا جائے۔

مسجد اقصیٰ کے نام

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کی عزت کی علامت اور فتح و سرخروئی کا نشان ہے۔ یہودیوں کے حالیہ سفاکانہ حملے میں یہودی فوجیوں نے نہتے فلسطینیوں کے خلاف ٹینک اور گن شپ ہیلی کاپٹر استعمال کرتے ہوئے مسجد اقصیٰ میں مسلمانوں کی خون کی ندیاں بہادیں جس سے سارا عالم اسلام خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ضرب مومن اس نازک تاریخی موڑ پر اپنا فرض ادا کرنے کے لیے ایک انقلاب آفریں تاریخی، معلوماتی اور تحقیقی سلسلہ شروع کر رہا ہے۔ جس میں ارض مقدس فلسطین کی فضیلت اور اہمیت سے لے کر حرم قدسی کے مکمل تعارف اور تاریخ تک اور فلسطین میں یہودی ریاست کی داغ بیل ڈالنے کے ناپاک منصوبے کے آغاز سے لے کر مسجد اقصیٰ کو نعوذ باللہ شہید کرنے کی سازشوں تک ہر چیز کو انوکھے انداز میں بے نقاب کیا جائے گا۔ اس میں قارئین پہلی مرتبہ وہ مستند علمی تحقیقات، سنسنی خیز انکشافات اور کچھ منتخب نادر و نایاب تصویریں اور نقشے ملاحظہ فرمائیں گے جو اس سے پہلے کسی جریدے میں شائع نہیں ہوئیں۔ یہ سلسلہ ایک مستند دستاویز کے طور پر ہی نہیں بلکہ جذبۂ جہاد کی روح پھونکنے اور بیداری کی لہر دوڑا دینے کے حوالے سے بھی ان شاء اللہ عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔

بے وفائی:

اس میں شک نہیں کہ بے وفائی بہت بری خصلت ہے اور اعلیٰ ظرف و جوانمرد لوگوں کی نظر میں نہایت افسوسناک چیز ہے، لیکن جس طرح کی بے وفائی اور بے مروتی عصر حاضر کے مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ سے برتی ہے، وہ ایسی دردناک اور الم انگیز ہے کہ تاریخ عہد وفا اور روداد جور و جفا میں اس کی نظیر نہیں ملے گی۔ مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے نزدیک تیسرا مقدس ترین

مقام ہے۔اس کی حفاظت وخدمت اور ناپاک صلیبیوں اور غلیظ صہیونیوں سے اس کا تحفظ ان کا اوّلین فرض ہے لیکن ان کا تعلق اب اس سے اتنا رہ گیا ہے کہ سال میں ایک دفعہ واقعہ معراج کے حوالے سے وہ اس تاریخی مقام کا تذکرہ کرلیں یا اسرائیل کی طرف سے اس کی بے حرمتی کی خبر نشر ہونے پر اونگھتے ہوئے شخص کی طرح آدھے سوتے اور آدھے جاگتے سن لیں، بس اتنا کافی ہے......اس سے آگے کا نہ کبھی ان کے ذہن میں کوئی خیال آتا ہے اور نہ کبھی اس سانحے کا احساس ہوتا ہے جو ان کے جیتے جی رونما ہو چکا ہے۔ دنیا کی مردود و مبغوض ترین قومِ یہود نہ صرف ارضِ فلسطین پر تسلط جما چکی ہے اور باہر کے مسلمانوں کا یہاں داخلہ ممنوع قرار دیا جا چکا ہے بلکہ مسجد اقصیٰ کے گرد ان کی کئی قسم کی سرگرمیاں اور مذہبی رسومات جاری ہو چکی ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ آج فلسطینی مسلمان کم از کم وہاں نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن جس منصوبہ بندی سے یہودیوں کی پیش قدمی اور حالات پر گرفت مضبوط کرنے کا عمل جاری ہے اور جس کمال بے نیازی اور بے حسی کا مسلمان حکمران مظاہرہ کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ خاکم بدہن کہیں وہ وقت نہ آجائے جب صہیونی ریاست کو پایہ تکمیل پہنچانے کے لیے سرگرم عمل یہودی اس اسلامی ورثے میں مسلمانوں کا داخلہ بند کر کے اسے مکمل طور پر یہودی عبادت گاہ قرار دے دیں۔

صورتحال کی سنگینی:

آج ہم واقعہ معراج کی یاد بہت گرمجوشی اور شان وشوکت سے مناتے ہیں لیکن افسوس کہ اسراء و معراج کے سنگم ''مسجد اقصیٰ'' کے یہودیوں کے پاس چلے جانے کا غم اس دن کوئی نہیں مناتا۔اس روز ہماری مساجد جگمگا رہی ہوتی ہیں لیکن عین اس وقت مسجد اقصیٰ پر اندھیروں اور صہیونی تسلط کا راج ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں عظیم الشان محفلیں منعقد ہو رہی ہوتی ہیں لیکن مسجد اقصیٰ کی سوگوار فضا میں ویرانی ڈیرہ ڈالے ہوتی ہے۔شب معراج کو ہمارے مذہبی معاشرے میں مرکزی حیثیت دی جاتی ہے لیکن مقام معراج کے تحفظ اور اس کی خاطر جہاد کرنے والوں کو ضمنی درجہ بھی نہیں دیا جاتا۔ ہمارے خطباء واقعہ معراج کی تفاصیل اور اس رات کی فضیلت سناتے سناتے صبح کر دیتے ہیں لیکن بیت المقدس پر جوشِ غم چھائی ہے۔اس کی صبح کب اور

کیسے ہوگی؟ اس کا نہ کوئی ذکر کرتا ہے، نہ اس کے اندھیرے کو کم کرنے اور صبح کی کرنوں کا راستہ بنانے کی فکر ہوتی ہے۔ یہودیوں کا اصرار ہے کہ مسلمان القدس سے دستبردار ہو کر یروشلم سے باہر ابودلیس نامی گاؤں کو مقدس مان لیں، اس کے لیے وہ فلسطینی مسلمانوں پر ہر طرح کا دباؤ ڈال رہے ہیں، ظلم و جبر کر رہے ہیں لیکن ہمارے دانشوروں اور رہنماؤں کو اس کا علم ہے نہ اس کے توڑ کے لیے کچھ کرنے کا شعور۔ یہودیوں نے فلسطین کی حدود کو مسلمانانِ عالم کے لیے مکمل طور سے سیل کر دیا ہے، باہر کا کوئی کلمہ گو وہاں داخل نہیں ہو سکتا، اندر کے نہتے مسلمان ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، مسجد اقصیٰ کی ایک دیوار کو انہوں نے اپنی عبادت کے لیے مخصوص کر لیا ہے حرم قدسی کے مقام پر ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لیے ان کی منصوبہ بندی روز بروز آگے بڑھ رہی ہے لیکن ہمارے یہاں صورتحال کی سنگینی کا کسی کو ادراک ہے، نہ گولیوں کا مقابلہ پتھروں اور ٹینکوں کا مقابلہ غلیلوں سے کرنے والے فلسطینی مسلمانوں کی تنہائی اور بے بسی کا احساس۔ اس عالم میں مسجد اقصیٰ پکارتی ہے: اے اہل اسلام! تمہاری غیرت کو کیا ہوا؟ کیا تم صرف سجدوں پر بخش دیے جاؤ گے؟ کیا شعائر اسلام کے تحفظ کے بغیر تمہاری عزت باقی رہ سکتی ہے؟ کیا مسجد اقصیٰ کے بعد دوسری مساجد محفوظ رہ سکتی ہیں؟ لیکن مسلمان اپنے حال میں مست ہیں۔ ان کے خیال میں جمعہ و عیدین میں شرکت اور شب معراج منا لینا، اسلام سے مضبوط تعلق کی نشانی ہے۔ جس جس نے یہ سب کچھ کر لیا اس سے روز قیامت مسجد اقصیٰ کے تحفظ کے لیے کوئی سوال ہوگا نہ بے دردی سے مارے جانے والے مظلوم فلسطینیوں کے انتقام کے لیے کچھ نہ کرنے پر اس سے پوچھ ہوگی۔ نہ یہودیوں کے ظلم کے خاتمے کے لیے کچھ سوچنا ان کے فرائض میں شامل ہے اور نہ روتی چلاتی ماؤں، بہنوں اور سسکتے کراہتے نوجوان زخمیوں کے لیے کچھ کرنا ان کی شرعی و اخلاقی ذمہ داری ہے۔

سکون میں چھپا طوفان:

جس طرح طوفان کی آمد سے قبل سمندر کی سطح پُرسکون ہوتی ہے اسی طرح کچھ عرصے سے فلسطین پر قابض یہودیوں کی طرف سے کوئی بڑی کارروائی نہ ہونا اس جانکاہ حادثے کا پیش

خیمہ تھی جو گزشتہ سے پیوستہ جمعہ کو مسجد اقصیٰ میں پیش آیا۔ اس واقعے نے کاروبار زندگی میں مگن اہل اسلام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور اُمّتِ مسلمہ کو بتا دیا ہے کہ مظلوم فلسطینی مسلمانوں کی دادرسی اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی زبانی مذاکرات یا کلامی مباحثات سے نہیں، جہاد کے ذریعے شہادت کے راستے سے ہوگی۔ اس کے لیے نہ امریکا کی طرف دیکھنے سے کوئی فائدہ ہوگا نہ بیان بازی یا مطالبات سے کچھ حاصل ہوسکتا ہے بلکہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہودیوں کے لیے کیسے ممکن ہوا کہ وہ ۲۲ ہزار کے مسلمانوں کے مجمع میں گھس جائیں اور ان کے سروں پر گولیاں برسا کر انہیں مسجد خالی کرنے پر مجبور کریں؟ کیا صرف اس لیے نہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو نہتے ہونے پر مجبور کر رکھا ہے اور خود ان کی فوج ہر طرح کے اسلحے سے لیس اور ان کا ہر شہری تربیت یافتہ ہے۔ فلسطینی مسلمانوں میں شوقِ شہادت کی کمی نہیں، لیکن ان کی جو قیادت عالمی برادری کے سامنے ان کا مقدمہ لڑ رہی ہے، وہ انتہائی نااہل، جذبۂ جہاد سے محروم اور غیر مخلص ہے، اس نے یہودیوں کے تسلط کا راز جاننے اور اس کے خاتمے کے حقیقی اسباب کو اپنانے اور اس کے لیے فلسطینی مسلمانوں کو تیار کرنے کی بجائے نام نہاد اتھارٹی قائم کر کے مذاکرات اور بات چیت کی جو ریت ڈال رکھی ہے، اس نے مسلمانوں کو بھی دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اور کافروں کو بھی اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ فلسطینی عوام اور ان کی وہ تنظیم جو علماء وقت اور جذبہ جہاد رکھنے والے رہنماؤں کی سرپرستی میں کام کر رہی ہے، اسباب و وسائل نہیں رکھتی، عالمِ اسلام کے صاحب دل لوگوں سے اس کے رابطے نہیں، اور یوں فلسطینی مسلمان بے بس ولاچار اور بے یارو مددگار یہودیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور خدا کی مغضوب وملعون اور انبیائے کرام کی گستاخ یہودی قوم روز بروز اپنے مکروہ منصوبوں کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔

آخر اس قدر بے توجہی کیوں؟

اس مرتبہ یہودیوں نے جو جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے، وہ ان کے عزائم اور مستقبل کے منصوبوں کا صاف پتہ دے رہا ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے اندر بے تحاشا اور

اندھا دھند گولیاں چلائیں بلکہ بعد میں گن شپ ہیلی کاپٹروں میں بیٹھ کر مسلمانوں کے گھروں پر راکٹ فائر کیے اور ٹینکوں کو سڑکوں پر لا کر نہتی شہری آبادی پر براہ راست گولہ باری کے ذریعے ان کے احتجاج کو دبانے کی کوشش کی۔ان کے رویے میں یہ شدت کسی بڑے حادثے کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ یہودیوں نے خاموشی کے اس عرصے میں زیر زمین تیاری کی، ردعمل کی شدت کا اندازہ لگایا، عالمِ اسلام کی ارض مقدس فلسطین سے بے رخی اور فلسطینیوں کی حالت زار سے بے توجہی کا مشاہدہ کیا اور پھر اچانک تشدد کی یہ سفاکانہ لہر برپا کر دی۔اس کی جو تفصیلات اب تک سامنے آئی ہیں اور جس طرح نوجوانوں کو قریب سے فائرنگ کر کے بے دردی سے شہید کیا گیا ہے، خواتین کی جو آہ و فریاد اور فلسطینیوں کی لاچاری کے جو مناظر دیکھنے کو ملے ہیں، ان سے سینہ شق ہو جاتا ہے، جگر لہولہو ہوا جاتا ہے، دل انتقام کی آگ سے آتش فشاں کی طرح بھڑکتا ہے۔اے مسلمانو! خدا کے واسطے! ذرا سوچو اب باقی کیا رہ گیا ہے؟ بابری مسجد کا زخم مندمل نہ ہوا تھا کہ مسجد اقصیٰ پر وار ہونے لگا ہے۔اب تو جہاد پر آ جاؤ، جہاد کی تربیت حاصل کرو، اس کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دو، اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کو پہنچو، ان بے بسوں کی فریاد رسی کرو۔ خدا نے جس کو جو دے رکھا ہے آج وقت ہے کہ وہ اس کو ان بے سہارا مظلوموں کی مدد کے لیے استعمال کر کے اپنی نجات کا سامان کرے۔ دنیا بھر کے یہودی اسرائیل کو اپنا مقصود و مطلوب قرار دے کر اس کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو کوئی انسان اپنے مقصد کی خاطر کر سکتا ہے جبکہ ان کی کوششوں پر ذلت و رسوائی کی غیبی مہر لگی ہوئی ہے، تو مسلمان خدا کی رحمت کے حصول سے اتنے مایوس اور اپنے انجام کی فکر سے اتنے بیزار کیوں ہو گئے کہ وہ فلسطین اور اس کے بے سہارا باسیوں کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں؟؟

حکمرانوں کی عدم دلچسپی:

اس حوالے سے سب سے زیادہ ذمہ داری مسلمان حکمرانوں کی بنتی ہے۔عوام تو مظاہرہ اور احتجاج کے سوا کیا کر سکتے ہیں؟ اگر کسی کی بات میں وزن ہے یا کوئی فلسطینی مسلمانوں کے لیے مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے تو وہ حکمران ہیں لیکن وائے افسوس! وہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ

اسرائیل جبر وستم کی حدوں سے گزر گیا ہے اور اب حکمرانوں کی طرف سے مؤثر آواز اٹھائے بغیر اس کو لگام دینی مشکل ہے لیکن اس کے باوجود وہ امریکا کے خوف سے اس بارے میں کچھ نہیں کہتے کہ کہیں دنیا کی واحد سپر پاور اپنے پالے ہوئے جنگلی سور کے خلاف بولنے پر ناراض ہو کر ان کے اقتدار کے خلاف سازشیں نہ شروع کر دے......لیکن قسم خدائے بزرگ و برتر کی! اس سنگین ظلم پر خاموشی اتنا سخت گناہ اور خدا تعالیٰ کی ایسی شدید ناراضگی کا سبب ہے کہ امریکا آپ کے اقتدار کا حامی ہو یا مخالف، اس بے حسی کے جرم پر قدرت کی گرفت اس دنیا میں ہی ہو کر رہے گی اور امریکا کی مخالفت سے خدا کی پناہ پکڑی جا سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ بھی نہیں ملے گی۔

انجامِ گلستاں:

اس وقت مسلم امہ ایسے انتشار کا شکار ہے اور مسلمان عوام ایسے بے بس ہو چکے ہیں کہ اتنے بڑے واقعے پر چند ایک بیانات اور مطالبات کے علاوہ کوئی قابل ذکر ردعمل سامنے نہیں آیا۔ دوسری طرف تمام بڑی بڑی غیر مسلم طاقتیں اسرائیل کے ساتھ ہیں اور اس کو اتنا مضبوط کر چکی ہیں کہ نہتے فلسطینی مسلمان تو کجا، کوئی عرب یا غیر عرب ملک اس کے خلاف کوئی مضبوط قدم نہیں اٹھا سکتا، سب مذاکرات پر زور دیتے ہیں اور ان کی کامیابی کی تمنا کرتے ہیں لیکن آج تک اس سے قبل دنیا میں کسی حقدار کو اس کا حق بات چیت سے نہیں ملا، یہود جیسی مکار قوم مسلمانوں کو اگر ان کا حق زبانی کلامی کوشش سے دے دے تو اسرائیل کے قیام کی ضرورت ہی کیا تھی؟ فلسطینی مسلمانوں نے تو ہمت نہیں ہاری۔ وہ جدید ترین اسلحے کا مقابلہ غلیل سے کر رہے ہیں اور ایک ہتھیار ان کے پاس ایسا ہے جو اس وقت کام دیتا ہے جب سارے ہتھیار ناکام ہو جائیں یعنی فدائی حملہ......سو اس وقت فدائی حملے ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں، مسجد اقصیٰ اگر وہ واپس نہیں لے سکتے تو اس کے لیے جان تو دے سکتے ہیں، سو وہ دے رہے ہیں......لیکن فلسطین سے باہر دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے سوچنے کا مقام یہ ہے کہ صورتحال یہی رہی تو انجامِ گلستاں کیا ہوگا؟ فلسطینی مسلمانوں کو اس مشکل وقت میں تنہا چھوڑ دیا گیا تو دنیا

بھر میں جہاں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ان کے خلاف دشمنان اسلام تباہ کن یلغار کے لیے پر تولے بیٹھے ہیں، ان کے تحفظ کی کیا ضمانت رہ جائے گی؟

اے ایوبی کے فرزندو!

کاش! آج کوئی سلطان صلاح الدین ایوبی نہیں جو تاریخ کا رخ موڑ سکے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ مسلم اُمّہ بانجھ ہو چکی ہے۔ آج بھی سلطان صلاح الدین کے جانشین پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلم نوجوانوں میں لہو ولعب کو رواج دینے کی بجائے مقاصد عالیہ کے حصول کی فکر پیدا کی جائے، انہیں فسق وفجور کے رجحانات سے بچا کر جہاد کے ذوق اور شہادت کے شوق سے آشنا کیا جائے، ان میں فحاشی و بے راہ روی کے جراثیم کے پھیلاؤ کی روک تھام کر کے ایثار وتقویٰ کا جوہر پیدا کیا جائے۔ بخدا! آج ایوبی کے کتنے فرزند ہیں جو اس کے جانشین بن سکتے ہیں لیکن انہیں مُردار دنیا کا طالب اور عیش پرستی کا دلدادہ بنا دیا گیا ہے۔ کتنے ہی مسلم نوجوان ایسے ہیں جو اپنے وقت اور صلاحیتوں کو صحیح مصرف میں استعمال کریں تو مسجد اقصیٰ کی جنت گم گشتہ مسلمانوں کو واپس دلا سکتے ہیں لیکن انہیں عزت وشہادت کے راستے سے ہٹا کر بے مقصد کھیل، تفریح اور فضول مشغولیات میں لگا دیا گیا ہے۔

اے ایوبی کے فرزندو! اپنے مقام اور ذمہ داریوں کو پہچانو! مسجد اقصیٰ کی سوگوار فضا سے آنے والی صداؤں کو سنو اور بدبخت یہودیوں کو ان کے آخری انجام تک پہنچانے کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ، ورنہ جیسے یہ دنیا ہم پر تنگ کر دی گئی ہے، کل قبر بھی ایسی تنگ نہ ہو جائے کہ زمین ہماری لاشوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔

اے مسجد اقصیٰ! تجھے عزت بخشنے والے کی قسم! تیرے بیٹے تجھے واگزار کرانے کے لیے جان کی بازی لگا کر رہیں گے۔ اگر تجھ تک نہ پہنچ سکے تو تیرے گرد اپنے خون اور جسموں سے ایسی باڑ ضرور تعمیر کر دیں گے جو تیرے دشمنوں کو تجھ تک نہ پہنچنے دے گی۔

''قولِ فیصل''

روئے زمین پر آج سب سے بڑا ظلم فلسطین میں ہو رہا ہے۔ فلسطین میں صدیوں سے آباد، عرب باشندوں کو بے وطن کر دیا گیا ہے۔ ایک سازش کے تحت دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر وہاں بسایا گیا اور اسرائیل کی ناجائز مملکت قائم کر کے عربوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے گئے ہیں۔ فلسطین پر عربوں کا حق ثابت کرنے کے لیے درج ذیل نکات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ نکات اس تقریر سے اخذ کیے گئے ہیں جو عالمِ اسلام کے نامور شخصیت، سعودی عرب کے فرمانروا، شاہ فیصل مرحوم نے ایک بین الاقوامی سیمینار میں کی تھی:

☆......یہودی فلسطین کے اصل باشندے نہیں ہیں۔

☆......یہودی دراصل بیرونی حملہ آور تھے جو فلسطین پر طاقت سے مسلط ہونے کے بعد کچھ عرصہ فلسطین میں رہے اور اس کے بعد نکال دیے گئے۔

☆......فلسطین میں ان کی موجودگی کا عرصہ نہایت مختصر تھا۔

☆......فلسطین میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے لے کر اب تک کبھی خالص یہودی حکومت قائم نہیں ہوئی۔

☆......فلسطین میں یہودیوں کی کبھی اکثریت نہیں رہی۔

☆......جب فلسطین سے یہودیوں کو نکالا گیا تو اس میں صرف اس کے اصل باشندے ہی رہ گئے جو شروع سے لے کر آج تک وہیں رہ رہے ہیں۔

☆......سولہ سو سال کی طویل مدت کے دوران فلسطین میں کبھی کوئی یہودی آباد نہیں رہا۔

☆......عربوں کی حکومت تقریباً ساتویں صدی سے فلسطین میں رہی۔

☆......آج وہاں سیکڑوں تاریخی عمارات موجود ہیں جو عرب طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔

معتصم !تم کہاں ہو؟

غیرت مند نسلیں:

بے بس اور مظلوم عورت کی چیخیں جتنی تیز ہوتیں، سنگ دل رومی (آج کا یورپ اس زمانے میں روم کہلاتا تھا) کے قہقہے اتنے ہی بلند ہوتے جاتے تھے۔اس نے ایک زور کا تھپڑ بھی عورت کے منہ پر جڑ دیا۔عزت دار خاتون سے یہ ذلت برداشت نہ ہوئی تو وہ بے اختیار پکار اٹھی: اے معتصم !تم کہاں ہو؟ اے ہمارے حکمران! ہماری مدد کون کرے گا؟ مرد اس کی یہ بات سن کر اور بھی گلا پھاڑ کر ہنسا۔ بے وقوف عورت کو دیکھو بھلا اس کی خاطر خلیفۂ وقت مدد کو آئے گا؟ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمانوں میں ایک جسم ہونے کا احساس باقی تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کسی ایک کو مشکل، آفت یا دشمن نے گھیر رکھا ہو اور دوسرا اپنی روزمرہ کی معمول کی زندگی میں بدستور مصروف رہے۔اسے اپنے بھائی کی مشکل دور ہونے تک چین نہ آتا تھا۔ بغداد کی مسند خلافت پر معتصم باللہ موجود تھا اور یہ مظلوم عورت اس سے سینکڑوں میل دور رومیوں کے علاقے میں واقع ''عموریہ'' نامی قلعے میں قید تھی۔ معتصم باللہ اپنے آباء واجداد جیسا کوئی بہت ہی صاحب جلال اور باکمال حکمران نہ تھا مگر اس کی رگوں میں غیرت مند خون دوڑ رہا تھا اور اس زمانے کے عام حکمران بھی غیرت وحمیت میں اپنی مثال آپ ہوا کرتے تھے۔ اسے کسی طرح خبر ہوگئی کہ اس مظلوم عورت نے اس کی غیرت کو جھنجھوڑنے والی صدا لگائی ہے۔ اس پر دن کا سکون اور رات کا آرام حرام ہوگیا۔اس نے خبر لانے والے سے یہ نہ پوچھا کہ اس قلعہ میں کتنی فوج ہے؟ اس کا سوال یہ تھا کہ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ یہ قلعہ ہے کہاں؟ اس کے بعد اس نے صبح شام جنگی تیاریاں شروع کردیں اور آندھی طوفان کی طرح پہنچ کر اس قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ مسلمانوں کی فوج کا غیظ وغضب اتنا شدید اور ان کے حملے اتنے زوردار تھے کہ قلعے کی

بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔دشمن کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا اور جب وہ سنگ دل شخص جو قیدی عورت پر ظلم ڈھاتا تھا، گرفتار کر کے معتصم باللہ کے سامنے لایا گیا تو اسے علم ہوا کہ یہ قوم واقعی غیرتمند ہے جو اپنے ایک فرد کے بدلے کے لیے بھی اس طرح بے چین ہوتی ہے جیسے انسان اپنی چھنگلی کی تکلیف پر بے تاب ہو اٹھتا ہے۔

زیادہ دور کی بات نہیں:

مسلمانوں کی یہ قابل فخر عادت آج کل غیر مسلموں نے اپنا لی ہے۔دنیا میں کہیں کسی ایک بھی امریکی کو کچھ ہو جائے تو وہائٹ ہاؤس، پینٹا گون سے سر جوڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس وقت تک اپنا سب کچھ امریکی شہریوں کے لیے جھونک دیتا ہے جب تک ان کو تحفظ کی چھاؤں میسر نہیں آ جاتی۔اس کے برعکس مسلمان ایک دوسرے پر ٹوٹنے والے مصائب کے پہاڑوں کی گڑگڑاہٹ بھی معمول کے واقعے کی طرح سنتے ہیں اور پھر اپنے کاموں میں مگن ہو جاتے ہیں۔کوئی زیادہ دور کی بات نہیں ہے، کچھ عرصہ قبل بھی یہ عالم تھا کہ اگر کسی مسلمان ملک پر حملہ ہوتا تو عالمِ اسلام میں دکھ اور فکر کی لہر دوڑ جاتی۔خوشی کی تقریبات موقوف کر دی جاتیں اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے لیے حسب توفیق امداد اور تعاون کی ممکنہ صورتوں پر غور اور عمل کیا جاتا،مگر جب سے مغربی میڈیا نے غیر مسلم ثقافت کا زہر مسلمانوں کے دل و دماغ میں انڈیل کر انہیں نفس پرستی کا عادی، عیش و عشرت کا دلدادہ اور بھوک و جنس کا غلام بنا دیا ہے، اس کے بعد ان کی بلا سے کہیں کچھ بھی ہوتا رہے، وہ دنیا پرستی کی دھن میں غرق رہتے ہیں۔

شاید......شاید......

فلسطین کی بیٹیوں نے جب دیکھا کہ کوئی حجاج یا معتصم نہیں رہا جو ان کی چیخوں کو اپنے جگر گوشوں کی پکار کی طرح سنے اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ آج کے جدید تعلیم یافتہ حکمران ان کی دلدوز صداؤں پر اتنی توجہ بھی نہ دیں گے جتنی وہ صبح صبح اپنے چہرے کی کھدائی لپائی اور اپنے لباس کے کلف اور کریز پر دیتے ہیں، تو انہوں نے ان سنگ دل روشن خیالوں کو پکارنے کی بجائے خود میدان عمل میں اترنے کا فیصلہ کیا۔تادمِ تحریر فلسطین کی تین تعلیم یافتہ اور اونچے خاندانوں کی بچیاں اپنے جسم سے بم باندھ کر دشمن کے لیے قہر بن کر نازل ہو چکی ہیں اور انہوں نے اپنے جسم کے بکھرے ٹکڑوں اور خون کی پھوٹتی چھینٹوں کے ذریعے

اُمّت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاید ان معصوم بچیوں کی قربانی دیکھ کر کوئی مسلم نوجوان دنیا کے جھمیلوں سے پیچھا چھڑا کر خود کو مظلوم مسلمانوں کے لیے وقف کر دے۔ شاید کسی کے دل میں غیرت کی کوئی چنگاری شعلہ پکڑ لے۔ شاید...... شاید......

بغیر پیندے کے لوٹے:

غضب ہے کہ اسرائیل کے درندہ صفت اقدامات کے باعث جاپان میں مظاہرے اور فرانس میں یہودی املاک پر حملے شروع ہو گئے ہیں لیکن مسلمان ممالک فلسطینیوں کی بے پناہ مظلومیت کے باوجود ان کی مدد سے گریزاں ہیں۔ بزدلی اور منافقت کی انتہا دیکھیے کہ لبنان میں عرب ممالک اور کوالالمپور میں تمام مسلم ممالک جمع ہوئے لیکن خود کچھ کرنے کی بجائے اقوام متحدہ سے مطالبہ کرتے رہے کہ اس نے جس بھیڑیے کو کھلا چھوڑ رکھا ہے اسے لگام دے تاکہ زخمی فلسطینیوں کی چیخ و پکار سے ان عزت مآب حکمرانوں کے آرام و سکون میں خلل نہ پڑے۔ عالمِ اسلام کے نمائندہ ان بہادر اور ذی وقار حکمرانوں سے نہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ یہودیوں کا معاشی بائیکاٹ کریں یا کم از کم اپنا پیسہ ان کے بینکوں سے نکلوالیں، نہ وہ اتنی جرأت کرتے ہیں کہ اپنے دشمنوں کو تیل کی فراہمی بند کر دیں یا ان کے سرپرستوں کی عاجزانہ جی حضوری کی ذلت کو خیر باد کہہ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ نہ انہوں نے کبھی مل کر یہ سوچا ہے کہ فلسطینی مسلمانوں کی مدد کے لیے کچھ کریں یا فلسطینی مہاجرین کی کفالت کا ذمہ لے لیں۔ غضب خدا کا ایک ارب مسلمانوں کے یہ نمائندے چند لاکھ یہودیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کیا ان کا مقابلہ کرنے والے نہتے نوجوانوں اور بچوں کے کچھ کام بھی نہیں آ سکتے؟ اگر موت کے ڈر یا شدت پسندی کے الزامات کے خوف سے فدائی مجاہدین کی حوصلہ افزائی ان کے بس میں نہیں تو کیا مہاجر کیمپوں میں پڑے بے بس مسلمانوں کی سرپرستی یا ہسپتالوں میں زخموں سے بے حال بچوں کی خبر گیری بھی ان کے لیے ممکن نہیں؟ سچ ہے غیرت کے بغیر انسان ایسا ہی ہے جیسے پیندے کے بغیر لوٹا۔ جہاں کہیں پڑا رہے یا جو اسے جہاں لڑھکا دے اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔

کاش! آج اُمّت میں عمر بن عبدالعزیز نہ سہی، معتصم باللہ جیسے حکمران ہوتے تو فلسطینی مسلمانوں کو اپنی بے بسی کا احساس یوں نہ ستاتا۔

القدس تاریخ کے تناظر میں

☆ ۳۰۰۰ قبل مسیح کنعانیوں (یبوسیوں) نے اس کو بنایا۔

☆ ۱۸۵۰ قبل مسیح حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں آئے اور یہاں کے بادشاہ سے ملے۔

☆ ۹۷۰۔۹۳۱ قبل مسیح ''القدس'' پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت رہی۔

☆ ۵۸۷ قبل مسیح بخت نصر کے ہاتھوں یہ تباہ کر دیا گیا اور یہاں کے یہودی قیدی بنا لیے گئے۔

☆ ۱۳۵ میں رومی بادشاہ ہدریان نے یہاں سے یہود کو نکال باہر کیا۔

☆ ۴۰۰۔۶۳۶ میں القدس بزنطینی استعمار کے زیر نگیں رہا۔

☆ ۱۵ ہجری، ۶۳۶ عیسوی میں مسلمانوں نے معرکہ یرموک کے بعد ان علاقوں کو آزاد کرایا۔

☆ ۱۷ ہجری، ۶۳۸ء میں ۳۰۰۰ صحابہ نے اسے فتح کیا اور یہاں کے پادری صفرونیوس نے شہر کی چابیاں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حوالے کیں اور معاہدہ کیا۔

☆ ۴۹۳ ہجری، ۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے یہاں پر قبضہ کیا۔

☆ ۵۸۳ ہجری، ۱۱۸۷ء میں معرکہ حطین میں صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے صلیبیوں کو شکست فاش دی اور القدس کو آزاد کرایا۔

☆ ۶۵۸ ہجری، ۱۲۶۰ء میں معرکہ عین جالوت ہوا جس میں القدس کو تاتاریوں سے آزاد کرایا گیا۔

☆ ۹۲۴ ہجری، ۱۵۱۶ء میں عثمانی خلافت نے اسے اپنا حصہ بنالیا۔

☆ ۱۳۳۶ ہجری، ۱۹۱۷ء میں پہلی جنگ عظیم ہوئی، خلافت عثمانیہ ختم کر دی گئی اور القدس

انگریز کے قبضے میں چلا گیا۔

☆ ۱۹۱۷ء میں ''بالفور'' معاہدہ ہوا اس کے تحت یہاں ''یہودی ریاست'' قائم کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

☆ ۱۳۶۸ ہجری، ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے ۷۸ فیصد علاقے میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔

☆ ۱۳۸۷ ہجری، ۱۹۶۷ء میں یہود نے فلسطین کے باقی ماندہ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

☆ ۱۴۰۸ ہجری، ۱۹۸۷ء میں یہودیوں کے خلاف جدوجہد کا اعلان کر دیا گیا۔

القدس کے نام (۱)

دھندلائی حقیقتیں:

وقت کی گرد کیسی کیسی حقیقتوں کو دھندلا دیتی ہے؟ اور جب کسی چیز کے وارث ہی اس سے غافل ہو جائیں تو کس بے دردی اور صفائی سے وہ چیز ان سے چھین لی جاتی ہے؟ اس کی مثال دُنیا کی مقدس تاریخی عمارت مسجد اقصیٰ ہے۔ مسجد اقصیٰ کو جلیل القدر انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء کی جبین نیاز کا بوسہ لینے کا شرف حاصل ہے، یہاں وحی کا نزول ہوتا رہا، قرآنی شہادت کے مطابق برکات آسمانی بے پایاں رحمت کی شکل میں اس کی مقدس چار دیواری میں اترتی رہیں، یہیں سے رب العزت اپنے آخری نبی کو معراج پر لے گئے، یہ مسلمانوں کا قبلہ اول ہے اور یہاں ایک نماز کا ثواب ایک روایت کے مطابق پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے۔

افسوس! کہ اس دور کے مسلمان اس کی زیارت سے محروم ہیں اور عرصہ دراز سے باہر کے مسلمانوں کو اس کی زیارت اور یہاں نماز کی ادائیگی کا موقع نہیں ملا۔ ذیل میں القدس شہر اور مسجد اقصیٰ کی مختصر تاریخ، تعارف اور یہودیوں کے اس کے متعلق باطل دعویٰ کی تردید پیش کی جاتی ہے۔ شاید کسی صاحبِ ایمان کے دل میں اس ظلم کے خاتمے کے لیے چنگاری پیدا کر دے جو یہود نے برپا کر رکھا ہے۔

مقدس تاریخ کے آئینے میں:

القدس، یروشلم کا عربی نام ہے جسے زمانہ قبل اسلام میں ''ایلیا'' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ ۳۵ درجہ طول شرقی اور ۳۱ درجہ عرض شمالی پر واقع ہے، بحر روم سے اس کی اونچائی ۷۵۰ میٹر اور بحر مردار

کی سطح سے اس کی بلندی ۱۱۵۰ میٹر ہے۔ بحر روم سے اس کا فاصلہ ۵۲ کلومیٹر، بحر مردار سے ۲۲ کلومیٹر اور بحر احمر سے ۲۵۰ کلومیٹر ہے۔ القدس دُنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ یہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے ہاں یکساں طور پر متبرک ہے، اس شہر کی آب وہوا نہایت عمدہ اور صحت افزا ہے۔ یہاں میوے کثرت سے اور نہایت لذیذ اور شیریں ہوتے ہیں۔ القدس کی جو تاریخ آج کی انسانی دُنیا کو معلوم ہے اس کے مطابق یہ تقریباً ۴۵ صدیاں پرانا شہر ہے۔ یہاں ساڑھے چار ہزار سال قبل عربوں کی ایک شاخ کنعانی اور یبوسی آباد تھے۔ ۲۵۰۰ قبل مسیح انہوں نے یہاں اپنی بستیاں بسائیں اور قلعے تعمیر کیے۔ پھر ۱۰۴۹ قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے فتح کیا اور ان کے فرزند سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں اسے بہت ترقی حاصل ہوئی۔ ۵۸۶ قبل مسیح میں یہ اہل فارس کے قبضے میں آ گیا جب بخت نصر نے یہاں یلغار کی۔ یہودیوں کا قتل عام کیا اور جو باقی بچ گئے انہیں غلام بنا کر بابل لے گیا۔ فارس والوں کے یہاں پر اقتدار کا سلسلہ اسکندر کے قبضے تک جاری رہا جو ۳۳۲ ق م میں ہوا۔ ۶۳ ق م میں یہاں رومی قابض ہوگئے۔ ان کے ایک بادشاہ ہیبر ڈوس نے ۱۳۵ء میں اس شہر کو بالکل تباہ کر دیا اور یہاں نیا شہر ''ایلیا کابتولینا'' کے نام سے بسایا۔ رومیوں کے دورِ حکومت میں یہ شہر ''ایلیا'' کے نام سے جانا جاتا تھا اور یہاں عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ قسطنطین بادشاہ کی والدہ ملکہ ھیلانہ نے ۳۳۵ء میں یہاں وہ مشہور گرجا تعمیر کیا جو ''کنیسۃ القیامۃ'' کے نام سے مشہور ہے۔

۶۱۴ء میں اہل فارس یہاں دوبارہ قابض ہوگئے اور یہاں کے گرجاؤں اور عبادت خانوں کو لوٹ کر ویران کر دیا۔ اس وقت پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے تھے اور یہی وہ واقعہ ہے جس پر مشرکین مکہ نے صحابہ کرام کے سامنے فخر ظاہر کیا تھا کیونکہ فارسی مشرک اور ان پڑھ تھے اور رومی مسلمانوں کی طرح اہل کتاب تھے لیکن قرآن کریم نے پیش گوئی کی کہ عنقریب رومی ظاہری اسباب کے بغیر دوبارہ اہل فارس پر غالب آ جائیں گے چنانچہ یہ پیش گوئی سچی ہوئی اور ہرقل نے ۶۲۷ء میں فارس والوں کو غیر متوقع شکست دے کر یہ شہر فتح کر لیا اور یہاں پھر عیسائیت کا غلبہ ہو گیا۔

المقدس اسلام کے سائے میں:

القدس کو مُسلمانوں میں سے سب سے پہلے حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کیا پھر عرصہ دراز تک یہ مسلمانوں کے پاس رہا۔اموی اور عباسی خلفاء کے دور میں اسے خوب عروج و ترقی ملی۔ گیارھویں صدی عیسوی میں (۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء) میں یورپی عیسائیوں نے اس پر قبضہ کرلیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سلوک کے برعکس وہ مظالم ڈھائے جوان کی انسانیت سے دوری، کم ظرفی اور جہالت کی عداوت کے طور پر یاد رکھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد کو مسجد اقصیٰ میں لاکر ذبح کیا گیا۔ مسجد میں گھوڑوں کا اصطبل بنادیا گیا جسے ''اصطبل سیمان'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔۸۰ سال تک صلیبی عیسائیوں کے قبضے میں رہنے کے بعد فرزند اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے اسے ۱۱۸۷ء میں دوبارہ فتح کیا اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر نو کے ساتھ یہاں مدارس، مکاتب اور اوقاف کا سلسلہ جاری کیا۔ تب سے یہ مسلمانوں کے پاس تھا لیکن انگریزوں نے ۲ فروری ۱۹۲۴ء کو فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ یہاں جو پہلا برطانوی کمشنر آیا وہ ہربرٹ سیموئیل نامی کٹر یہودی تھا۔ برطانیہ اس وقت عیسائی ہونے کے باوجود یہودی مقاصد کی تکمیل کے لیے پوری طرح آلہ کار بنا ہوا تھا لہٰذا دیدہ دانستہ ایک سازش کے تحت یہاں یہودی کمشنر بھیجا گیا۔ اس نے یہودیوں کے لیے فلسطین کے دروازے کھول دیے۔ امریکا کی صہیونی تنظیموں نے یہودیوں کو یہاں زمینیں خریدنے کے لیے کروڑوں پاؤنڈ دیے۔ رفتہ رفتہ یہودی مضبوط ہوتے گئے اور آخرکار یہودیوں نے برطانیہ کی سرپرستی میں ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی سلطنت کے قیام کا اعلان کردیا۔ ۷ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس دن سے آج تک یہاں مشرقی یورپ اور روس سے یہودیوں کی لگاتار آمد جاری ہے جس کی وجہ سے نئے یہودی محلے اور آبادیاں قائم ہورہی ہیں۔ شہر کو خوبصورت اور کشادہ بنانے کے بہانے عربوں کے محلے اور اسلامی آثار و مقامات مسمار کیے جارہے ہیں، لاکھوں فلسطینی مسلمان یہودیوں کے مختلف حربوں سے تنگ آکر اپنے دیہات اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوگئے ہیں اور شام و لبنان کے مختلف کیمپوں میں بے خانماں زندگی گزار

رہے ہیں۔ دیکھیں خدا کا کوئی بندہ کب علم جہاد لے کر اٹھتا ہے اور ان مظلوموں کی دادرسی کے ساتھ اس شہر کو تیسری مرتبہ فتح کرنے کا خواب پورا کر دکھاتا ہے۔؟

مسجد اقصیٰ اور ہیکل سلیمانی:

عام طور پر مشہور ہے کہ مسجد اقصیٰ کی پہلی تعمیر حضرت داؤد وحضرت سلیمان علیہما السلام نے کی لیکن یہ بات صحیح نہیں، بخاری شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت موجود ہے کہ بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر میں چالیس سال کا فاصلہ ہے اور بیت اللہ کی تعمیر ابتدائے آفرینش میں حضرت آدم علیہ السلام نے بحکم الٰہی کی تھی (حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی کی قائم کردہ بنیادوں پر تعمیر نو کی تھی) اس حساب سے بیت المقدس کی اولین تعمیر سیدنا حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام سے بہت عرصہ قبل ہو چکی تھی۔ اس طرح یہودیوں کا یہ دعویٰ ہی سرے سے باطل ہو جاتا ہے کہ یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام نے سب سے پہلے ہیکل (عبادت گاہ) تعمیر کی تھی البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی تعمیر نو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام سے صدیوں قبل یہاں ہیکل موجود تھا۔ القدس کی جو تاریخ آج کی انسانی دنیا کو معلوم ہے اس کے مطابق یہاں کنعانیوں اور یبوسیوں کے دور سے ہیکل تعمیر ہوتے چلے آرہے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بھی کئی مرتبہ یہاں نئی تعمیرات ہوئی ہیں، بعض مرتبہ تو زلزلہ یا حملہ آوروں کی لوٹ مار سے مکمل انہدام کے بعد نئی تعمیر ہوئی ہے جو کبھی یہود کے جانی دشمنوں عیسائیوں اور کبھی مسلمانوں نے کی ...... تو یہودی کس کی وراثت کا دعویٰ کریں گے؟ ایک طویل عرصہ تو یہاں ایسا گزرا کہ یہاں تباہ شدہ ملبے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو خدا تعالیٰ نے جب ان کی بداعمالیوں کی بنا پر سزا دینی چاہی تو چھٹی صدی قبل از مسیح کے اوائل میں بابل کے حکمران بخت نصر نے یروشلم کو فتح کر کے پیوند زمین کر دیا اور یہودیوں کے مذہبی صحیفے نذر آتش کر کے ایک لاکھ یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا، سورہ بنی اسرائیل کے شروع میں اس واقعے کی طرف اشارہ موجود ہے۔ یہود کے عذاب الٰہی میں گرفتار رہنے کے اس زمانے میں تقریباً ڈیڑھ صدی تک یہاں سوائے

ویرانی کے اور کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد اہل مصر، فارسیوں اور رومیوں کی حکومتوں نے مختلف ادوار یہاں گزارے اور ان کے دور میں یہاں تعمیرات بنتی اور اُجڑتی رہیں، مختلف اقوام کی حکومتوں کی، اس طویل تاریخ کے ہوتے ہوئے یہودی نجانے کس طرح اس جگہ پر دعویٰ کرتے ہیں؟ ان کا یہ بے جا دعویٰ ان کی اس تاریخی بدبختی کا حصہ ہے جس کی بنا پر وہ مختلف اقوامِ عالم کو اپنا دشمن بنا کر ان سے ماریں کھاتے رہے اور اب مسلمانوں کی مخالفت مول لے کر اپنے لیے فیصلہ کن شکست کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔

فتح سے تعمیر تک:

اسلام کا آفتاب عالم تاب جب طلوع ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رجب ۲ ہجری، ۱۶، یا ۱۷ ماہ تک اس مقام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے اس لیے یہ مسلمانوں کا قبلہ اول اور ثالث الحرمین کہلاتا ہے۔ واضح رہے کہ مسجدِ اقصیٰ کا مصداق وہ سارا حرم قدسی ہے جس کے گرد ایک فصیل قائم ہے اور اس میں مختلف عمارتیں ہیں اور قبلۂ اول اس میں موجود وہ چٹان ہے جس پر زرد رنگ کا خوبصورت گنبد قائم ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کیا تو اس وقت یہاں کے عیسائی حکمرانوں اور پادریوں کی بے توجہی اور بے ادبی کی وجہ سے یہ ساری جگہ ویران تھی اور مقدس چٹان پر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی صفائی کا حکم دیا اور خود بھی صحابہ کرام کے ساتھ مل کر صفائی کی۔ مسند احمد کی صحیح روایت ہے کہ آپ نے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ اُنہوں نے فرمایا کہ آپ میرا مشورہ سنتے ہیں تو چٹان کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تا کہ سارا قدس آپ کے سامنے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آپ نے یہودیوں سے ملتی جلتی بات کی۔ میں تو وہاں نماز پڑھوں گا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی چنانچہ آپ حرم کے قبلہ والی جانب گئے اور براق باندھنے کی جگہ کے قریب فاتحین صحابہ کے ساتھ نماز پڑھی۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ (۷/ ۵۸) میں اس روایت کی سند کو جید کہا ہے۔ پھر آپ نے یہاں مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ یہ مسجد کھجوروں کے تنوں اور پتوں سے تعمیر کی گئی تھی۔

اُموی دورِ خلافت میں جب مرکز خلافت شام میں تھا تو بیت المقدس کو خاص اہمیت حاصل ہوئی اور اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مسجد اقصیٰ کی نئی تعمیر کی۔ یہ تعمیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تعمیر کردہ مقام پر تھی اور ان کی مسجد اس نئی مسجد کے اندر آ گئی ہے۔ موجودہ تعمیر کی بنیادیں اُموی خلفاء کی ڈالی ہوئی ہیں۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ جس طرح بیت المقدس کی فتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ ہے اس طرح اس کی شاندار تعمیر کا اعزاز اُموی خلفاء کو حاصل ہے۔ بعد ازاں سلاطینِ اسلام اس کی دیکھ بھال، تعمیر و مرمت اور تزئین و آراستگی اور اضافات کرتے رہے۔

عہد وفا کی تکمیل:

حدود حرم میں واقع مسجد کے ہال کا طول ۶۰۰ گز اور عرض ۷۰۰ گز ہے۔ اس ہال اور برآمدہ کی تعمیر نہایت خوبصورت، پُر تکلف اور شاندار ہے۔ چھت جن ستونوں پر کھڑی ہے، یہ اعلیٰ قسم کے سنگ مرمر کے ہیں اور ان کے درمیان کی محرابوں اور مسجد کے گنبد کے اندرونی حصے پر نہایت عمدہ نقش و نگار اور طلائی کام کیا گیا ہے۔ مسجد کے گرد مضبوط فصیل ہے۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ مسجد اقصیٰ کی روزِ اول سے جو حدود تھیں آج بھی وہ انہی حدود پر قائم ہے۔ ان میں کمی بیشی نہیں ہوئی۔ مسجد اقصیٰ کا اطلاق اس پورے قطعہ پر ہوتا ہے جس کے گرد یہ فصیل موجود ہے لیکن کبھی صرف اس خاص حصہ کو بھی مسجد اقصیٰ کہہ دیتے ہیں جو اس چار دیواری کے اندر نماز کے لیے مخصوص ہے۔ فصیل میں سے اندر داخل ہونے کے چودہ دروازے ہیں ان میں سے دس دروازے آج بھی زیر استعمال ہیں جبکہ چار دروازے سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے حفاظتی نکتہ نظر کے تحت بند کروادیے تھے۔ مسجد کے آخر میں کشادہ برآمدہ ہے۔ برآمدے میں سات دروازے ہیں۔ اس کے آگے وسیع صحن ہے۔ اس صحن میں مختلف چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہیں، جن میں یادگار کے طور پر تعمیر کیے گئے قبے، چبوترے، اذان کے مینارے، پانی کی سبیلیں، کنویں، مدرسے اور محرابی دروازے ہیں۔ ان عمارتوں میں سب سے بڑی اور نمایاں عمارت چٹان والے گنبد کی عمارت ہے جس کا تفصیلی تعارف آگے آئے گا۔ افسوس کہ آج ہم ان تاریخی مقامات کی دید سے محروم ہیں۔ اس صحن میں جمعہ و عیدین کے روح پرور

اجتماعات ہوتے ہیں مسلمانوں کی یہاں نماز کی ادائیگی میں یہود اپنے لیے نہایت رسوائی محسوس کرتے ہیں لہٰذا وہ کبھی یہاں آگ لگا کر اور کبھی مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگیں کھود کر اور کبھی دوسرے حیلے بہانوں سے (خدانخواستہ) اس کے انہدام کی کوشش کررہے ہیں اور مسجد اقصیٰ کی سوگوار فضا سارے عالم کے مسلمانوں سے عہد وفا کی تکمیل کا تقاضا کررہی ہے۔

القدس کے نام (۲)

حرم قدسی میں بہت سی ایسی یادگاریں ہیں جن کا تذکرہ اقصیٰ کی مظلوم یادیں زندہ کرنے کے ساتھ جذبۂ حریت اور شوق جہاد کو ولولہ بخشتا ہے۔ چند اہم مقامات کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔ اللہ کرے ایمان کی تازگی اور رجوع الی اللہ وقیام للجہاد فی سبیل اللہ کا باعث ہو۔

دیوارِ براق:

یہ حرم کے جنوب مغرب میں ہے۔ اس کی لمبائی ۴۷ میٹر اور بلندی ۱۷ میٹر ہے۔ روایات میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معراج کی رات یہاں اپنی سواری کو باندھا تھا۔ اس مناسبت سے اسے دیوارِ براق کہتے ہیں۔ یہاں مُسلمانوں نے حرم کی فصیل کے ساتھ مسجد براق کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی اس کے ساتھ خانقاہ اور وقف جائیدادیں بھی تھیں۔ یہودیوں نے یہاں غاصبانہ قبضہ کرکے مکانات گرانے کے ساتھ مسجد بھی منہدم کردی اور وسیع ہموار احاطہ کو اپنی عبادت کے لیے مخصوص کرلیا۔ وہ اس دیوار کو ہیکل سلیمانی کا باقی ماندہ حصہ سمجھتے ہیں اور یہاں آکر روتے دھوتے اور دیوار کی درزوں میں درخواستیں لکھ لکھ کر رکھتے ہیں۔ اس دیوار کو انہوں نے ''دیوار گریہ'' کا نام دے رکھا ہے اور اس پر ملکیت کا دعویٰ جتاتے رہتے ہیں۔ ان کے اس احمقانہ اور بے بنیاد دعوے کی وجہ سے فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں ان کی اس وقت زبردست جھڑپ ہوئی تھی جب یہاں صہیونی جھنڈا لگانے اور مذہبی رسوم ادا کرنے کی وجہ سے مُسلمانوں میں اشتعال پھیلا۔ مسلمانوں نے ان کی یہاں رکھی ہوئی میز کرسیاں اُلٹ دیں اور دیوار میں اڑسی کئی پرچیاں نکال کر پھاڑ دیں۔ اس وقت ایک کمیشن بھی

بنا تھا جو تحقیق کے بعد ۱۹۳۰ء میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا کہ یہ دیوار اور اس کے ارد گرد کی جگہ مسلمانوں کی ملکیت ہے...... لیکن صدیوں کے شکست خوردہ اور ذلت کے مارے ہوئے یہودی آج ''اِلَّا بحبل من اللہ وحبل من الناس'' کے مصداق رونے دھونے اور عالمی طاقتوں کو ساتھ ملانے سے بھٹ میں چھپی لومڑی کی طرح بہادر ہو گئے ہیں اور بزور یہاں قبضہ کر کے دوران عبادت نماز کے وقت بگل بجا کر نماز میں خلل ڈالتے رہتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب یہودیوں نے اپنے انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں ان کی نافرمانی اور گستاخی کی، ان کی وفات کے بعد ان کی لائی ہوئی کتب میں تحریف کی اور ان کی صریح ہدایت کے باوجود پیغمبر آخر الزمان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہ لائے تو اب ان کا رونا دھونا کیا کام آ سکتا ہے؟ اور انبیاء بنی اسرائیل یا حضرت سلیمان علیہ السلام کی وراثت کا دعویٰ کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ نیز یہ کہ جب یہ دیوار سینکڑوں فٹ طویل دیوار کی ہم شکل اور اس کا ایک حصہ ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ بقیہ دیوار تو مسلمانوں کی تعمیر کردہ ہو اور اتنا سا ٹکڑا ہیکل سلیمانی کا بقایا ہو؟ سچ ہے ناحق دعوے کا وہی جواب مدعی کی سمجھ میں آتا ہے جو دلیل سے نہیں، طاقت سے دیا گیا ہو۔

سنہرا گنبد:

یہ مسجد اقصیٰ کے صحن میں مسجد کے ہال سے ۵۰۰ میٹر کے فاصلے پر ایک اونچے چبوترے پر قائم ہے۔ اس کو ''قبۃ الصخرۃ'' کہتے ہیں۔ قبہ کے معنی گنبد اور صخرہ کے معنی چٹان کے ہیں۔ یہ قبہ صحن حرم میں قدرا اونچی جگہ موجود ایک قدرتی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے اس لیے اسے ''قبۃ الصخرہ'' یعنی چٹان کا گنبد کہتے ہیں۔ یہ عمارت مثمن الاضلاع (آٹھ پہلوؤں والی) ہے۔ اس کا ہر پہلو ۶۶ فٹ طویل ہے، اندرونی قطر ۱۹۲ فٹ اور قبے کے قاعدے کا قطر ۶۶ فٹ ہے۔ یہ قبہ ۹۹ فٹ بلند اور لکڑی کا بنا ہوا ہے جس پر باہر کی طرف سونے کا رنگ چڑھا ہوا پیتل اور سیسا لگایا گیا ہے اور اندر کی طرف گچ کا استر کیا گیا ہے، جس میں خوبصورت سنہری کام اور پر تکلف آرائش وزیبائش کی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز ۶۶ھ مطابق ۶۸۵ء میں اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کیا اور تکمیل اس کے بیٹے ولید بن عبدالملک کے ہاتھوں ۷۲ھ مطابق ۶۹۱ء میں

ہوئی۔ مشہور ہے کہ بنی امیہ نے اس کی تعمیر پر مصر کے خراج سے حاصل ہونے والی سات سال کی آمدنی خرچ کی۔ موجودہ عمارت ترک سلاطین سلطان عبدالحمید (۱۸۵۳ء) اور سلطان عبدالعزیز (۱۸۷۴ء) کے عہد کی مرمت کردہ ہے۔ چنانچہ دیواروں کی بیرونی مینا کاری، خوبصورت رنگین شیشوں کی ۳۸ کھڑکیاں اور انداز تزئین سب مخصوص ترکی طرز کا ہے۔ عمارت کے باہر چاروں طرف خوبصورت پتھروں پر سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ یٰسین کی آیات خط طغرا میں دلفریب انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔ یہ آیات سلطان عبدالحمید ثانی نے تحریر کروائی تھیں۔ کھڑکیوں کی بناوٹ میں اعلیٰ درجے کی حسن ترتیب اور بہترین جالی دار کام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

یہ قبہ ایک اونچے چبوترے پر ہے جس تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ ان سیڑھیوں کے اختتام پر محرابی دروازے ہیں جن سے ایک وسیع چبوترے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس چبوترہ کے بیچوں بیچ یہ خوبصورت قبہ قائم ہے۔ قبے میں اندر کی طرف ستون کی دو قطاریں ہیں، پہلی قطار چٹان کے اردگرد ہے، اس میں چار نہایت ضخیم اور چوڑے اور بارہ گول چھوٹے ستون ہیں، دوسری قطار ذرا فاصلے پر ہے اس میں آٹھ بڑے اور سولہ چھوٹے ستون ہیں، اس طرح اندرونی حصہ تین حصوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ پہلے میں چٹان رکھی ہے جبکہ درمیان کا حصہ ستونوں سے گھرا ہے اور تیسرا حصہ دروازے سے متصل ہے۔ آج کل دروازے کے ساتھ متصل حصے میں سبز اور درمیان والے حصے میں سرخ قالین بچھی ہوئی ہے۔ مسلمان یہاں بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں اور (قبلہ کی طرف منہ کر کے) نماز پڑھتے ہیں۔ اس اعتبار سے بعض کتب تاریخ میں اس عمارت کو ''مسجد قبۃ الصخرۃ'' بھی کہا گیا ہے لیکن درحقیقت یہ باقاعدہ مسجد نہیں، ایک طرح کی جائے نماز ہے جسے مسلمان یہاں آنے کے بعد لہوولعب میں مشغول ہونے کی بجائے نماز و تلاوت سے آباد رکھتے ہیں۔

اخلاص کا نور:

اس گنبد کی تعمیر کے نگران مشہور تابعی رجاء بن حیوۃ اور یزید بن سلام تھے۔ رجاء بن حیوۃ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے ہم نشین ساتھی اور مشہور اہل علم میں سے ہیں۔ آپ فلسطین

اہل مقام بیسان کے اور آپ کے ساتھی یزید بن سلام القدس کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے
محنت اور لگن سے تعمیر مکمل کی تو خلیفۂ وقت کو اطلاع دی کہ ایک لاکھ دینار بچ گئے ہیں۔ اس نے
ان دونوں کو لکھا کہ یہ آپ کی محنت اور دیانت داری کا انعام ہیں، آپ رکھ لیجیے۔ انہوں نے لکھا کہ ہمیں تو
اس اعزاز اور نعمت کے شکرانے میں اپنی بیویوں کا زیور بھی اس عمارت میں لگانا چاہیے نہ یہ کہ ہم اس
کے بدلے پیسے لیں۔ اس پر خلیفۃ المسلمین نے حکم دیا کہ اس سونے کو پگھلا کر اس گنبد پر طلاکاری
کر دی جائے۔ چنانچہ اس گنبد پر آج جو لافانی چمک اور خوبصورتی ہے اس میں مسلمانوں کے خون
پسینے کی کمائی کے علاوہ ان دو جلیل القدر تابعین کی محبت واخلاص کا نور بھی ہے۔

چٹان اور غار:

چٹان: یہ قدرتی چٹان پر قائم ہے وہ انسان کے سینے کے برابر اونچی، ۵۶ فٹ لمبی، ۴۲ فٹ
چوڑی اور تقریباً نیم دائرے کی غیر منظم شکل میں ہے۔ اس کا مشرقی پہلو منحنی اور ڈھلوان اور
مغربی پہلو اونچا اور بلند تر ہے۔ یہ چٹان دراصل یروشلم میں پائی جانے والی سرمئی رنگ کی
چٹانوں کے سلسلے کا حصہ ہے اور غیر تراشیدہ شکل میں سالہا سال سے یہاں رکھی ہوئی ہے۔
گیارہویں صدی عیسوی میں جب القدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تو شکم پرست عیسائی
پادریوں کے کردار کی ایک مذموم جھلک دیکھنے میں آئی۔ یہاں متعین بڑے پادریوں نے انجیل
کو بیچ کھانے کی طرح یہ کاروبار شروع کیا کہ یہاں آنے والے عیسائی زائرین کو چٹان کے
ٹکڑے ہم وزن سونے کے عوض فروخت کرنا شروع کر دیے۔ صلیبی حکمرانوں کو اس کی اطلاع
ملی تو انہیں اس بدعنوانی کے روکنے کا سوائے اس کے کوئی راستہ نظر نہ آیا کہ اس چٹان کو سنگِ مرمر کی
سلوں سے ڈھک دیں کیونکہ متعصب اور دنیا پرست پادریوں کی حرام خوری کو روکنا ان کے بس
میں نہیں تھا۔ تقریباً ۸۰ سال کے وقفے کے بعد جب سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ
نے بیت المقدس فتح کیا تو قبے کے گنبد سے صلیب اتارنے اور عیسائیوں کے دیگر نشانات
مٹانے کے ساتھ ان سلوں کو بھی ہٹا دیا۔

اس چٹان کے نیچے ایک قدرتی غار ہے جس میں تقریباً ستر آدمی سما سکتے ہیں۔ یہ غار مربع

شکل کا ہے جس کا ہر ضلع تقریباً ساڑھے چار میٹر لمبا اور چھت تین میٹر اونچی ہے۔ چھت میں تقریباً ایک میٹر چوڑا ایک شگاف ہے۔ اس غار میں گیارہ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک محرابی دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے، یہ محرابی دروازہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ غار کے فرش پر بھی سنگ مرمر بچھا ہوا ہے۔ اس غار میں دو محرابیں ہیں دائیں طرف والی محراب کے سامنے ایک چبوترہ ہے جسے عوام ''مقامِ خضر'' کہتے ہیں اور شمال کے چبوترے کو ''بابِ الخلیل'' کہا جاتا ہے۔

غرضِ تعمیر:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے کس غرض سے اس چٹان پر قبہ تعمیر کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شام اور فلسطین میں جب خلافت اسلامیہ قائم ہوئی تو یہاں کے غیر مسلم عوام ایک طویل عرصے تک رومی سلطنت کے ماتحت رہنے کی وجہ سے ان سے مرعوب تھے۔ اموی خلفاء نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اسلامی سلطنت کے شوکت واستحکام کے اظہار کے لیے تعمیراتی شاہکاروں سے بھی کام لیں گے۔ یہ عمارت اسلامی آثارِ قدیمہ میں سے اولین شہ پارہ ہے جو روز قیامت تک مسلمانوں کی عظمت وشوکت کی یادگار کے طور پر پہچانی جاتی رہے گی۔ غیر مسلم مؤرخین اور ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک بھی یہ عمارت مسلمانوں کے عروج کے دور کی شاندار علامت سمجھی جاتی ہے۔ بہت سے غیر مسلم ماہرین فن تعمیر وآثار قدیمہ بھی اس کے حسن وپائیداری پر بے ساختہ کلمات تحسین کہے بغیر نہیں رہ سکے۔ ایک فرانسیسی ماہر فن تعمیر نے جو قاہرہ یونیورسٹی میں سول انجینئرنگ کے شعبے کا استاذ تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے: ''یہ عمارت صرف ایک تاریخی یادگار ہی نہیں بلکہ یہ بنی نوع انسان کے تعمیر کردہ فن پاروں میں سے بلند ترین معیار کی حامل ہے جو ہر دیکھنے والے کی نظر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس کا حسن اور خوبصورتی انسانی وہم وگمان سے بالاتر ہے۔''

اس خوبصورت گنبد کی تعمیر کے پسِ منظر کے متعلق مؤرخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ حرم قدسی کی حدود میں یہ جگہ چونکہ نسبتاً ذرا اونچی تھی اور یہاں لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ایک بڑی چٹان اور زیر زمین غار موجود ہے اور خلیفہ ولید بن عبدالملک تعمیرات کا بہت شوق رکھتا تھا۔ مسجد نبوی میں اضافہ،

عمان کی تاریخی جامع مسجد کی تعمیر اور مسجد اقصیٰ کی خوبصورت اور پرشکوہ عمارت کی تکمیل اس کے اعلیٰ ذوقِ تعمیر کی گواہ ہے، اس لیے اس نے یہاں گنبد والی خوبصورت عمارت بنوادی جو درحقیقت کوئی خاص حیثیت، فضیلت یا مذہبی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ مسجد اقصیٰ کے صحن میں موجود دوسری خوبصورت عمارتوں اور ستونوں پر کھڑے قبوں کی طرح فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور بس......

بعض مورخین نے اس عمارت کے بنانے کی وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ القدس شہر میں کنیسۃ القیامۃ نامی ایک خوبصورت گرجا تھا جس کو دیکھنے کے لیے عیسائی زائرین دور دور سے آتے تھے، اسی طرح بیت اللحم میں ''کنیسۃ المہد'' نامی ایک تاریخی گرجا بھی تھا جس پر عیسائی فخر کرتے تھے (یہ دونوں گرجے آج بھی ہیں)، ولید بن عبدالملک نے یہ دیکھ کر عزم کیا کہ وہ ان سے زیادہ پرشکوہ عمارت بنائے گا۔

بددعاؤں کا اثر:

بعض تجزیہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یہودی ایک جگہ کے متعلق وہمی اور من گھڑت عقائد اور مذہبی روایات رکھتے تھے، مثلاً ان میں سے بعض احمقوں کا عقیدہ ہے کہ یہاں کسی مقام پر اصلی توراۃ مدفون ہے۔ مسلمان جب یہاں آئے تو عیسائیوں نے یہودیوں کی ضد میں اس چٹان پر کوڑا کرکٹ ڈال کر اسے کچرے سے بھر دیا تھا۔ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسجد اقصیٰ کے صحن میں واقع ہونے کی وجہ سے اور مسجد کا حصہ ہونے کی بنا پر اس کی صفائی کروائی۔ بعض یہودی ترقی کے اس دور میں بھی اس چٹان کو زمین کی ناف سے تعبیر کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی اور قطعہ زمین کی بہ نسبت یہ جگہ آسمان سے اٹھارہ میل قریب تر ہے۔ بہر حال ان فضول اور وہمی اعتقادات کی تردید کی خاطر خلیفۃ المسلمین نے اس پر اسلامی طرز تعمیر کی شاہکار عمارت بنوا کر اسے اسلامی ورثہ کے طور پر متعارف کروایا اور بلاشبہ یہ بلند گنبد مسلمانوں کے جذبات کو مہمیز دینے اور مسجد اقصیٰ کی دور سے پہچان کا سبب ہے۔

نجات دہندہ کا انتظار:

اہل علم کا فرض ہے کہ مسلم اُمّہ میں اس جذبہ جہاد کو پروان چڑھانے کی کوشش جاری رکھیں جس کی چنگاری کسی مسلم نوجوان کے دل میں پھوٹے تو وہ غازیٔ اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی رفع اللہ درجاتہ کی طرح مسلمانوں کا نجات دہندہ بن کر سامنے آئے۔ اے کاش! ہم وہ دن اپنی زندگیوں میں دیکھ سکیں جب بیت المقدس کی تیسری مرتبہ فتح اور بازیابی کا تاج شہسوارانِ اسلام کے سر پر سجایا جائے گا۔

القدس کے نام (۳)

زخموں کا مرہم:

حرم قدسی مسلمان سلاطین، علمائے کرام، اولیاءعظام اور عامۃ المسلمین کی عقیدت ومحبت کا مرکز رہا ہے۔ سلاطین اسلام نے یہاں تعمیر وترقی کے لحاظ سے نمایاں کام کیے چنانچہ یہاں نمازیوں کی سہولت یا مختلف تاریخی یادگاروں کے حوالے سے تعمیر کی جانے والی متعدد چھوٹی چھوٹی خوبصورت عمارتیں، مدرسے، قبے، چبوترے، مینارے، پانی کی سبیلیں، سائبان اور دھوپ گھڑیاں اپنی خوبصورتی، دلفریبی اور ندرت کی وجہ سے فن تعمیر کا نادر نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ تقریباً نصف صدی سے صہیونیوں کے زیر تسلط ہے اس لیے اس میں عصر حاضر کے طرز کے مطابق جدید تعمیرات نہیں ہوئیں، جو قدیم تعمیرات موجود ہیں وہ بہت مضبوط اور پائیدار اور تعمیراتی مہارت کا شاہکار ہیں لیکن ان کی مناسب دیکھ بھال اور رنگ وروغن نہ ہونے کی وجہ سے ان کا حسن ماند پڑتا جا رہا ہے۔ آج کل مسجد اقصیٰ کی فضا پر ایک سوگواری اور حزن کی سی کیفیت چھائی ہوئی ہر اہل ایمان کو محسوس ہوتی ہے جس کی وجہ سے دل ایک بے نام سی سوزش سے پگھلا جاتا ہے۔ کسے خبر کہ ان زخموں کا مرہم اس دور کے مسلمانوں کو اپنی زندگی میں نصیب ہوگا یا ترکِ جہاد کی نحوست سے وہ یہ غم لیے ہوئے دنیا سے سدھار جائیں گے۔

بیت المقدس کے عظیم فضائل اور بابرکت آب وہوا کی وجہ سے بلند پایہ اہل علم یہاں رونق افروز ہوکر علمی مجالس کو زینت بخشتے رہے اور جلیل القدر مشائخ یہاں اعتکاف ودیگر عبادات کرنے یا اصلاحی مجالس قائم کرنے کے لیے سکونت پذیر رہے، مختصر وقت کے لیے زیارت اور

نماز کے لیے آنے والے خواص وعوام تو حد وشمار سے باہر ہوتے تھے، سال بھر ان کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ان سطروں میں حرم قدسی کی چند مشہور تعمیرات اور یہاں قیام پذیر رہنے والے چند اکابر ومشائخ کا تذکرہ مقصود ہے۔ افسوس کہ ہمارے اس ورثے اور ہمارے درمیان صہیونی قوم کا مکروفریب اور ظلم وستم حائل ہو چکا ہے جس سے گزرنے کے لیے ہمیں قربانی دینا ہوگی، غازیوں اور شہداء کے خون کی قربانی، وہ بابرکت خون جو کسی زمین پر گرتا ہے تو وہاں اللہ کی رحمت اُترتی ہے اور مخلوق کے اعمال بد کی نحوستیں زائل ہو جاتی ہیں۔

حرم قدسی کی چند مشہور تعمیرات:

القدس میں قیام پذیر حضرات اہل علم ومشائخ کبار کے تذکرہ سے پہلے ان چند مشہور عمارتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو حرم کی حدود میں موجود ہیں اور عرصے سے ان کو اہل فلسطین کے علاوہ دنیا کے کسی صاحب توحید نے نہیں دیکھا۔ یہ عمارتیں مختلف قسم کی ہیں اُموی خلفا نے تو مسجد اقصیٰ کی تعمیر اول کی تھی لیکن یہ اضافی تعمیرات بعد کے تین ادوار میں ہوئی۔ ایوبی دور، ممالیک دور اور عثمانی سلاطین کا دور۔ خصوصاً دوسرے دور کے حکمرانوں نے جنہیں ممالیک کہا جاتا ہے، یہاں تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کئی شاہکار عمارتیں یادگار میں چھوڑیں...... لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذکر سے قبل مسجد کے ہال میں موجود چند مشہور تاریخی اشیاء کا ذکر کر دیا جائے۔

مسجد کے ہال میں:

مسجد کے قبلے والی دیوار میں ایک بڑا محراب ہے جسے ''محراب داؤد'' کہتے تھے، اب ''محراب عمر'' کہتے ہیں۔ محراب کے ساتھ ایک منبر تھا جسے ناصر الاسلام والمسلمین سلطان صلاح الدین ایوبی رفع اللہ درجاتہ حلب سے لائے تھے۔ اس منبر کی اس وقت پوری دنیا میں نظیر نہ تھی۔ اسے دراصل سلطان نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نگرانی میں اس اُمید پر بنوایا تھا کہ اسے بیت المقدس کی فتح کے بعد اس کے محراب کے ساتھ نصب کیا جائے گا۔ آخر کار ان کے جانشین اور وارث سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی یہ امید پوری کر دکھائی

اور القدس کو فتح کر کے اس منبر کو یہاں نصب کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۶۹ء میں یہودیوں کی طرف سے مسجد اقصیٰ میں آگ لگانے کا جو ہولناک سانحہ پیش آیا اس میں اس نایاب منبر کا اکثر حصہ بھی جل گیا۔ ہال کے مغربی جانب لوہے کا ایک جنگلہ ہے اس میں ''محراب معاویہ'' (رضی اللہ عنہ) کے نام سے ایک محراب ہے۔ مشرقی جانب مستطیل شکل کا حصہ مسجد کے دوسرے حصے سے ممتاز نظر آتا ہے، یہ درحقیقت مسجد اقصیٰ کا وہ قدیم حصہ ہے جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے پہل مسجد تعمیر کی تھی اسی وجہ سے اسے ''جامع عمر'' کہتے ہیں۔ اس میں ایک چھوٹا سا محراب ہے۔ جامع عمر سے شمال کی طرف ایک خوبصورت جگہ ہے جسے ''ایوان عزیر'' کہتے ہیں۔ ایوان عزیر سے شمالی جانب ایک اور چھوٹا سا لیکن نہایت خوبصورت محراب ہے اسے ''محراب زکریا'' کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی ۶ میٹر اور چوڑائی ۶ میٹر ہے۔

اب آیئے صحن مسجد میں واقع جابجا بکھری خوبصورت عمارتوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں تاکہ اس ورثہ کی یاد اور مذاکرہ ہمارے دل میں اسے واپس لینے کی دھن پیدا کر دے۔

مدرسے:

حرم قدسی کے شمال اور مغرب میں جو فصیل ہے (آگے آئے گا کہ انہی دوسمتوں میں القدس کی قدیم آبادی تھی بقیہ دوسمتوں کی جانب شہر ختم ہو جاتا تھا) اس کے ساتھ ساتھ طویل وعریض برآمدے ہیں۔ ان میں نچلی اور اوپر کی منزل میں درسگاہیں اور طلبہ کے کمرے تھے۔ ان میں سے کچھ کو مختلف مسلمان امراء یا ان کی بیگمات نے ایصال ثواب کے لیے تعمیر کیا۔ ان کے ساتھ مختلف چھوٹے بڑے کمرے بھی طلبہ کی رہائش کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ مشہور مدرسے یہ ہیں: مدرسہ غازیہ، مدرسہ کریمیہ، مدرسہ باسطیہ، مدرسہ طولونیہ، مدرسہ عثمانیہ وغیرہ۔ آج یہاں چند ایک چھوٹے مکاتب ہیں باقی سب میں حسرت و یاس کے وہ مناظر ہیں جن سے دیکھنے والے کا کلیجہ کٹتا ہے۔ مغربی برآمدے میں مدرسہ خاتونیہ نام کی درسگاہ کے باہر ایک حجرے میں برصغیر کے مشہور خطیب اور رہنما مولانا محمد علی جوہر کی قبر ہے۔ روایت ہے کہ انہوں نے آزاد زمین میں دفن ہونے کے لیے ہندوستان واپس جانے سے انکار کر دیا لیکن انہیں کیا

خبر تھی کہ وہ انگریز سے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد کرتے رہیں گے اور گوری چمڑی والا مکار فطرت والا مسلمانوں کا یہ دشمن مسلمانوں کے ترک جہاد کی وجہ سے القدس کو بھی اپنی سرپرستی میں یہودیوں کے حوالے کر دے گا۔

قبے:

یہ خوبصورت قبے تدریس، ذکر و عبادت کے لیے جائے خلوت، یا تاریخی یادگاروں کے طور پر تعمیر کیے گئے تھے اور آج تک مسجد اقصیٰ کے صحن کی خوبصورتی اور رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ان قبوں کو مختلف حکمرانوں نے مختلف اغراض کے تحت تعمیر کروایا۔ مسجد اقصیٰ کی طائرانہ تصویر کو غور سے دیکھنے سے یہ اس کے صحن میں تراشیدہ موتیوں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور قبۃ المعراج ہے جس پر یہودی فوجیوں کی برسائی گئی گولیوں کے نشانات موجود ہیں۔ یہ قبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمانوں پر تشریف لے جانے کے عظیم واقعے کی یادگار میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے علاوہ قبۃ السلسلۃ، القبۃ النحویۃ، قبۃ یوسف اور قبۃ الشیخ خلیلی مشہور ہیں۔

چبوترے:

یہ چبوترے گرمیوں میں نماز اور درس و تدریس اور علمی مذاکروں کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ صحن کے فرش سے ذرا اونچے اور مربع و مستطیل دونوں طرح کے ہوتے تھے۔ انہیں خوبصورت پتھروں سے تعمیر کیا جاتا تھا اور اکثر قبلے کی جانب محراب نما دیوار بھی تعمیر کی جاتی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر حرم قدسی کے مغربی صحن میں واقع ہیں کیونکہ وہاں درخت زیادہ تھے ان کے سائے میں بیٹھنے کی یہ جگہیں بنائی جاتی تھیں۔ یہ قبے زیادہ تر عثمانی دور میں تعمیر کیے گئے۔ ان کی کل تعداد چوبیس ہے، مشہور کے نام یہ ہیں: بصیری کا چبوترہ، کرک کا چبوترہ، سلطان ظاہر کا چبوترہ۔

مینارے:

بیت المقدس میں اذان کے لیے چار مینارے تھے جو شمالی اور مغربی جانب تھے کیونکہ شہر کی آبادی اس طرف تھی۔ مسجد اقصیٰ چونکہ قدیم القدس شہر کے جنوب مشرقی کنارے میں نسبتاً اونچی جگہ واقع ہے اس لیے اس کے جنوب اور مشرق میں آبادی نہ تھی۔ اب آخری دور میں

یہاں رہائشی تعمیرات ہوئی ہیں۔حرم قدسی کی فضا سے لی گئی تصویر کو دیکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔یہ چاروں مینار ممالیک کے دور(۶۷۷ء۔۶۹۷ھ مطابق ۱۲۸۷۔۱۳۶۷ھ) میں تعمیر کیے گئے اور آج تک دور سے مسجد کی علامت کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔یہ مینارے مسجد کے چار دروازوں کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے اس مناسبت سے انہیں باب المغاربہ کا مینارہ، باب السلسلۃ کا مینارہ، باب الغوانمہ کا مینارہ اور باب الاسباط کا مینارہ کہا جاتا ہے۔

سبیلیں:

خادمین حرم نے نمازیوں اور زائرین کی سہولت کے لیے پانی کا بہت عمدہ انتظام کیا تھا جس کی وجہ سے مسجد کی حدود میں جابجا میٹھا اور ٹھنڈا پانی کنووں، سبیلوں اور حوضوں میں وافر مقدار میں پایا جاتا تھا۔حرم شریف میں ۲۵ کنویں تھے جن میں سے سترہ مسجد اقصیٰ کی مرکزی عمارت کے قریب اور آٹھ سنہرے گنبد والی عمارت کے آس پاس تھے۔نو سبیلیں اس کے علاوہ تھیں''کاس الفوارہ''(پیالے والا فوارہ) نامی ایک خوبصورت حوض مسجد کے مرکزی دروازے کے بالکل سامنے تھا۔اسے سلطان سیف الدین ایوبی نے ۵۸۹ھ میں تعمیر کروایا تھا۔یہ حوض مسجد کے مرکزی دروازے کے بالکل سامنے کی طرف سے لی گئی تصویروں میں نمایاں نظر آتا ہے۔شہر کے چند مشہور میٹھے چشموں کا پانی بھی نالیوں کے ذریعے مسجد تک پہنچایا گیا تھا۔

دھوپ گھڑیاں اور تہ خانہ:

مسجد اقصیٰ میں دو دھوپ گھڑیاں تھیں جو اوقات نماز پہچاننے کا کام دیتی تھیں۔ایک مسجد کے بالکل سامنے اور ایک چٹان والے گنبد کی دیوار پر۔

اس کے علاوہ مسجد کے مرکزی ہال کے نیچے ایک تہ خانہ بھی ہے جسے صلیبیوں نے اپنے قبضے کے دور میں گھوڑوں کا اصطبل بنا رکھا تھا اور اسے''اصطبل سلیمان'' کے نام سے پکارتے تھے۔یہ تہ خانہ ستونوں پر کھڑا ہے اسے''قدیم اقصیٰ'' بھی کہتے ہیں۔آخری دور میں مسجد اقصیٰ کے ایک کمرے میں اسلامی نوادرات بھی رکھے گئے ہیں جن کا تاریخی اشیاء کے شوقین ذوق وشوق سے دیدار کرتے ہیں۔

مسجد اقصیٰ بطور ایک علمی مرکز:

مسجد اقصیٰ عرصہ دراز تک مسلمانوں کا عظیم علمی مرکز رہی ہے۔ سب سے پہلے یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے دو جلیل القدر انصاری صحابہ قیام پذیر ہوئے تاکہ یہاں دین سیکھنے سکھانے کا سلسلہ جاری ہو سکے۔ ان کے اسماء گرامی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ (وفات ۳۴ھ) اور شداد بن اوس رضی اللہ عنہ (وفات ۵۸ھ) ہیں۔ اول الذکر فلسطین کے پہلے قاضی بھی تھے۔ ان دونوں حضرات نے ساری عمر یہاں تعلیم و تدریس اور ارشاد و اصلاح میں گزاری اور یہیں کی مبارک مٹی میں مدفون ہوئے۔ ان کے مزارات مسجد اقصیٰ کی مشرقی دیوار کے پاس باب الرحمت نامی مقبرے میں ہیں۔

ان کے بعد علماء اسلام دنیا بھر سے یہاں آ کر علم کی خدمت اور مسجد اقصیٰ کے فضائل کے حصول کے لیے مقیم ہوتے رہے۔ ان میں مشہور مفسر مقاتل بن سلیمان (وفات ۱۵۰ھ) شام کے فقیہ امام عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی (وفات ۱۵۷ھ) عراق کے امام سفیان ثوری (وفات ۱۶۱ھ) اور مصر کے مشہور عالم امام لیث بن سعد (وفات ۱۷۵ھ) کے علاوہ فقہ شافعی کے بانی امام محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۲۰۴ھ) بھی شامل ہیں۔ جن بزرگانِ دین اور اولیاء و مشائخ نے یہاں وقتاً فوقتاً قیام کیا ان کو تو احاطہ شمار میں نہیں لایا جا سکتا۔ پانچویں صدی ہجری میں اس وقت مسجد اقصیٰ عالمِ اسلام کا سب سے اہم علمی مرکز بن گئی جب حجۃ الاسلام امام ابو حامد غزالی رحمۃ اللہ علیہ ۴۸۸ھ میں یہاں تدریس کے لیے تشریف لے آئے۔ آپ جس کمرے میں ٹھہرے اسے ناصریہ کہتے تھے بعد میں غزالیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس وقت خود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق حدودِ حرم میں تقریباً تین سو ساٹھ مدرسے تھے جو تشنگانِ علم کو مختلف علوم کی تعلیم دیتے تھے۔

چھٹی صدی ہجری میں تقریباً اسّی سال تک صلیبیوں کے تسلط کا دور رہا۔ اس زمانے میں تعلیم و تعلم کا یہ مبارک سلسلہ موقوف ہو گیا تا آنکہ اسلام کے عظیم سپوت سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے فتح کر کے یہاں عبادت و تعلیم کا سلسلہ دوبارہ جاری کیا۔ اب پھر

تقریباً اسّی سال ہونے کو آئے ہیں کہ یہ سلسلہ دوبارہ موقوف ہوگیا ہے اور اب مسجد اقصیٰ کے صحن میں قال اللہ وقال الرسول کی زمزمہ بارصداؤں کی جگہ زخمی نمازیوں کی آہیں سنائی دیتی ہیں۔

بیت المقدس اہل قلم کی نظر میں:

بیت المقدس کے بارے میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں زیادہ مشہور کتابوں کو اہل علم کی دلچسپی کے لیے مصنفین کے عہد کے لحاظ سے بالترتیب نقل کیا جاتا ہے۔

(۱) الجامع المستقصیٰ فی فضائل المسجد الاقصیٰ، امام بہاؤ الدین ابوالقاسم المعروف بہ حافظ ابن عساکر، وفات ۶۰۰ھ۔

(۲) فضائل بیت المقدس، ابوالمعالی مشرف بن مرجی المقدسی، یہ ان علما میں سے ہیں جو پانچویں صدی ہجری میں القدس میں مقیم رہے۔ وفات ۴۹۲ھ۔

(۳) باعث النفوس الی زیارۃ القدس المحروس، شیخ برہان الدین الضراری المعروف بہ ابن القرقاح، وفات ۷۲۹ھ۔

(۴) مثیر الغرام الی زیارۃ القدس والشام، شہاب الدین المقدسی، وفات ۷۶۵ھ۔

(۵) اتحاف الاخصّی بفضائل المسجد الاقصیٰ، شمس الدین سیوطی المقدسی، وفات ۸۸۰ھ۔

(۶) بیت المقدس والمسجد الاقصیٰ، دراسۃ تاریخیۃ موثقہ، محمد حسن شرّاب، دار القلم دمشق۔

اس کے علاوہ ناصر خسرو (وفات ۴۳۸ھ) مشہور مستند مورخ یاقوت حموی (وفات ۶۲۶ھ) مشہور سیاح ابن بطوطہ (وفات ۷۷۹ھ) اور شام کے مشہور حنفی فقیہ اور بلند پایہ صوفی اور بزرگ شیخ عبدالغنی نابلسی جو مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ کے استاذ ہیں، نے بیت المقدس کے سفرنامے لکھے ہیں۔ ناصر خسرو کا سفرنامہ فارسی میں ہے اور شیخ عبدالغنی نابلسی کے سفرنامے کا نام "الحضرۃ الانیسیۃ فی الرحلۃ القدسیۃ" ہے جو ۱۱۰۱ھ میں لکھا گیا۔

نیز حال ہی میں اس موضوع پر کچھ نئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

١ ـ المسجد الأقصىٰ والصخرة المشرفة. ابراهيم الغنى مكتبة الشروق البيروت ـ

٢ ـ الروض المعطار فى خبر الاقطار. محمد بن عبدالمنعم الحميرى مكتبه لبنان ـ

٣ ـ المقدسات الإسلاميه فى فلسطين والمطامع اليهوديه الخطيره. الهيئة العربية العليا الفلسطين.

٤ ـ خطط الشام. الجزء السادس. محمد كرد على مكتبه النورى دمشق ـ

٥ ـ مكانة وتاريخ بيت المقدس فى الإسلام. الدكتور عبدالفتاح عمر العويسى ـ

یہ چٹان مقدّس کیوں ہے؟

محترم جناب مدیر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

''ضربِ مؤمن'' ہر سال جو خوبصورت کیلنڈر شائع کرتا ہے ان کی تعریف سے ہم قاصر ہیں۔ اللہ کرے کہ یہ سلسلہ دائم وقائم رہے۔ اس مرتبہ ''القدس کیلنڈر'' میں ایک جملہ لکھا ہوا تھا: ''وہ مقدس چٹان جس پر زرد گنبد قائم ہے'' اس چٹان کو مقدس کس حوالے سے کہا گیا ہے؟ ازراہِ کرم ذرا اس کی وضاحت فرمائیے، نیز اس چٹان کی تاریخی حیثیت اور دیگر مذاہب کے حوالے سے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔ ہم نہایت شکر گزار ہوں گے۔

والسلام

عاصم باجوہ، سیالکوٹ

مکرمی جناب باجوہ صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بندہ کو توقع تھی کہ قارئین اس طرح کا سوال ضرور کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ چٹان تمام آسمانی مذاہب (اسلام، عیسائیت، یہودیت) میں اہم حیثیت رکھتی ہے اور مستقبل میں جو بڑے اور انقلابی واقعات پیش آئیں گے ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس چٹان سے جڑے گا لہٰذا اس کی تصویر کے ساتھ (جو انتہائی کوشش، محنت اور کثیر رقم صرف کر کے حاصل کی گئی تصاویر میں سے ایک ہے) یہ الفاظ خاص مقصد کے تحت لکھے گئے تھے۔ الحمد للہ کہ قارئین اس نکتہ سے غافل نہیں رہے اور اب ہم اس اہم بحث کا آغاز کرنے کے قابل ہو گئے ہیں جو قارئین پر فکر و

نظر کے نئے زاویے آشکارا کرے گی۔

ممکن ہے آج کے دن اکثر قارئین ابوغریب جیل کے مجبور اور بے بس قیدیوں پر بیتنے والے انسانیت سوز تشدد کے واقعات کے حوالے سے کچھ پڑھنا چاہیں مگر عراق کے حالات کو فلسطین کے حالات سے الگ کرکے دیکھنا غلطی ہوگی۔ اس جیل میں انسانی تذلیل اور تمسخر کا جو انداز اپنایا جا رہا ہے یہ خالصتاً یہودی انداز ہے۔ فلسطینیوں کے مظلوم بیٹوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ اس کی ایک جھلک ہے۔ دونوں جگہ ظالم بھی ایک اور مظلوم بھی ایک ہی ہے۔ ابو غریب جیل کی نگران بریگیڈیئر جنرل کے عہدے پر فائز ایک متشدد مزاج اور جنون زدہ یہودی عورت ہے جو آٹھ سوویں ملٹری پولیس بریگیڈ کی سربراہ ہے اور یہ وہاں وہ کچھ کر رہی ہے جو اسرائیل کے ''اے بی سی'' ریسرچ سینٹر میں کیا جاتا ہے۔ اے بی سی کا مطلب ایٹمی بیٹریائی اور کیمیائی (Atomic, Bacterial & Chamical) ہے۔ انسانیت سے عاری اسرائیلی فوجی جب فلسطینی نوجوانوں کے منہ پر پاخانہ اور گوبر کے تھیلے باندھنے اور الیکٹرانک کیتلی کی ٹونٹی کو مقعد میں داخل کرکے کرنٹ دینے جیسے ہولناک کاموں سے دل بہلا کر تھک جاتے ہیں تو آخر میں انہیں ان مراکز میں لے جاتے ہیں جہاں جراثیمی ہتھیار بنائے اور تجربہ کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ پھر ابلیسیت رقص کرتی ہے، انسانیت منہ چھپاتی ہے اور چوہے، چھپکلی، چھچھوندر پر آزمائے جانے والے ہتھیار ان بے بس نوجوانوں پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان مراکز میں آنے والے نوجوان آتے وقت قیدی ہوتے ہیں لیکن جاتے وقت اسرائیلی پولیس سے مقابلہ میں مارے جانے والی لاشوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی کچھ ابوغریب کے جہنم زار میں ہو رہا ہے اور اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک دنیا والے اپنے گرد و پیش کو یہودی عینک سے دیکھتے رہیں گے۔ امریکی حکام نے اس جیل میں پیش آنے والے واقعات پر ''گہرا افسوس'' ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان واقعات سے ہمارا تشخص تباہ ہو گیا...... لیکن یہ منافقانہ الفاظ کہتے ہوئے وہ ایسی تمام کارروائیاں بھول گئے ہیں جو ان کی نگرانی میں اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں مسلسل ہوتی رہتی ہیں۔

ان چند باتوں کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

القدس جس طرح کے اہم، تاریخی اور قدیم ترین اسلامی آثار پر مشتمل ہے، اس حساب سے موجودہ دور کے مسلمانوں نے ان کی طرف توجہ نہیں دی اور آج حال یہ ہے کہ عوام تو کیا خواص بھی انکی تاریخ اور اہمیت سے آگاہ نہیں لہٰذا نتیجہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی مسجد کے تحفظ کے لیے سینہ سپر اور سربکف ہو جانے والے مسلمان اپنے تیسرے مقدس ترین ورثہ پر یہود کی یلغار کی خبریں سنتے ہیں مگر ان کے جذبات میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے اس اہم اور مقدس ورثہ کو یہودی مٹانے کی کوشش کرتے ہیں مگر پورے عالمِ اسلام میں کوئی خاص تشویش سامنے نہیں آتی۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ مسلم اہلِ قلم اور ابلاغی وصحافتی ادارے آگے بڑھ کر اس تاثر کو ختم کریں کہ القدس صرف فلسطینی مسلمانوں کا ورثہ ہے یا یہ کہ فلسطینی فدائی جانباز محض اپنے وطن کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ القدس پورے کرۂ ارض کے ۵۴ ممالک میں رہنے والے سوا ارب مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے اور اس کا تحفظ ہر اس شخص کا فرض ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر یقین رکھتا ہے اور احادیث میں ذکر کی گئی ان پیش گوئیوں کو سچا سمجھتا ہے جو ارضِ فلسطین میں اہلِ حق و اہلِ باطل کے درمیان برپا ہونے والے اس عظیم معرکہ (الملحمۃ الکبریٰ :Armagedon) سے تعلق رکھتی ہیں جو قیامت سے قبل ہو کر رہے گا اور بنی نوع انسان کی زندگیوں اور اس پوری کائنات کو ایک نیا رُخ دے گا۔

اس چٹان کے متعلق بحث کا آغاز پچھلے سال بعض مضامین میں سامنے آنے والے اس سوال سے ہوا تھا کہ مسجدِ اقصیٰ کا مصداق کیا ہے؟ گرے سبز رنگ کے گنبد والا ہال جہاں محراب ہے اور جہاں نماز پڑھی جاتی ہے یا زرد گنبد والی حسین عمارت جو اس ہال سے ذرا آگے مسجد اقصیٰ کے صحن میں واقع ایک اونچے اور وسیع چبوترے پر قائم ہے اور اپنی خوبصورتی اور شان و شوکت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ شمار کیا جائے۔ تاج محل محض ایک شاہانہ شوق اور فانی عشق کی یادگار ہے جبکہ یہ گنبد ایک بلند نظریے اور اعلیٰ مقصد کے تحت بنایا گیا تھا اور آج تک اسی عظیم سوچ کی ترجمانی کر رہا ہے جس کے پیش نظر دو جلیل القدر

تابعین نے اس کی تعمیر کی نگرانی قبول کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ نہرِ زبیدہ اور گنبدِ صخرہ وہ دو ایسے عظیم الشان اسلامی آثار ہیں جنہیں جس پہلو سے بھی پرکھا جائے یہ دنیا کی ممتاز ترین انسانی تعمیری کاوشوں کے معیار پر پورا اترتے ہیں بلکہ دونوں اپنی مقصدیت اور پسِ منظر میں دوسرے سات عجائبات پر فوقیت رکھتے ہیں مگر اہلِ مغرب کا تعصب ان کے مقام کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔

اس سوال کے متعلق مسلم مفکرین اور تحقیق کاروں میں دو رائے سامنے آتی رہی ہیں۔ کچھ حضرات اول الذکر عمارت کو مسجدِ اقصیٰ کا حقیقی مصداق سمجھتے ہیں اور کچھ مؤخر الذکر کو۔ دونوں طرف سے مقالات اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ غور کیا جائے تو یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کوئی لاہور کی بادشاہی مسجد کے بارے میں پوچھے کہ اس کا مصداق صرف وہ اگلا مسقّف حصہ ہے جہاں گنبد اور در بنے ہیں یا دروازے کے قریب وہ پچھلا حصہ جہاں چھوٹا سا عجائب گھر اور دالان ہے......... یا کراچی کی مسجد بیت المکرّم کے بارے میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ اس سے مراد اس کا مرکزی ہال ہے یا شمالی جانب کے دروازے کے قریب وہ ہوادار گنبد جو مسجد کے داخلی دروازے کے قریب بنایا گیا ہے۔ اب ان بدیہی سوالوں کا جواب یہی ہے کہ مسجد کا مصداق اس کی چار دیواری پر مشتمل وہ تمام خطہ ہوتا ہے جو اس کے نام پر وقف کیا جائے، البتہ پھر اس کے مختلف حصے ہوتے ہیں۔ کچھ نماز پڑھنے کے لیے، کچھ تعلیم اور دیگر مقاصد کے لیے۔ اسی طرح مسجد اقصیٰ کا اطلاق اس مکمل چار دیواری پر ہوتا ہے جس کو عبادت کے لیے وقف کیا گیا تھا۔ اس احاطے کی ایک ایک اینٹ اور اس کے اندر کی ایک ایک انچ زمین تا قیامت مسجد کے لیے وقف ہے اور اس کی حفاظت مسلمانوں پر اس وقت تک فرض ہے جب تک ان میں سے ایک آنکھ بھی حرکت کرتی اور ایک دل بھی دھڑکتا ہے۔ اس چار دیواری میں یوں تو بہت سی عمارتیں ہیں۔ مدرسے، وعظ اور درس کے حلقوں والے چبوترے، خانقاہیں، کتب خانہ، اسلامی عجائب گھر، سبیلیں، کنویں اور باغیچے وغیرہ..... لیکن ان میں دو عمارتیں اہم ہیں۔ ایک قبلے کی جانب واقع سبز رنگ کے گنبد والا وہ مسقّف حصہ جہاں محراب داؤد ہے اور

جسے بعض لوگ مسجدِ عمر بھی کہتے ہیں اور دوسرا مسجد کے صحن میں موجود وہ مشہور عالَم زرد گنبد جس کے نیچے ایک بڑی چٹان ہے جو ایک قدرتی غار کے اوپر ٹکی ہوئی ہے۔ یہاں سے ہم دوسرے سوال کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں کہ قبلہ اول کیا چیز تھی؟ آیا یہ پوری مسجد اقصیٰ یا اس کا کوئی خاص حصہ؟ اس دوسرے سوال کے جواب سے ہم اس چٹان کی اہمیت وفضیلت کے متعلق بھی جان سکیں گے۔

دوسرے سپارے کی ابتدا میں آیت: "وما جعلنا القبلة التی کنت علیها" (ترجمہ: اور ہم نے سابقہ قبلہ کو قبلہ نہیں بنایا تھا مگر اس غرض سے کہ.....'' کی تفسیر میں تقریباً تمام مشہور مفسرین نے لکھا ہے کہ قبلہ اول یہی چٹان تھی۔ دیکھیے: روح المعانی: ۲/ ۸، البحر المحیط: ۱/ ۴۲۳، تفسیر قرطبی: ۲/ ۱۵۱، ابن کثیر: ۱/ ۲۵۹، تفسیر مدارک: ۱/ ۸۸، الدر المنثور: ۲/ ۳۴۳، تفسیر طبری: ۱/ ۱۰۶ وغیرہ...... جن بعض تفاسیر میں بیت المقدس کو قبلہ اول کہا گیا ہے ان کی مراد بھی یہی چٹان ہے اور ان مفسرین نے کُل (بیت المقدس) کہہ کر اس مسجد کا ایک جزو (چٹان) مراد لیا ہے۔ انہی کتب میں یہ بھی درج ہے کہ یہ چٹان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بلکہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ رہی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۶ ماہ تک اسی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی ہے۔ اس وقت مسجدِ اقصیٰ کی موجودہ عمارت نہ تھی، قدیم عمارت جو تھی وہ ویران اور غیر آباد تھی حتیٰ کہ عیسائیوں نے یہود کی ضد میں اس چٹان پر اتنا کچرا لا لا کر ڈالا تھا کہ یہ اس کے نیچے چھپ گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح بیت المقدس کے بعد صحابہ کرام کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے یہ کچرا صاف کیا اور چٹان کو ویسا صاف ستھرا کر دیا جیسے وہ پہلے تھی۔ آج کل یہود اور ان کے منافق گماشتے بحث ومباحثہ کرتے ہوئے شاطرانہ انداز میں اس چٹان کے متعلق مسلمانوں کا یہ دعویٰ ذکر کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہاں سے معراج پر تشریف لے گئے تھے، پھر بحث کا رخ ان روایات کی صحت وضعف کی طرف پھر جاتا ہے حالانکہ اس صخرہ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، انبیاء سابقین اور مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔

جہاں تک اس کے دیگر فضائل کی بات ہے تو بہت سی روایات میں اس کے مختلف فضائل وارد ہیں۔ (مثلاً: جنت کی چار نہروں یا زمین کے سارے میٹھے پانی کا اس سے پھوٹنا، اس کا فضا میں معلق ہونا، میدانِ حشر کا یہاں قائم ہونا وغیرہ) لیکن یہ روایات متکلم فیہ یا ضعیف ہیں۔ البتہ "الصخرہ من الجنۃ" "چٹان جنت میں سے ہے" والی حدیث مسند احمد ۷/ ۲۹۷، حدیث نمبر ۲۰۳۶۶، مستدرک حاکم ۳/ ۶۷،۸، حدیث نمبر ۶۵۴۲ اور ابن ماجہ کتاب الطب صفحہ ۲۴۷ میں مذکور ہے اور متعدد سندوں کی وجہ سے حسن کے درجے کو پہنچتی ہے چنانچہ یہ بات تقریباً طے پا جاتی ہے کہ حجر اسود کی طرح صخرۃ القبلۃ بھی جنت سے آیا ہوا ہے اور دونوں مسلمانوں کے لیے مقدس ہیں۔

یہ چٹان چونکہ یہود کا بھی قبلہ تھی اور ان کی مذہبی داستانوں کے مطابق اصل تورات اس کے قریب کہیں مدفون ہے اور ہیکل سلیمانی اسی پر قائم کیا گیا تھا لہٰذا وہ اس پر قائم مسلمانوں کی تعمیر کردہ شاندار عمارت کو گرا کر یہاں ہیکل کو دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے بے تاب ہیں اور اس بے تابی کی وجہ محض مذہبی نہیں، کافی حد تک سیاسی ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق ان کو دنیا بھر کی تذلیل و تحقیر سے نجات دلا کر یہود کی عالمی حکومت قائم کرنے کا کارنامہ تمام تر بدیوں کا محور و منبع مسیح دجال ہی انجام دے سکتا ہے اور اس کی آمد یا ظہور اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس کا قصرِ صدارت قائم کیا جائے اور اس کا قصرِ صدارت اس چٹان پر قائم ہوگا جو اس گنبد کے نیچے ہے لہٰذا وہ ہر صورت میں اس گنبد کو (خدانخواستہ) منہدم کرنے کے درپے ہیں۔ اس حوالے سے یہ "سنسنی خیز تحقیق" بھی بعض لوگ بغیر سوچے سمجھے پھیلاتے رہتے ہیں کہ: "اصل مسجد تو وہ ہال ہے جہاں نماز پڑھی جاتی ہے، اس لیے زرد گنبد کو القدس کی علامت کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔" بات دراصل یہ ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کا اطلاق اس پوری چار دیواری پر ہوتا ہے اور اس مسجد کے پورے احاطے کا ایک ایک ذرہ حرم قدسی ہے اور یہ دونوں عمارتیں اپنی اپنی جگہ اہمیت اور حیثیت رکھتی ہیں لہٰذا یہ بحث قطعاً بے سود بلکہ نقصان دہ اور دانائی سے بعید ہے کہ کون سا حصہ اصل ہے اور کون سا غیر اصل؟ یہود کو یہ پوری چار دیواری چاہیے جیسا کہ ان کے

بنائے ہوئے ''سولومن ٹیمپل'' (ہیکل سلیمانی: حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر کردہ عبادت گاہ) کا پورا ماڈل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے لہٰذا ہمیں اہم اور غیر اہم کی بحث میں پڑے بغیر اس پورے ورثے کی حفاظت کرنی چاہیے۔ حال ہی میں بدمعاش ریاست کے سربراہ اور بدی کی قوتوں کے خونخوار علمبردار ایریل شیرون نے اعلان کیا ہے کہ ۱۴ مئی کو اسرائیل کی آزادی کی تقریبات مسجدِ اقصیٰ میں منائی جائیں گی۔ اس سے پہلے یہاں ہیکل سلیمانی کا سنگِ بنیاد رکھنے کی کوشش بھی کی جا چکی ہے۔ یہ سب کچھ دراصل ''ٹیسٹ کیس'' ہے۔ وہ مسلمانوں کے ایمان کی حرارت پرکھنا چاہتے ہیں۔ یہودی انجینئر صحرائے سینا میں بیت المقدس کا ماڈل بنا کر اس پر کمانڈو حملے کی مشق کرتے ہیں اور اس طرح کے تجربے کرتے ہیں کہ اگر اس کو (معاذ اللہ) دھماکے سے اڑا دیا جائے تو ملبہ کس طرف اور کتنی دور تک گرے گا کیونکہ قریب میں یہودیوں کی آبادی ہے نیز وہ ایسا تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ عمارت خود سے کمزور ہو کر یا زلزلے کے جھٹکوں سے گرے لہٰذا اس مشق میں اسی تناسب سے بارود استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ایسا طریقہ تلاش کر رہے ہیں کہ (خاکم بدہن) ساری مسجد گر جائے، مگر دیوارِ براق (جسے وہ دیوارِ گریہ کہتے ہیں) نہ گرے۔

ان کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے پوری دنیا کو اپنے بس میں کر لیا ہے مگر فلسطینی فدائی ان کے تمام حربوں سے آگے کی چیز ہیں کیونکہ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ دشمن نے ان سے جینے کا اختیار چھین لیا ہے لہٰذا مرنے کا اختیار وہ خود استعمال کریں گے۔ ان کے علما نے بھی نہایت بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت فدائی حملوں کو جائز بلکہ افضل ترین شہادت قرار دیا جبکہ ابھی کشمیر کے مجاہدین حملوں کی اس قسم سے واقف ہی نہ تھے۔ فلسطینی جانبازوں نے ساری دنیا سے رسد کا راستہ کٹ جانے اور ہر قسم کی امید ٹوٹ جانے کے بعد بھی ہمت کا دامن نہیں چھوڑا اور بمبار فدائی حملوں کی شکل میں ایسی ٹیکنالوجی دریافت کر لی جس کا تاحال کوئی توڑ دنیا بھر کے ذہین ترین یہودی دماغ بھی تلاش نہیں کر سکے لہٰذا اب مسجد کو منہدم کرنے کے منصوبے کو انتہائی خطرناک سمجھتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ متبادل راستے بھی

سوچتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے ہیکل سلیمانی کے قیام کا ایک نیا طریقہ سوچا ہے۔ وہ یہ کہ گرافک کی جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے لیزر شعاعوں کی مدد سے گنبدِ صخرہ کے اوپر (اس لفظ سے معلوم کرلیں کہ یہود کا اصل مقصود یہی جگہ ہے) ہیکل سلیمانی بنا لیا جائے۔ یہ سہ بُعدی یعنی Three Dimensional ہوگا اور فضا کے اندر چٹان (والے گنبد) کے اوپر بغیر کسی سہارے کے قائم ہوگا۔ یہ تجویز اسحاق حاتیمین نامی ایک یہودی کمپیوٹر انجینئر نے پیش کی ہے اور متعدد یہودی ربّی (مذہبی پیشوا) جو تاویل و حیلہ جوئی کے ماہر ہیں، اپنی مذہبی داستانوں کا ذخیرہ کھنگال رہے ہیں کہ کیا اس طرح کرنے سے دجّال کے خروج کی شرط پوری ہوجائے گی؟ کیا اس طرح کرنے سے ان کا مسیحا ان کو شرفِ دیدار بخش کر ''خاندان داؤد'' کے عالمی غلبہ کی تمنا پورا کرنے کے لیے پردۂ غیب سے باہر آنے پر تیار ہوجائے گا؟ کیا اس طرح ان کو وہ گم شدہ ''سکینہ'' اور ''مقدس تبرکات'' واپس مل جائیں گے جو اِن کی ''صہیون'' پہاڑ پر واپسی ممکن بنائیں گے؟

عجیب بات یہ ہے کہ یہود اپنے مذہبی رہنماؤں کی جھوٹی سچی پیش گوئیوں پر کامل یقین رکھتے ہوئے ان کی بیان کردہ من گھڑت شرط کو پورا کرنے کے لیے بے تاب ہیں، چاہے انہیں فرضی طریقے کیوں نہ اختیار کرنا پڑیں لیکن مسلمان ہر طرف سے گھیراؤ میں آنے کے بعد بھی ابلیس کے طاغوتی لشکر کی یلغار کی طرف متوجہ نہیں۔ سیدنا داؤد علیہ السلام کی وراثت کے جھوٹے دعویداران کے نشان والا جھنڈا اٹھائے پھرتے ہیں جبکہ ان کے حقیقی وارث اس داؤدی پتھر کو چوم کر رکھنے پر اکتفا کررہے ہیں جو وقت کے جالوتوں کی پیشانی سے ٹکراتا ہے تو ان کا بھیجا پاش پاش کردیتا ہے۔ گوانتانامو سے ابوغریب تک یہی حسرتناک المیہ دہرایا جارہا ہے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اپنے آباء و اسلاف کے نام کو بٹہ لگانے اور ان کی روحوں کو تڑپانے کے سوا کچھ نہیں کررہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں "وھن" (دنیا کی محبت اور آخرت سے مایوسی) اور "سمن" (آرام پسندی اور عیش پرستی) نے جکڑ لیا ہے اور وہ اس ایمانی حرارت سے محروم ہوگئے ہیں جو ایسی جکڑ بندیوں کو توڑتی اور مُردوں کو زندہ کرتی ہے۔ ابوغریب کے انسانیت سوز

اور بھیانک واقعات سامنے آنے کے بعد خدا جانے اب اور کون سی ایسی مصیبت ہوگی جو ہماری آنکھیں کھولنے اور مغربیت پرستی، سطحیت پسندی، وقتی جذباتیت اور بے عملی کو چھوڑ کر ٹھوس کام اور بھرپور جدوجہد پر آمادہ کرے گی؟

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
اک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آوے

تختِ داؤ دی کی واپسی

قارئین کو ''تختِ داؤ دی'' کے بارے میں کچھ بتانے کا ارادہ ہے۔ اکثر حضرات کے لیے یہ اصطلاحات غیر مانوس ہوں گی مگر اب بات دہائیوں کی نہیں، چند سالوں کی رہ گئی ہے کہ دنیا خود بخود ان چیزوں سے واقف ہو جائے گی اور آج جو چیزیں اجنبی اور غیر مانوس لگ رہی ہیں کل وہ ہر اس شخص کے لیے جانی پہچانی ہو جائیں گی جو اس وقت زندہ ہوگا۔

سرخ بچھڑے کی قربانی:

مقدس چٹان کے متعلق آپ آگے پڑھیں گے کہ اس کے حقِ تولیت اور اس پر تسلط حاصل کرنے کے لیے دنیا بھر کے یہودی اپنے زر خرید گماشتوں کے ساتھ مل کر سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں تاکہ اس پر بے داغ کھال والے سرخ بچھڑوں کی قربانی کر سکیں کیونکہ (یہودی عقائد کے مطابق) سرخ بچھڑے کی غیر موجودگی کے سبب اس وقت پوری یہودی قوم رسمی ناپاکی کی حالت میں ہے۔ یہ قوم پاک تھی ہی کب؟ لیکن ان کا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ اپنے نجات دہندہ (دجالِ اکبر) کے ظہور کے لیے اس چٹان پر ''تیسرا ہیکل سلیمانی'' (Third Temple of Solomon) تعمیر کیا جائے۔ تیسرے ہیکل (یہودی عبادت گاہ) کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ اس کی پہلی تعمیر ایک ہزار سال قبل مسیح ہوئی تھی لیکن یہود کی بداعمالی کے سبب اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ ان پر بیرونی حملہ آوروں کو عذاب کے طور پر مسلط کیا۔ ان دونوں حملوں کا ذکر پندرہویں سپارے کے پہلے رکوع میں ہے۔ پہلی مرتبہ ۵۸۷ قبل مسیح میں عراق کے بادشاہ بخت نصر نے اس ٹمپل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، وہ ان کے عورتوں

بچوں کو گرفتار کر کے ساتھ بابل لے گیا اور یہاں چٹیل میدان رہ گیا۔ پھر یہود کو قدرت کی طرف سے ایک موقع اور دیا گیا اور ڈیڑھ سو برس بعد اس کی دوسری تعمیر ہوئی لیکن یہودی پھر ان حرکتوں کے مرتکب ہونے لگے جو اس شر پسند قوم کا خاصہ ہیں لہٰذا اب کی مرتبہ ان پر رومیوں کو مسلط کیا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے چالیس سال بعد رومی جنرل ٹائٹس (تیطس) نے اسے بھی گرادیا اور ۷۰ عیسوی سے آج تک وہ گرا پڑا ہے اور یہودی دنیا میں در بدر گھومتے رہے ہیں۔ اس واقعے کو تقریباً دو ہزار سال (۱۹۳۴ سال) ہو چکے ہیں اور اب ان کا کہنا ہے کہ ہم یہاں موجود مسجد اور گنبد کو گرا کر تیسرا معبد تعمیر کریں گے تا کہ دجالِ اکبر ظاہر ہو کر تختِ داؤدی پر عالمی سربراہِ حکومت کا تاج پہن کر بیٹھے اور ساری دنیا پر حکومت کر کے نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل کر سکے یعنی ایسے نئے عالمی نظام کی جس میں سارے کرۂ ارض پر یہود کا کُلّی غلبہ ہو اور وہ یہ فیصلہ کریں کہ بقیہ انسانی جانوروں (یعنی تمام غیر یہود بنی نوع انسان جنہیں وہ گویم اور جنٹائل کہتے ہیں، اس کا ترجمہ انسانی جانور سے کیا گیا ہے) میں سے کتنوں کو زندہ باقی رہنے کا حق ہے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبوب اور اشرف المخلوقات یہودی قوم کی خدمت کر سکیں اور کتنے اس دھرتی پر بوجھ ہیں لہٰذا ان کی صفائی کر دینی چاہیے۔

صفائی کی مہم:

''صفائی کی اس مہم'' میں عیسائی دل و جان کے ساتھ یہودیوں کے ساتھ ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ جس قوم نے ان کے مقدس پیغمبر (سیدنا یسوع مسیح علیہ السلام) کو نہ بخشا وہ ان کے پیروکاروں کو بھی ہرگز نہ بخشے گی لیکن دو تاریخی دشمنوں کا ایسا عجیب و غریب اتحاد کیسے قائم ہو گیا جس میں بالآخر ایک دوسرے کو ختم کرے گا؟ یہ کہانی بڑی دلچسپ اور عبرتناک ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی دشمنی تقریباً دو ہزار سال پرانی تھی اور آج سے تقریباً سو سال پہلے تک کی تاریخ ان کی باہمی چپقلش اور عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی درگت بننے کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک یہود کو دنیا کی خبیث ترین مخلوق قرار دیا جاتا تھا اور اس قابلِ نفرت و گردن زدنی قوم کے ساتھ وہ جیسا موقع ہوتا انتہائی برے سلوک سے بھی

درگزر نہ رتے۔اس کی دو وجوہ تھیں:

۱......یہودیوں نے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ کافر و مرتد قرار دینے اور ان کی مقدس اور پاکباز ماں پر تہمت لگانے کے علاوہ انہیں سخت تکلیف پہنچائی تھی بلکہ عیسائیوں کے خیال کے مطابق تو قتل ہی کر دیا تھا۔قادیانی بدنصیبوں کا عقیدہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔وہ بھی حیاتِ عیسوی کے منکر ہیں۔(یہ تو قرآن پاک نے آ کر وضاحت کی کہ انہیں قتل کیے جانے سے پہلے بحفاظت آسمانوں پر اٹھالیا گیا تھا۔اب عیسائی حضرات خود سوچ لیں کہ وہ اپنے پیغمبر کا زیادہ احترام کرتے ہیں یا مسلمان؟)

۲......دوسری وجہ یہ کہ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام قیامت کے قریب زندہ ہوکر دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے اور دنیا کو ظلم سے پاک کریں گے جبکہ کم بخت یہودی دوبارہ آنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ دجّال قرار دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں کانے دجّال کو مسیح مانتے ہیں۔ان دو زبردست اختلافات کی وجہ سے یہود ہمیشہ ناپاک مخلوق قرار دیے گئے۔حال یہ تھا کہ دنیا میں تو کوئی بھی ناگوار واقعہ ہوتا تو یہود مردود کو اس کا سبب قرار دے کر ان پر عذاب ونفرین کا نیا سلسلہ شروع کر دیا جاتا حتیٰ کہ یورپ میں ایک مرتبہ کالا طاعون پھیلا،اس کے سبب سینکڑوں لوگ مرنا شروع ہوئے تو عیسائیوں نے اس کا سبب بھی یہودیوں کو ٹھہرا کر ان کو مطعون کرنا شروع کیا حالانکہ خود یہودی بھی اس وبا کا شکار ہوکر مر رہے تھے۔اس شدید ابتلاء کے عرصہ میں اگر یہودیوں کو کسی نے پناہ دی تو وہ مسلمان تھے۔مسلمان انہیں اہلِ کتاب ماننے کے باعث معمولی ٹیکس (جزیہ) کے عوض جان و مال کا مکمل تحفظ اور مذہبی آزادی فراہم کرتے تھے۔ یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی یہ تاریخی دشمنی تہلکہ خیز قسم کی ہولناک تباہیوں کے سائے میں چلتی رہی لیکن اب تقریباً سوا سو سال ہونے کو آئے ہیں کہ یہودیوں نے انتہائی پُرکاری اور عیاری سے کام لیتے ہوئے عیسائیوں کو اپنا ہمنوا بنالیا ہے اور وہ اہلِ مغرب جو یہودیوں کے جانی دشمن تھے آج مسلمانوں کے جانی دشمن بن گئے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے ناجائز وجود کے بعد تو دنیا بھر سے عیسائیوں کی

یہود دشمنی آہستہ آہستہ ختم ہوتے ہوتے ہمدردی، محبت اور پھر شدید حمایت میں تبدیل ہوگئی ہے اور اس وقت امریکا و یورپ میں عیسائی مبلغین، واعظین اور دانشوروں کا ایک بہت بڑا اور وسیع اثر و نفوذ رکھنے والا طبقہ ایسا ہے جو اسرائیل سے بڑھ کر اسرائیل کا وفادار اور صہیونیوں سے بڑھ کر اسرائیل مخالفین کا دشمن بلکہ ان کا نام مٹا دینے کا خواہش مند ہے۔

عیسائیوں کا بدعتی فرقہ:

یہود نے عیسائیوں کو رام کرنے کے لیے یہ فتنہ بازی کی کہ ان کی مذہبی وحدت کو پاش پاش کرتے ہوئے ایک یہودی، مارٹن لوتھر کو عیسائیوں کا رہنما بنا کر کھڑا کیا۔ اس شخص نے ''پروٹسٹنٹ'' فرقہ کو جنم دیا۔ یہ گویا عیسائیوں کے بدعتی ہیں، اصل عیسائی کیتھولک (رومی عیسائی) اور ان کے بعد آرتھوڈوکس (یونانی عیسائی) ہیں۔ اس طرح عیسائیت تین بڑے ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر باہم دست و گریباں ہوگئی۔ اس مذہبی انتشار نے عیسائیت کو فرقہ وارانہ تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزار کر کئی ذیلی گروہوں میں بانٹ دیا۔ خصوصاً پروٹسٹنٹ کہ ان کی بنیاد ہی احتجاجی مزاج پر رکھی گئی تھی۔ ان کے کچھ گروہ خالصتاً یہود کی پیداوار اور ان کے آلہ کار ہیں۔ خاص طور پر بپٹسٹ (The Baptist) اور خاص الخاص طور پر ایونجلسٹ (The Evengelists) ان کے پروردہ ہیں۔ پھر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یہود جب ہسپانیہ سے نکل کر امریکا بھاگے اور نیویارک کو ''جیویارک'' بنایا گیا تو یہود کے ساتھ ساتھ پروٹسٹنٹ عیسائی کیتھولک عیسائیوں کے خوف سے بھاگ بھاگ کر امریکا پہنچنے لگے اور آج امریکا میں انہیں کی اکثریت ہے۔ امریکا کا مشہور منہ پھٹ اور گستاخ پادری جیری فال ویل نیز پاٹ رابرٹسن اور جارج روٹس جیسے وسیع نشریاتی نیٹ ورک رکھنے والے عیسائی مبلغ دراصل ایونجلسٹ ہیں جو یہود کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ جلد از جلد تیسری عالمگیر جنگ (آرمیگاڈون یا ہرمجدون) ہونی چاہیے تاکہ عظیم تر اسرائیل وجود میں آئے، تھرڈ ٹمپل (ہیکل ثالث) تعمیر ہو، یہاں تختِ داؤدی لاکر رکھا جائے اور اس پر ''مسیح'' بیٹھ کر عالمی حکومت (سپر گورنمنٹ) کی باگ ڈور سنبھالیں۔ یہاں تک عیسائیوں اور یہودیوں میں اتفاق ہے۔ اس کے بعد اتنا فرق ہے کہ یہودیوں کے خیال میں ''ملیساباح'' آئے گا اور تختِ داؤدی پر وہی بیٹھے گا جبکہ عیسائیوں کے

خیال میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لا کر اس تخت پر براجمان ہوں گے۔ یہ عیسائی اس وجہ سے یہودیوں کے ہمنوا ہیں کہ ان کے خیال میں فلسطین دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وطن ہے اور آپ پہلی مرتبہ کی طرح دوسری مرتبہ بھی یہیں آئیں گے۔ اب عیسائی خود تو پورا زور لگا کر مسلمانوں سے القدس کو نہ چھین سکے لہٰذا وہ یہود کی حمایت کر رہے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کو یہاں سے بے دخل کر دیں اور حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لے آئیں تو پھر سارے یہودی بھی عیسائی ہو جائیں گے......لیکن ان عقلمند حضرات کو یہ سمجھ نہیں آتا کہ جب یہ پہلی مرتبہ عیسائی نہ ہوئے تو دوسری مرتبہ کیسے سچے مسیحی بن جائیں گے؟ ان کی فطرت تو آج بھی وہی ہے۔

عہد ہزار سالہ:

اور اب آخر میں تھوڑی سی تفصیل تختِ داؤدی (Throne of David) کے متعلق۔ یہودی عقائد کے مطابق یہ وہ پتھر ہے جس پر پہلے سیدنا داؤد علیہ السلام کی تاج پوشی (Coronation) ہوئی تھی پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اسی تخت پتھر پر بیٹھ کر تمام جانداروں یعنی جن وانس اور پرندوں پر حکومت کی۔ یہ پتھر ہیکل سلیمانی میں محفوظ تھا۔ جب رومی جنرل ٹائٹس (Titus) نے ہیکل کو تباہ کیا تو اس پتھر کو اپنے ساتھ روم لے گیا جہاں عیسائیت کا مرکز تھا۔ روم سے یہ پتھر آئرلینڈ پہنچا اور اب چودہویں صدی عیسوی سے انگلینڈ میں ہے۔ آئرش، اسکاٹس اور انگلش بادشاہوں اور ملکاؤں کی تاج پوشی اسی پتھر پر ہوتی رہی ہے۔ اس غرض کے لیے اس پتھر کو تخت نما کرسی میں نصب کر دیا گیا ہے اور اب یہ انگلینڈ کے شاہی چرچ "ویسٹ منسٹر ایبے" میں رکھا ہوا ہے۔ انگریز حکمرانوں کی تاج پوشی اسی پر ہوتی ہے اور یہودیوں کے مطابق تیسرا ہزارہ شروع ہونے پر وقت آ گیا ہے کہ وہ ملکہ برطانیہ سے اس تخت کو چھین کر فلسطین لے جائیں اور اسے اس کی اصل جگہ پر نصب کریں۔ عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ پہلے ہزار سال کے اختتام پر حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائیں گے، جب ایسا نہ ہوا تو ان کا اور یہودیوں کا مشترکہ اور پختہ عقیدہ ہے کہ اب دو ہزار سال کے اختتام اور تیسرے ہزارے کے آغاز پر تو ضرور ہی یہ واقعہ ہوگا۔ یہ عقیدہ "عہد ہزار سالہ" (Millenarian)

کہلاتا ہے۔ مسلمانوں کو بنیاد پرست کہنے والے امریکیوں میں یہ عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ رونالڈ ریگن جیسے خوش مزاج صدر نے تقریباً گیارہ مواقع پر اس عقیدہ کا اظہار کیا اور بہت سے روشن خیال امریکی کہتے ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی، قرضوں کی واپسی اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کا رونا رونے کی ضرورت نہیں کیونکہ عظیم ترین جنگ کے ذریعے ساری دنیا کا حساب کتاب بس لپیٹا ہی جانے والا ہے۔ اس غرض کے لیے دونوں اہل کتاب (کتاب اللہ میں تحریف اور اس میں موجود وعدوں کو امت مسلمہ کی بجائے اپنی طرف پھیر کر) صدیوں پرانی مخالفت بھلا کر یک زبان و یک جان ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مشرق و مغرب میں مسلمانوں کا گھیراؤ کر لیا ہے اور مرکز اسلام جزیرۃ العرب سمیت ہر اہم مسلمان ملک کے اندر یا سرحد پر یا قریبی مقام میں اپنی فوجیں لا بٹھائی ہیں تا کہ مسلمانوں کی متوقع مزاحمت پر انہیں دبوچ سکیں۔ ان کی سرگرمیاں قیامت خیز ہیں اور وہ دنیا کے ماحول کو اپنے اپنے مسیح کے حق میں کرنے کے لیے دیوانہ وار کوشاں ہیں...... لیکن مسلمان حدیث شریف میں بیان کی گئی سچی پیش گوئیوں کا علم رکھنے کے باوجود کسی قسم کی مذہبی یا عملی بیداری سے کوسوں دور دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا بھر خصوصاً پاکستان و سعودی عرب سے اسرائیل کو تسلیم کروانے کی کوششوں، صدر صدام کی گرفتاری (جس سے یہودی ڈرتے تھے کہ کہیں دوسرا بخت نصر نہ ثابت ہو) اور شیخ یاسین و شیخ رنتیسی کی شہادت کے بعد طبلِ جنگ پر چوٹ پڑ چکی ہے۔ نقارہ بج چکا ہے۔ فلسطینی نوجوان اپنی غلیلوں اور پتھروں کے ساتھ میدان میں نہتے و اکیلے ہیں اور ان کی سرپرستی کرنے کے ذمہ داران کی مدد کی بجائے یہودیوں اور عیسائیوں کی مشترکہ افواج کو عرب سرزمین پر اڈے فراہم کر رہے ہیں یا پھر دریائے فرات تک وسیع ہو جانے والی اسرائیلی سلطنت کے تحفظ کے لیے افواج بھیجنے کی بحث میں مصروف ہیں۔ کیا ہم تسلیم کر لیں کہ ہمارے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟؟؟

دجلہ سے نیل تک

تغیر پذیر بنیادیں:

آپ نے یہودیت اور صہیونیت نامی دو اصطلاحیں سنی ہوں گی۔ آج آگے چلنے سے پہلے ان کا تعارف حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح اسلام کی بنیاد پانچ ارکان پر ہے جن میں سے ایک عقیدہ اور چار اعمال ہیں۔ اسی طرح یہودیت کی بنیاد بھی چار چیزوں پر ہے۔ مزے کی بات...... جو یہودیوں کے لیے بدقسمتی کی بات ہے اور اس پر انہیں بھی تا قیامت حسرت ہی رہے گی...... یہ ہے کہ یہودی مذہب کے (تھوڑا آگے چل کر آئے گا کہ یہودیت دراصل مذہب ہی نہیں رہا یہ تو برہمنوں کی طرح صاف صاف قوم پرستی بن چکی ہے) یہ ارکان بدلتے رہتے ہیں۔ مختلف زمانوں میں ان کی تعداد اور عنوان مختلف رہے ہیں۔ آج کل یہ لوگ اپنے مذہب کے چار ارکان بتلاتے ہیں۔ یہ ارکان نہ تو تورات سے ماخوذ ہیں نہ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات سے۔ اس کا اندازہ آپ کو ان ارکان اربعہ کی فہرست پڑھنے کے دوران آخر تک پہنچتے ہی ہو جائے گا۔ تو پہلے یہودیت کے چار ارکان سمجھ لیجیے:

۱...... عقیدۂ توحید: عیسائیت کی تثلیث کے مقابلے میں یہودی بنیادی طور پر توحید کے قائل ہیں۔ اگرچہ یہ بعض پیغمبروں کو اور بعض اوقات خود کو ہی خدا کا بیٹا کہلوا کر شرک کا ارتکاب کرتے رہے ہیں اور اب بھی مشرکانہ جادو ٹونے اور کفریہ اوہام و رسومات ان میں زوروں پر ہیں لیکن بہرحال یہ توحید کا دعویٰ کرتے ہیں۔

۲...... مسیح موعود کی آمد: ان کے عقیدے کے مطابق آخر زمانے میں ایک نجات دہندہ

آئے گا جوان کے لیے ایک علیحدہ مملکت قائم کر کے ہزاروں سال کی ذلت اور خواری سے انہیں نجات دلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کے بعض فرقے اسرائیل کے غاصبانہ قیام کے حامی نہیں، ان کا خیال ہے کہ یہودیوں کے لیے ارضِ موعود میں علیحدہ وطن کا قیام مسیح موعود کا کام ہے نہ کہ یہودیوں کا، لہٰذا یہ لوگ موجودہ اسرائیلی حکومت کی جارحانہ پالیسیوں سے سخت نالاں ہیں۔ کچھ دنوں قبل انہوں نے لندن میں ایریل شیرون کے خلاف مظاہرہ کیا تھا لیکن شدت پسند صہیونیوں کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی۔ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی سچی خبر کے مطابق مسیح دجال آئے گا ضرور لیکن وہ یہودیت کی نجات کے لیے کچھ نہ کر سکے گا، الٹا تمام یہودیوں سمیت اس کرۂ ارضی سے فنا ہو جائے گا۔

۳......شعب اللہ المختار: یعنی یہودی اللہ تعالیٰ کی منتخب اور پسندیدہ قوم ہیں۔ اگرچہ وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ اگر واقعی وہ رب تعالیٰ کے پیارے ہیں تو صدیوں سے دربدری، جلاوطنی اور مارا ماری کا عذاب کیوں بھگت رہے ہیں؟

۴......الولاء للشعب الیھودی: یعنی یہودیت کی ترقی اور خوشحالی کے لیے اور ان کے لیے ایک الگ وطن کے قیام کے لیے خلوص اور محنت کے ساتھ کام کرنا۔

صہیونیت کیا ہے؟

اس کے مقابلے میں صہیونیت کے صرف آخری دو ہی اصول ہیں۔ یعنی اوپر دیے گئے چار ارکان میں سے انہوں نے آخری دو کو اپنی عالمی تحریک کی بنیاد بنایا ہے اور اس کے لیے وہ ہر طرح کے حربے کو روا سمجھتے ہیں۔ گویا کہ یہودیت ایک مذہب کی مدعی ہے اور اپنی نسبت اس کی طرف کرتی ہے لیکن صہیونیت ایک سیاسی تحریک ہے جو یہودیوں کے لیے ایک الگ وطن کے قیام، اس کے استحکام اور دنیا بھر سے یہودیوں کو لا لا کر اس میں بسانے کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں حتیٰ کہ کسی دوسرے مذہب کا کوئی شخص آخری دو نظریوں میں ان سے مطابقت رکھتا ہے تو وہ بھی صہیونی بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں، عیسائیوں اور لامذہبیوں میں سے بہت سے لوگ جو کسی اعتبار سے یہودیوں کے لیے کام کرتے ہیں وہ

بھی ان کے نزدیک صیہونی شمار ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک اور اسی طرح دوسرے مذاہب میں اگر کوئی شخص مذہبی اعمال نہیں کرتا تو وہ بددین ہے لیکن یہودیت میں اگر کوئی کچھ عمل نہ کرے لیکن خود کو غیر یہودیوں سے برتر سمجھے اور یہودیوں کے لیے الگ وطن کا حمایتی ہو بس وہ پکا یہودی ہے۔ اب خود سوچیے کہ یہ مذہب ہے یا نسل پرستی؟ کوئی یہودی سر اٹھا کر اور دوسرے مذہب والوں سے آنکھیں ملا کر کہہ سکتا ہے کہ یہ تورات کی تعلیمات ہیں یا خدا کے مقدس پیغمبر حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے اپنے امتیوں کو ان باتوں کی تلقین کی ہوگی؟؟؟

جھوٹ کا بھبکا:

اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس پیغمبروں کے بارے میں جھوٹ بولنا حتیٰ کہ ان کی تعلیمات کے ضمن میں جھوٹ بول کر اپنے مذہب میں بھی تحریف کرتے رہنا یہودیت کا وہ گندا مرض ہے جس نے اس کے وجود کو بدبودار پھوڑا بنا کر رکھ دیا ہے۔ باری تعالیٰ، اس کی آسمانوں کتابوں اور برگزیدہ پیغمبروں کے متعلق اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ایسا دین اتارا جو انسانوں کی ایک مخصوص نسل کے لیے ہے۔ بقیہ لوگ اس دین میں داخل ہوسکتے ہیں نہ انہیں اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل ہوسکتا ہے، نہ انہیں نجات مل سکتی ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ جس شخص کی ماں یہودی نہیں وہ یہودی نہیں بن سکتا۔ (اگرچہ اسرائیل کی آبادی بڑھانے کے لیے ان کے بعض ربی یعنی پادری یہ کہنے لگے ہیں کہ جس کا صرف باپ یہودی ہو اسے بھی یہودی تسلیم کرلینا چاہیے) اور خود یہودیت پر ان کے عمل کا یہ عالم ہے کہ صہیونیت کا بانی اور یہودیوں کا ہیرو ہنگری نژاد ''تھیوڈور ہرٹزل'' جب اپنی سازشوں کے ذریعے صہیونیت ریاست کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوا اور مسجد اقصیٰ کی غربی دیوار (جس کا نام دیوارِ براق ہے مگر یہودی اسے ''حائط المبکیٰ'' یعنی ''دیوار گریہ'' کہتے اور کہلواتے ہیں) کے پاس پہنچا تو وہاں کھڑے ہو کر اس نے جو پہلی چیز کھائی وہ سور کے گوشت کے بنے ہوئے سموسے تھے حالانکہ یہودیوں کے نزدیک سور کا گوشت حرام ہے اور یہ جگہ یہودیوں کے نزدیک مقدس مقام اور توبہ وگریہ وزاری کی جگہ ہے لیکن وہاں موجود کسی یہودی پادری کی ہمت نہ ہوئی کہ اس سیاسی لیڈر کو

ایسی متبرک جگہ پر حرام خوری سے منع کر سکے نہ اسے اس بے حرمتی پر بطورِ عذر کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیوں کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ان کے نزدیک کوئی کتنا ہی بدکار کیوں نہ ہو اگر وہ دجال کی آمد کا منتظر ہو، خود کو دوسرے انسانوں سے اچھا سمجھے اور یہودی ریاست کا حامی ہو تو وہ قابلِ قدر شخص ہے۔ اس نظریہ کے پیش نظر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولوں کی تعلیمات میں اتنی بدنما تحریف اور آسمانی مذہب کی اس سے بڑھ کر توہین نہیں ہو سکتی۔

کھینچ کھانچ کر:

الغرض حاصل کلام یہ کہ یہودیت تحریف وتکذیب کی وادیوں میں بھٹکتی بھٹکتی آج کل ان چار بنیادی نکتوں کے گرد گھوم رہی ہے جس میں سے توحید کا عنصر محض بھرم قائم رکھنے کے لیے ہے۔ باقی تینوں کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی طرح اپنے لیے ایک وطن قائم کیا جائے چاہے وہ خود سے ہو یا کسی ماورائی ہستی کے ذریعے۔ اس نوایجاد شدہ یہودیت نے جو خدا پرستی کی روحانی بنیاد کی بجائے دنیا پرستی، قوم پرستی اور وطن پرستی جیسے مادی نظریات پر قائم ہے، کسی طرح کھینچ کھانچ کر اپنا تعلق انبیاء بنی اسرائیل علیہم الصلوۃ والسلام جیسی مقدس ہستیوں سے جوڑ لیا ہے اور اس کے سربرآوردہ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ اپنی سفلی خواہشات کو موسوی تعلیمات سے جوڑ کر اپنے عوام کو برانگیختہ رکھیں اور زمین پر فساد مچاتے رہیں۔ چونکہ عام قارئین کو اسرائیلی ریاست کے متعلق یہودی نظریے، اس خیالی ریاست کی حدود اور اس وراثت کے لیے ان کے دعوے معلوم نہیں، اس لیے ہم یہاں ان چیزوں کو ذکر کریں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ فلسطینی مسلمان کس عظیم ظلم کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں اور ہم ان کی جدوجہد سے لاتعلق رہ کر کتنی بے حمیتی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ تو آیئے! پہلے اسرائیلی ریاست یا دوسرے لفظوں میں صہیونی مملکت کے متعلق یہودیوں کا نظریہ سمجھتے ہیں۔

دجلہ سے نیل تک:

قرآن شریف میں آتا ہے: ''اور ان (بنی اسرائیل) نے اس علم کی پیروی کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے دور میں شیاطین پیش کرتے تھے''۔ (البقرۃ) حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی صاحب رحمہ اللہ نے تفسیر ماجدی اور جغرافیہ قرآنی نامی کتاب میں لکھا ہے کہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کی مملکت کی حدود دریائے نیل سے دریائے دجلہ تک تھیں۔ یہودی اسی ملک سلیمانی کے حصول میں سرگرداں ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد ان کی سخت نافرمانی کے باوجود ان کی وراثت کے دعویدار ہیں۔ ان کے مطابق تورات میں ان سے وعدہ کیا گیا تھا: ''أرضک یا إسرائیل من دجلة إلی النیل'' اے اسرائیل! تمہاری سلطنت کی حدود دجلہ سے نیل تک ہوں گی۔ یہ تو لمبائی کا بیان ہوا بعض یہودی اس پر اس جملے کا اضافہ بھی کرتے ہیں: ''ومن الأرز إلی النخیل'' یعنی اس کی چوڑائی اُرز نامی درخت کی پیداوار کے علاقے سے لے کر کھجوروں کی سرزمین تک ہوگی۔ اُرز صنوبر کے درخت کو کہتے ہیں جو لبنان میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ یہ درخت لبنان کا قومی نشان ہے اور لبنان کے جھنڈے پر اس کی تصویر موجود ہے اور نخیل یعنی کھجوروں کی سرزمین سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک شہر مدینہ منورہ کی طرف اشارہ ہے۔ تو یہودی اگرچہ حضرت سلیمان علیہ الصلوۃ والسلام کی حیات مبارکہ میں ان کی تعلیمات کا انکار اور ان کی بے ادبی کرتے رہے لیکن اب ان کو وراثت سلیمانیہ حاصل کرنے کا سودا سمایا ہے چنانچہ آپ ان کے جھنڈے کو دیکھیں تو اس میں دو نیلی لکیریں نظر آئیں گی۔ یہ دجلہ اور نیل کا علامتی نشان ہیں۔ ان کے بیچ میں دو مثلثوں پر مشتمل چھ کونوں والا یہودی ستارہ ہے جو ان حدود میں صیہونیت کی علمداری کو ظاہر کرتا ہے۔ پہلی مثلث کا مطلب وحی، مخلوق اور نجات جبکہ دوسری کا مطلب خدا، اسرائیل اور دنیا ہے۔ اس کی معنویت پر قارئین خود غور کرلیں۔ اسرائیل نے جب مصر میں سفارتخانہ کھولنا چاہا تو مصری حکام اسے دریائے نیل کے اُرلے کنارے کے پاس جگہ دینا چاہتے تھے جبکہ اسرائیلی نمایندہ دریائے نیل کے پرلی طرف جگہ حاصل کرنے پر مصر تھا۔ اس کی وجہ وہ تل ابیب سے یہ سمجھ کر آیا تھا کہ سفارتخانہ تو دوسرے ملک کی حدود میں ہوتا ہے جبکہ نیل کے اُرلے کنارے تک ہمارا اپنا ملک ہے۔ اندازہ تو لگایئے کہ رب العالمین اور انبیائے کرام کی یہ نافرمان قوم کیسے خبط میں مبتلا ہے اور ہماری نااہلی اور اتباعِ شریعت سے محرومی کے سبب کیسے کیسے منصوبے سوچ کر بیٹھی ہے؟؟؟

خلیج سوئز کے کنارے

کشمکش کا آغاز:

سیدنا حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کی زندگی کے مختلف ادوار و واقعات داعیانِ دین کے لیے مثالی نمونہ ہیں، اس واسطے قرآن شریف میں ان کا ذکر مختلف اسلوب میں بارہا آیا ہے۔ جب آپ کے کندھوں پر نبوت کا بارگراں ڈالا گیا اور آپ اللہ رب العالمین کی کبریائی کی دعوت لے کر فرعون کے دارالحکومت ممفیس نامی شہر میں پہنچے جو دریائے نیل کے ڈیلٹا کے آغاز پر واقع تھا تو ایک طویل کشمکش کا آغاز ہوا۔ ایک طرف خیر خواہی اور ہمدردانہ نصیحت تھی اور دوسری طرف ضد بازی اور ہٹ دھرمی۔ ایک طرف روحانیت، شفقت، صبر اور بلند ہمتی تھی تو دوسری طرف مادیت پرستی، انانیت اور گھمنڈ وغرور۔ یہ کشمکش کئی مراحل سے گذرتی ہوئی بالآخر اس وقت اختتام پذیر ہوئی جب فرعون بمع اپنی سرکش قوم کے بحر احمر (بحیرۂ قلزم) کی ایک شاخ خلیج سوئز میں غضبناک موجوں کی لپیٹ میں آ کر بُرے انجام سے دوچار ہوا اور رہتی دنیا تک تکبر اور غرور کے عبرتناک انجام کی علامت بن گیا۔ بلاشبہ عقل والوں کے لیے اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں۔

دین ودنیا کی امامت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے محبت، ہمکلامی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ غیبی مدد ونصرت کے واقعات بہت ہی ایمان افروز اور توکل ویقین کو بڑھانے والے ہیں۔ آپ کو دو قسم کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں: ایک تو فرعون جیسے خدائی کے زعم میں گرفتار

بد دماغ شخص پر اس بات کی محنت کہ وہ جھوٹی انا کے خول سے باہر آ کر عجز وانکسار کی خو اپنائے اور خود کو اپنے جیسے بندوں کا مالکِ کل سمجھنے کی حماقت ترک کر دے۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل جو قبطیوں کی زیادتی، نسلی تعصب، ظلم وستم اور معاشی وسماجی استحصال کا شکار تھے انہیں مصر سے نکال کر آزاد علاقے کی طرف لے جایا جائے جہاں وہ اپنے دین کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ گویا کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کو روحانی اور سیاسی دونوں میدانوں کی قیادت سپرد کی گئی تھی اور آپ کو تفویض کیے گئے فرائض دین ودنیا کا حسین امتزاج تھے۔ آپ جلیل القدر نبی بھی تھے اور سیاسی امور کے ماہر اور اس شعبے میں اپنے وقت کے امام بھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے یہ دونوں ذمہ داریاں اس خوبی اور عمدگی سے نبھائیں کہ ان کے ہر قول وفعل میں بعد میں آنے والوں کے لیے رہنما ہدایات موجود ہیں۔ علماء اُمّت محمدیہ جو مسلمانوں کے لیے دونوں شعبوں میں امامت اور قیادت کے مکلّف ہیں ان کے لیے آپ کی حیات مبارکہ کی وہ تفصیلات جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، نہایت سبق آموز اور رہنما اصولوں پر مشتمل ہیں۔

دو مشکل محاذ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین سے واپسی پر کوہ طور سے ہوتے ہوئے مصر پہنچے تو انہیں دونوں محاذوں پر سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ فرعون جیسے جابر، سنگ دل اور غرور ونخوت میں مبتلا حکمران کو جس کی انا خوشامدی درباریوں کی چاپلوسی سے سوج کر کپا ہو چکی تھی، اس سے خیالی خدائی کا زعم اور جھوٹی الوہیت کا دعویٰ چھڑوا کر اللہ احکم الحاکمین کی خدائی کے ماننے کی دعوت دینا اور اپنی منتشر، غیر منظم اور سالوں سے فرعونی ظلم کے تحت پسی ہوئی قوم کو منظم کر کے اس سے شریعت موسویہ پر عمل کروانا اور اسے سلامتی کے ساتھ ایک بد دماغ اور بے لگام حکمران کے چنگل سے نکال لے جانا، دونوں کام نہایت کٹھن، صبر آزما اور حوصلہ طلب تھے۔ آپ کو دونوں محاذوں پر تن تنہا کام کرنا تھا اور آپ کے ساتھ اس طویل سفر میں سوائے آپ کے ماں جائے بھائی کے اور کوئی مزاج شناس اور مکمل اطاعت ووفاداری نبھانے والا نہ تھا۔ جب آپ فرعون کے بھرے دربار میں پہنچے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی قوت ایمانی اور تعلق باللہ کا

کیا عالم ہوگا کہ وقت کا باجبروت حکمران آپ پر قتل کی فرد جرم عائد کیے ہوئے تخت پر بیٹھا ہوا ہے، آس پاس درباریوں کا جم غفیر ہے، مارے رعب کے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں اور پوری مملکت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سوائے آپ کے بھائی کے اور کوئی غمخوار و مددگار نہیں، مگر آپ بے خوفی سے بھرے دربار میں اس کے دعوائے خدائی کی نفی کرتے ہیں اور اسے سچے خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں جبکہ یہ دونوں باتیں اس پر سخت گراں اور ناگوار ہیں۔

علاج کا فیصلہ:

فرعون نے اول تو دلائل سے بات چیت شروع کی جب اس میں لاجواب ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر حجت تام کرنے کے لیے اپنے معجزات پیش کیے تو اس نے ان کا جواب تلاش کرنے کے لیے جادوگروں کو بلا بھیجا۔ مصر براعظم افریقہ میں واقع ہے اور یہاں کے ہر قبیلہ میں ایک جادوگر ہوتا ہے جس کی جاہل قبائل بڑی عزت کرتے ہیں۔ چنانچہ دور دراز قبائل کے جادوگر اپنا خاندانی فن لے کر آ پہنچے۔ فرعون اتنا سخت ضدی اور خودسر تھا کہ اپنے درباریوں سے کہہ رکھا تھا کہ ہم جادوگروں کی بات صرف اس صورت میں مانیں گے جب وہ جیت جائیں۔ اگر وہ ہار گئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمالات کو سحر کی بجائے معجزہ قرار دیا تو ہم ان کی بات بھی نہ مانیں گے ﴿لعلنا نتبع السحرة إن كانوا هم الغلبين: الشعراء﴾ چنانچہ جب جادوگروں نے معجزات موسوی کی حقیقت سے اسے آگاہ کیا تو عقل اور سنجیدگی کے اس دشمن نے الٹا ان پر ملی بھگت کا الزام لگا کر انہیں بھی شہید کر ڈالا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب اس کی مہلت کی گھڑیاں ختم ہوگئیں اور اس کی بد دماغی کے علاج کا فیصلہ کر لیا گیا۔

محیر العقول واقعہ:

بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ تم رات کے اندھیرے میں مصر سے نکل پڑو، صبح ہونے تک بنی اسرائیل ممفیس سے نکل کر خلیج سوئز سے کچھ فاصلہ پر پہنچ چکے تھے۔ قبطیوں نے جب دیکھا کہ آج ہمارے گھر کا کام کرنے کے لیے کوئی اسرائیلی نہیں آیا تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور حقیقت حال معلوم ہونے پر وہ بجائے اس کے کہ ان کو جانے دیتے، غصے سے بھرے ہوئے ان کے

تعاقب میں نکل پڑے۔ انہیں علم نہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے پیچھے نہیں جارہے بلکہ موت ان کے پیچھے آرہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ خلیج سوئز کے کنارے پر پہنچے تو سامنے پانی ٹھاٹھیں ماررہا تھا۔ پیچھے دھول اڑاتا فرعونی لشکر تھا۔ قلیل وقت میں سمندر پار کرنے کا انتظام کرنے یا راستہ بدل کر صحراء سینا کی طرف نکلنے کا کوئی امکان نہ تھا، لیکن اس نازک وقت میں بھی ان کے پائے استقامت میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔ اس پر رحمت الٰہی جوش میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ پانی سے ڈبونے کی صلاحیت چھین لی گئی، اس کے اندر راستے بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم جب پار اتری اور فرعونی لشکر معاملے کی حقیقت سمجھے بغیر (ہمارے بعض عقلیت زدہ مفسرین کی طرح) جوار بھاٹا سمجھ کر ان کے پیچھے پیچھے سمندر میں اتر پڑا تو خلیج سوئز کی موجیں دوبارہ اپنی اصلی حالت پر بلکہ پہلے سے زیادہ غیظ وغضب کے ساتھ بپھر کر ان پر آپڑیں۔

کھال اترا ہوا دنبہ:

غرور سے بھری ہوئی فرعونی قوم کے ہوش پہلے ہی تھپیڑے میں ٹھکانے آگئے۔ انہوں نے گریہ وزاری شروع کی لیکن اب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ آن کی آن میں سب قصہ پارینہ بن گئے۔ البتہ فرعون کا بدن تاریخ کے بدلتے موسموں کے باوجود آج تک بغیر مسالوں کے مصر کے قومی عجائب گھر میں محفوظ ہے اور اس کی شکل ایسی ہے جیسے کسی کمزور دنبے کی کھال گوشت سمیت اتار دی جائے اور اس کی چھلی ہوئی ہڈیاں زمین پر خدا بننے والوں کو غرور، تکبر اور بے جا ظلم کا رسوا کن انجام یاد دلاتی رہیں۔

بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے نجات دی، مگر آج اس قوم کی باقیات اس انعام کو بھول کر فلسطین کے مظلوم اور لاچار مسلمانوں سے وہ فرعونی سلوک کر رہی ہیں جس سے نجات کے لیے یہ خود دن رات دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ آج کے بنی اسرائیل اپنا مشکل وقت بھلا کر فلسطینی مسلمانوں کے معصوم بچوں کو اسی طرح قتل کر رہے ہیں جیسے فرعون ان کے بچوں کو قتل کرتا تھا اور یہی خلیج سوئز جہاں ان کو نجات ملنے کا محیر العقول واقعہ پیش آیا تھا، اس سے متصل نہر

...پر قبضہ جمانے کے لیے وہ کتنے ہی مسلمانوں کا خون بہا چکے ہیں اور اس کی پاداش میں
...لگتا ہے کہ وہ بھی ایسے انجام سے دوچار ہوں گے کہ لوگ ان کی لاشوں کو دیکھ کر نفرت اور
...اہت سے ناک سکیڑ لیا کریں گے۔

''صحرائے سینا اور خلیج سوئز'' جن کا تذکرہ قرآن مجید میں مختلف عنوانات سے آیا ہے۔
...جغرافیہ قرآنی کے ماہرین کے راجح قول کے مطابق خلیج سوئز ہی وہ مقام تھا جہاں قدرت الٰہی نے
ظالم اور متکبر حکمران اور اس کے لشکریوں کو ہلاکت خیز غوطے دیے۔ بعض نے بحیرۂ مرّہ بتایا ہے جو
...سوئز کے بیچ میں پڑتا ہے لیکن راجح (اور قرآنی الفاظ بحر اور یم سے قریب) پہلا قول ہی ہے۔

فلسطین کا قضیہ (۱)

﴿القدس کے خلاف مکرِ یہود کی دل گداز داستاں، تاریخی حوالوں کی روشنی میں عبرت آموز حقائق﴾

سو سال پہلے:

''اگر میں اس کانفرنس میں طے شدہ امور کا خلاصہ چند لفظوں میں بتانا چاہوں تو میں کہوں گا کہ ''دنیا آج سے پچاس سال بعد روئے زمین پر ایک صہیونی ریاست کو قائم دیکھ لے گی۔''

یہ الفاظ عالمی صہیونی تحریک کے بانی تھیوڈور ہرٹزل (Theodor Hertzl) کے ہیں جو اس نے ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں منعقد ہونے والے یہودی داناؤں کے اجلاس کے اختتام پر کہے۔ اس اجلاس میں دنیا کے مختلف حصوں میں ذلت کی حالت میں بکھرے ہوئے یہودیوں کے چوٹی کے رہنماؤں نے شرکت کی تھی اور فیصلہ کیا تھا کہ آج سے تمام صہیونیوں کا واحد مقصد فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام ہوگا۔ دنیا نے دیکھا کہ راندۂ درگاہ یہودی اپنے اس ارادے میں کامیاب ہوگئے اور اس کانفرنس کے ٹھیک پچاس سال بعد (قیام پاکستان کے تقریباً ایک سال بعد) ۱۴/مئی ۱۹۴۸ء کو ارضِ فلسطین میں ایک خود مختار صہیونی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۴/مئی کا دن اسرائیل کے یوم تاسیس (قیام کے دن) کے طور پر منایا جاتا ہے۔

عیاری کا جال:

اس منحوس دن کو گزرے پچاس سال سے زائد ہو چکے ہیں اور ہر گزرتے دن کے ساتھ فلسطینی مسلمانوں کی مشکلات بڑھتی جاتی ہیں۔ گزشتہ دسمبر سے ستم رسیدہ فلسطینیوں کے

مصائب اچانک کئی گنا بڑھ گئے ہیں اور اب حال یہ ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ سرزمین معراج پر مسلمان کا لہو نہ گرتا ہو۔ مسلمان ایک جنازے کو دفن کر کے ابھی واپس نہیں لوٹے ہوتے کہ کسی دوسرے نوجوان (فلسطینی شہداء کی اکثریت نوخیز نوجوانوں اور کم عمر بچوں سے تعلق رکھتی ہے، گویا کہ یہودی افواج ان کی نئی نسل کو فنا کرنے کے درپے ہیں) کے لہو میں رنگ جانے کی خبر آجاتی ہے۔ یہودیوں کی سفاکیت میں اضافے اور تشدد کی بڑھتی ہوئی لہر سے ہر صاحبِ دل مسلمان فکرمند ہے لیکن اپنی بے بسی کے اظہار اور دنیا کے اس بدترین ظلم اور دھاندلی پر کڑھنے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا۔ فلسطینی مسلمان اس حالت کو کس طرح پہنچے؟ یہودیوں نے ان کے گرد عیاری کا ایسا جال بننے میں کیونکر کامیابی حاصل کی؟ جس کی کسی ہوئی ڈوریاں اگر کوئی مسلمان ڈھیلی کرنا چاہے تو بھی نہ کر سکے، فلسطینی مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا مداوا کیا ہوگا؟ ان سے سوالوں کے لیے ہمیں سو سال پیچھے جا کر صہیونی بڑوں کے اجلاس کے پس منظر اور اس کے بعد اسرائیل کے قیام تک ہونے والی سازشوں اور مسلمانوں کی سادگی کی داستان پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے ذرا فلسطین کی قدیم تاریخ کا خلاصہ اور اس بابرکت سرزمین کا مختصر تذکرہ...... ایمان کی تازگی کے لیے...... کرتے ہیں۔

تاریخی خطہ:

فلسطین روئے زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو تاریخی، جغرافیائی اور مذہبی ہر اعتبار سے تاریخ ساز اہمیت کا حامل ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے مادی اور روحانی برکات سے مالا مال فرمایا ہے۔ کئی جلیل القدر انبیاء اس سرزمین میں مبعوث ہوئے اور اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر یہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف فاتحین کی جنگ آزمائی کا میدان بھی رہا۔ یہاں کی سرزمین نے زمانے کے اتنے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں جو کم ہی کہیں اور دیکھنے میں آئے ہوں گے۔ مشہور ہے کہ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے وقت سے آباد تھا لیکن درحقیقت یہ اس سے بھی بہت پہلے قدیم انسانی تہذیب کا مرکز تھا (اس مسئلہ پر آگے چل کر قدرے تفصیل سے گفتگو ہوگی)

جب یہاں حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہما السلام کی حکومت تھی تو یہ بنی اسرائیل کے

عروج کا زمانہ تھا۔ ان برگزیدہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد یہودیوں کی نافرمانیوں کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان پر مختلف فاتحین کو مسلط کیا جنہوں نے ان کو عبرتناک طریقے سے قتل کیا، غلام بنایا اور باقی ماندہ کو یہاں سے جلاوطن کر دیا۔ کسی قوم کی ایسی اجتماعی رسوائی اور وطن سے محرومی کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ قرآن مجید کے مطابق یہ درحقیقت عذاب الٰہی تھا جو اس کم فطرت قوم کی شرارتوں پر ان پر بھیجا گیا تھا۔ اس سلسلے میں تاریخ کے صفحات ہمیں عراق کے بخت نصر اور روم کے ٹائٹس کے نام بتاتے ہیں جن کی یورش نے یہودیوں کو رسوا کن طریقے سے دربدر کیا۔ عراق، فارس اور روم کے کئی اور بادشاہ یہودیوں کی بداعمالی کی سزا کے طور پر ان کو تاراج کرتے رہے مگر زیادہ مشہور متذکرہ بالا دو بادشاہوں کے حملے ہیں۔

آخری تنبیہ:

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی بعثت یہودیوں کے لیے آخری تنبیہ اور آسمانی حجت تھی مگر اس شقی اور بدبخت قوم نے ان کے ساتھ کافی بدسلوکی کی جس کی وجہ سے طویل رسوائی اور بربادی ان کا مقدر بن گئی اور ان پر ذلت کی مہر ثبت ہوگئی۔ اس وقت سے آج تک یہ دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے۔ زمین کا کوئی ٹکڑا انہیں پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔ ان کے مختلف قبائل دنیا کے مختلف حصوں میں بکھر گئے لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے پھٹکار کے باعث انہیں کوئی جگہ راس نہ آتی تھی اور یہ اپنی بدفطرتی کے سبب دنیا کی مختلف قوموں سے مار کھاتے، ذلت اُٹھاتے اور عبرت کا نشان بنتے رہے تا آنکہ گزشتہ صدی میں یہ سانحہ پیش آیا کہ یہ ملعون قوم کئی صدیوں بعد اپنے لیے ایک مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ مسلمانوں کے لیے اس میں رنج وغصے کی بات یہ ہے کہ یہودی ریاست کے لیے مسلم ممالک کی سرزمین چھنی گئی اور ہنستے بستے مسلمانوں کو بے دخل کر کے وہاں دنیا بھر کے ناپاک یہودیوں کو لا بسایا گیا۔ اس غرض کے لیے عالمی طاقتوں کے تعاون سے بدنیتی، بددیانتی اور دھوکہ فریب پر مشتمل ایسی چالیں چلی گئیں جن کے تذکرے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

ناخن سے کھرچی مٹی:

ارضِ مقدس فلسطین پھٹکارے ہوئے یہودیوں کے تسلط میں کس طرح چلی گئی؟ اس

دردناک داستان کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ مسلمانوں نے جب ۱۶ ہجری مطابق ۶۳۶ء میں انجیل کی پیش گوئی کے مطابق فلسطین فتح کرلیا تو اس کے بعد یہ طویل عرصے تک مسلمانوں کے پاس رہا اور انہوں نے یہاں شاندار علمی وتہذیبی ورثہ چھوڑا۔ بارہویں صدی عیسوی میں اہل یورپ نے اسے مسلمانوں سے چھیننے کے لیے مشہور صلیبی جنگیں لڑیں اور ایک مرتبہ وہ کامیاب بھی ہوگئے مگر فرزند اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں زبردست معرکہ آرائی کے بعد یہاں سے نکال باہر کیا اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی یہ وراثت مسلمانوں کے پاس رہی۔ ۱۲۲۲ ہجری مطابق ۱۵۱۶ء میں فلسطین ترکوں کی عملداری میں آگیا اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمے تک سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے دنوں میں صہیونی لیڈروں کا وہ اجلاس ہوا جس کا ذکر اس مضمون کے شروع میں ہے۔ آخر عثمانی خلیفہ سلطان عبدالمجید خان تھے۔ یہودیوں نے فلسطین پر ان کی کمزور پڑتی گرفت کے سبب متذکرہ بالا اجلاس میں طے کرلیا تھا کہ فلسطین میں صہیونی ریاست تشکیل دینی ہے، اس لیے انہوں نے پہلے مال ودولت کے ذریعے اپنا کام نکالنے کی کوشش کی۔ سلطنت عثمانیہ غیرضروری اخراجات کے سبب مقروض ہوچکی تھی۔ یہودیوں نے سلطان کو پیش کش کی کہ اگر وہ فلسطین کا علاقہ ان کے حوالے کردیں تو وہ نہ صرف یہ کہ سلطنت پر چڑھا ہوا سارا قرض چکادیں گے بلکہ اس کے علاوہ بھی کثیر مقدار میں سونا پیش کریں گے۔ عثمانی سلطان کیسے ہی سہی مگر ان کی رگوں میں فاتحین کا خون دوڑ رہا تھا، انہوں نے اپنے پاؤں کے ناخن سے مٹی کھرچی اور یہودیوں کو کورا جواب دیتے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کہے: ''اگر تم اپنا سارا مال ودولت لاکر میرے قدموں میں ڈھیر کردو تو پھر بھی میں فلسطین کی اتنی مٹی بھی نہ دوں گا۔'' یہودیوں نے مایوس ہوکر کسی عالمی طاقت کو اپنا ہمنوا بناکر اس کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش شروع کی۔ قرآن کریم کی پیش گوئی ہے کہ یہودی کسی طاقت کا سہارا ضرور ڈھونڈتے ہیں، محض اپنے زور بازو پر کچھ کرنے کے قابل نہیں۔

اعلان بالفور کیا ہے؟

اس زمانے میں پہلی جنگ عظیم جاری تھی۔ امریکا اور برطانیہ اتحادی طاقتوں کے سربراہ

تھے۔ برطانیہ کو مختلف محاذوں پر جنگ کا سامنا ہونے کی وجہ سے سرمائے کی شدید ضرورت تھی۔ یہودیوں نے برطانیہ کی مدد کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے اور اس کے عوض انگریزوں سے وعدہ لیا کہ جنگ میں کامیابی کے بعد فلسطین کی حدود میں یہودی ریاست کے قیام میں مدد دی جائے گی۔ لندن صیہونی تنظیموں کا مرکز تھا اور وہاں کے متمول یہودی تاج برطانیہ کے نزدیک اور بہت بااثر سمجھے جاتے تھے۔ جنگ کے اختتام پر جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو یہودیوں کی دیرینہ مراد برآئی۔ ۲/نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر بالفور (Balfor) نے برطانیہ میں مقیم یہودیوں کی فیڈریشن کے چیئرمین لارڈ شیلڈ کے نام ایک خط روانہ کیا جس میں صیہونی ریاست کی تشکیل کا ذمہ لیتے ہوئے کہا گیا تھا: ''ہز میجسٹی حکومت فلسطین میں یہودی عوام کے لیے ایک قومی وطن کے قیام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس مقصد کے حصول کو آسان بنانے کے لیے اپنی بہترین کوششیں صرف کرے گی۔'' بعد ازاں یہی مکتوب ''اعلان بالفور'' (Balfor Declaration) کے نام سے موسوم ہوا۔ اس میں فلسطین کے غیر یہودی باشندوں (مسلمانوں) کے حقوق کی بھی ضمانت دی گئی تھی مگر یہ درحقیقت مسلمانوں کے ردعمل سے دفاع کے لیے تھا۔ قصہ مختصر جنگ عظیم میں اتحادیوں کی کامیابی کے بعد انگریز ۱۹۱۷ء میں جنرل ایلن بی کی قیادت میں فلسطین میں داخل ہو گئے اور ۹/ دسمبر ۱۹۱۷ء کو انہوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ ترکی اور جرمن فوجیں شام کی طرف ہٹ گئیں اور اس دن سے فلسطین کی حکومت انگریزوں کے پاس آگئی۔

مبہم وعدے:

جنگ کے دوران انگریزوں نے جنگ جیتنے کے لیے عربوں اور یہودیوں سے متضاد وعدے کیے تھے...... عربوں سے کیے گئے وعدوں میں جان بوجھ کر ایسا ابہام رکھا گیا تھا جس کی بعد میں مختلف تاویلیں کی جاسکتی ہوں۔ چنانچہ عربوں سے کیے گئے وعدے تشنۂ وفا ہی رہے جبکہ یہودیوں سے برطانیہ نے ایسی وفاداری دکھائی جو اس کی مسلم دشمنی اور یہود نوازی کی فطرت کی غماز ہے۔ آج بہت سے مسلمان پھیکی سفید چمڑی اور مکار گندی فطرت والی انگریز

قوم کی زیادتیوں سے واقف نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خنزیر نما قوم کا بہت سا ادھار مسلمانوں پر چڑھ چکا ہے جن کو گرم نوجوان خون ہی اتار سکتا ہے۔ برطانوی یہودیوں نے انگریزوں کو بہت خوبی سے استعمال کیا اور انگریز نے اس کے کام آنے کے لیے بہت کاریگری سے ہاتھ دکھائے۔ جمعیت الاقوام سے منظور کرایا گیا کہ برطانیہ کو فلسطین پر نگرانی (انتداب، اقوام متحدہ کی جانب سے عارضی طور پر دیا جانے والا حکومت کرنے کا اختیار واقتدار، Mendate) کا اختیار دیا جائے چنانچہ یکم جولائی ۱۹۲۰ء کو ایک انگریز ہائی کمشنر کو ''نگران'' بنا کر بھیج دیا گیا۔

داستان عبرت آموز:

ہربرٹ سموئیل نامی یہ نگران کٹر یہودی تھا۔ اسے سب سے اعلیٰ فوجی اور انتظامی اقتدار حاصل تھا اور یہی مجلس عاملہ کا صدر بھی تھا۔ برطانوی انتداب (نگرانی) کی یہ مدت ۳۰ سال پر محیط ہے اس دوران برطانیہ کی ملکۂ عظمیٰ (جس کا چند سال پہلے پاکستان اور متحدہ عرب امارات وغیرہ میں شاندار استقبال کیا گیا تھا) کی زیر نگرانی یہودیوں کے لیے خود مختار قومی وطن قائم کرنے کے لیے زیر زمین سازشیں ہوتی رہیں۔ جب ان مکروہ تدبیروں نے صہیونیت کا راستہ آسان کر دیا تو باہمی گٹھ جوڑ سے ۱۹۴۸ء میں برطانوی انتداب (نگرانی) کا خاتمہ کر دیا گیا اور اسی سال ۱۴/مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں کی ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا اعلان کر دیا گیا۔ برطانوی نگرانی کے اس عرصے میں یہودیوں کا آلۂ کار بنتے ہوئے تاج برطانیہ نے فلسطینی مسلمانوں سے جو دغا بازیاں اور فریب کاریاں کیں، ان کی داستان بڑی دل گداز، جگر سوز اور عبرت آموز ہے۔ مسئلہ فلسطین، ماضی، حال، استقبال کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

رُودادِ جور و جفا:

برطانیہ نے برصغیر، مشرق وسطیٰ اور بعض افریقی ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم، غضب اور جفا کاری کا جو برتاؤ کیا وہ نہایت ہولناک ہے، مگر فلسطین میں اس کا کردار اور بھی

زیادہ گھناؤنا اور قابل نفریں ہے۔ افسوس کہ ہماری آج کی نسل ان تمام ظلم اور زیادتیوں سے ناواقف ہے جو اس بدخصلت قوم نے ہمارے ساتھ روا رکھیں، اس وجہ سے انگریز ہماری سلطنتیں چھیننے اور ہمارے مال ودولت سے اپنا گھر بھرنے کے باوجود مطمئن ہیں کہ کوئی ہاتھ ان کے گریبان تک پہنچے گا نہ کسی کی نظر انتقام ان کی طرف اُٹھے گی۔ جنگِ عظیم اول کے دوران برطانیہ کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف عرب ممالک کی مدد درکار تھی۔ اس غرض سے اس نے حاکم مکہ، شریف حسین سے گفت وشنید کی۔ اس غدار حکمران کے ساتھ اس کا معاہدہ ہوا کہ عرب ممالک برطانوی حکومت کے ساتھ اس صورت میں تعاون کرسکتے ہیں کہ جنگ کے اختتام پر ان کی آزادی وخودمختاری کے اعلان کا وعدہ کیا جائے۔ انگریز کی عیاری دیکھیے کہ ایک طرف وہ یہودیوں سے جزیرۃ العرب میں صہیونی ریاست کی تشکیل کے عوض دولت اینٹھ رہا تھا اور دوسری طرف عرب ممالک سے آزادی اور خودمختاری کے وعدے کرکے ان سے تعاون حاصل کررہا تھا۔ جنگ جیتنے کے کچھ عرصے بعد اس نے عرب ممالک کو خودمختاری دے کر ان کی سرحدوں کا تعین کردیا، مگر فلسطین کی سرزمین پر چونکہ اسے ایک صہیونی ریاست کا قیام منظور تھا، اس لیے اس سوال کو موضوع اختلاف بنا کر کھڑا کردیا گیا کہ آیا فلسطین کو بھی ان علاقوں میں شمار کرنا چاہیے یا نہیں جن کو خودمختاری دی جانی تھی، حالانکہ یہ بات سرے سے اختلاف کا باعث ہی نہیں تھی کہ فلسطین بھی عرب کی حدود میں شامل اور آزادی کا مستحق ہے۔

یہودیوں کی نقل مکانی:

انگریز نے صرف اس وعدہ خلافی اور دغابازی پر بس نہیں کی بلکہ اپنی نگرانی میں صہیونی مقاصد کی تکمیل کا عمل زور وشور سے جاری رکھا۔ اس کے لیے اس نے دو باتوں پر زور دیا۔

(۱) ایک تو یہ کہ اسرائیل کو آبادی اور وسائل کے لحاظ سے مضبوط کیا جائے۔ یہودی چونکہ فلسطین میں نہایت قلیل تعداد میں تھے اس لیے غیر محسوس طور پر منصوبہ شروع کیا گیا کہ فلسطینی مسلمانوں کے مکانات اور جائیدادیں خریدی جائیں اور دنیا بھر سے یہودیوں کو لاکر یہاں بسایا جائے۔ اس غرض کے لیے یہودیوں کی تنظیمیں اور سرمایہ دار یہودی سرگرم ہوگئے اور فلسطینی مسلمانوں کی جائیدادیں خریدنے کے لیے پانی کی طرح پیسہ بہایا گیا۔ مقامی علمائے کرام نے

اس کی سختی سے مخالفت کی اور مسلم عوام کو منع کیا کہ یہودیوں کے ہاتھ مکانات اور زمینیں ہرگز فروخت نہ کریں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے ساری دنیا کے سربرآوردہ علمائے کرام ومفتیان حضرات سے فتاویٰ بھی طلب کیے۔ ان سب حضرات نے اس امر کو ناجائز وحرام بتلایا۔ اس سلسلے کا ایک فتویٰ برصغیر کی مشہور علمی وروحانی شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے بھی لیا گیا۔ (اندازہ لگائیے کہ عالم اسلام میں علماء دیوبند کا کیا مقام تھا؟) آپ نے بھی اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا۔ (دیکھیے امداد الفتاویٰ: ج ۳ ص ۵۹) اس وقت کچھ تو عوام کی غفلت تھی، کچھ مسلمانوں کا غربت وافلاس اور کچھ یہودی کی عیاری ومکاری کہ علمائے کرام کے سختی سے منع کرنے کے باوجود مقامی آبادی سے زمینیں خرید خرید کر یہود اپنے پاؤں جماتے گئے اور دھیرے دھیرے انبیاء علیہم السلام کی اس مقدس سرزمین میں روس، یورپ اور افریقہ سے آئے ہوئے یہودی آباد ہوتے گئے۔ برطانوی کمشنر کی زیرنگرانی چپ چپاتے یہ عمل جاری رہا اور نوبت یہاں تک آپہنچی کہ فلسطین کی آبادی کا تناسب دھیرے دھیرے تبدیل ہونے لگا۔ وہی یہودی جو ۱۹۱۴ء میں یہاں کی آبادی کا ۹ فیصد تھے، ۱۹۲۱ء میں ۱۱ فیصد ہوگئے، ۱۹۳۱ء میں ان کی آبادی بڑھ کر ۱۷ فیصد تک پہنچ گئی اور ۱۹۴۸ء میں جب مقبوضہ فلسطین میں اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوا تو تیزی سے بڑھتے ہوئے یہودیوں کی تعداد ۱۳ء۵ فیصد تک جا پہنچی تھی۔ ایک جائزے کے مطابق ۱۸۸۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان پانچ لاکھ یہودی باہر سے آکر مقبوضہ فلسطین میں آباد ہوئے۔

نقشے بولتے ہیں:

اسرائیل کے قیام کے اعلان کے بعد تو غضب ہی ہوگیا۔ یہودیوں نے ہر قسم کا تکلف بالائے طاق رکھتے ہوئے دھڑا دھڑ فلسطین کی طرف نقل مکانی شروع کی۔ جنگ عظیم دوم میں جرمنی کے رہنما ہٹلر کی طرف سے یہودیوں کے قتل عام کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا اور اس بہانے دنیا کی ہمدردی حاصل کرکے بدفطرت اور سازشی یہودیوں کے لیے الگ وطن کی آواز اٹھائی گئی۔ ماضی کے پسِ منظر میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا میں مختلف اقوام کے ہاتھوں اپنے کرتوتوں کی بنا پر مار کھا کھا کر بکھرے ہوئے یہودیوں کو کس طرح باہر سے لا لا کر فلسطین میں

آباد کیا گیا۔ اب چونکہ یہودی بستیاں کثیر تعداد میں آباد ہوگئی تھیں، اس لیے یہودیوں نے زمینیں خریدنے کی بجائے دہشت گردی شروع کردی اور قتل وغارت گری اور فلسطینیوں میں خوف وہراس پھیلانے کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ یکم اپریل ۱۹۴۸ء اور ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کے درمیان یعنی صرف ڈیڑھ ماہ میں چار لاکھ مسلمان اور عیسائی فلسطینیوں کو اپنا گھربار چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی اور آج وہ پڑوسی ملکوں کے مہاجر کیمپوں میں پناہ گزین ہیں۔ دنیا میں ظلم اور ناانصافی کی بہت بڑی بڑی مثالیں موجود ہیں لیکن جدید دنیا میں جبکہ ذرائع مواصلات کی تیز رفتاری کی بدولت کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی، اتنے بڑے ظلم، اتنی بھیانک تاریخی بددیانتی اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی مثال پوری تاریخ عالم میں نہیں ملے گی۔ ذرا اندازہ تو لگائیں کہ صدیوں سے آباد فلسطینی تو گھربار سے محروم ہوکر مہاجر کیمپوں میں پناہ لیں جہاں ان کی زندگی صہیونی درندوں کے رحم وکرم پر ہے اور بدکردار قسم کے یہودی ان بے کسوں کے گھروں پر قابض ہوکر دادِ عیش دیں۔ آپ اس حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے اکثریتی علاقے کس طرح ایک دوسرے سے جدا اور مسلمان کس طرح بکھرے ہوئے ہیں جبکہ یہودی القدس سمیت دیگر اہم شہروں پر قابض ہوکر اپنی آبادی کو مربوط شکل میں بڑھاتے اور نئی بستیاں تعمیر کرتے جارہے ہیں۔

صلح پسند پڑوسی:

(۲) صہیونی ریاست کے استحکام کے لیے دوسرا امر جس کا اہتمام کیا گیا، یہ تھا کہ اسرائیل کو تو ہر قسم کا اسلحہ اور ٹیکنالوجی دے کر اسے مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے چنانچہ آج وہ منی سپر پاور مانا جاتا ہے، لیکن اس کے پڑوس میں واقع مسلم ممالک کو عسکری اعتبار سے اس کے مدمقابل آنے کے قابل نہ ہونے دیا جائے بلکہ کوشش کی جائے کہ ہمسایہ ممالک میں ایسی حکومتیں برسرِاقتدار ہوں جو صہیونی عزائم کی راہ میں حائل نہ ہوسکیں، اگر کوئی ایسا کرنے کی جرأت کرے تو اسے جارحیت کے ذریعے اس قابل نہ چھوڑا جائے۔ عرب ممالک سے اسلامی غیرت اور شوق جہاد کے خاتمے کے لیے ان میں بڑے منظم طریقے سے قوم پرستی کے جراثیم

پیدا کیے گئے۔ چنانچہ اب اسرائیل پانچ اسلامی ریاستوں کے بیچ میں گھرا ہوا ہے لیکن اسے اپنے "صلح پسند پڑوسیوں" سے کوئی خطرہ نہیں۔ رہے بے بس فلسطینی مسلمان تو وہ یکا وتنہا اپنی آزادی کے لیے جہاد کر رہے ہیں۔ کوئی عرب ملک ان بے سہاروں کی پشت پناہی کے لیے تیار نہیں۔ دوسری طرف اسرائیل کی پشت پر مغرب کی بڑی طاقتیں موجود ہیں جو فلسطینیوں کے کچلنے میں پوری طرح اس کی ہمنوا اور حمایتی ہیں۔

دلیل طاقت کی محتاج ہے:

صورتحال روز بروز گھمبیر ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ لوگ اس کا حل مذاکرات کو قرار دیتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذاکرات میں تو دلیل سے بات کی جاتی ہے۔ اگر متشدد یہودی دلیل کی زبان مانتے تو آج آگ وخون کا یہ کھیل ارض فلسطین میں جاری ہی کیوں ہوتا؟ اگر محض دلیل کی طاقت سے حقدار کو اس کا حق مل جاتا تو دنیا میں اسلحہ ایجاد ہی نہ ہوا ہوتا۔ لوگ زبان سے کہہ سن کر اپنا حق وصول کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ دلیل جتنی بھی سچی اور کھری ہو، اس کے منوانے کے لیے طاقت ضروری ہے۔ انصاف کا حصول اور حقوق کا تحفظ، طاقت کا مرہون منت ہے ورنہ امن میں پولیس اور زمانہ جنگ میں فوج کی ضرورت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے...... لہٰذا مذاکرات بھی اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب فریقین برابر کی سطح کے ہوں اور ہر فریق کو مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں دوسرے فریق کے زوردار ردعمل کا خطرہ ہو۔ اگر مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر دلائل کی پٹاری کھولنے سے قبل مطلوبہ طاقت مہیا نہ کی جائے تو میزیں سجتی رہیں گی لیکن حقوق کی پامالی اور مظلوم وکمزور قوموں کو روندنے کچلنے کا عمل رک نہ سکے گا۔ اے خدائے واحد پر ایمان لانے والے سادہ لوح مسلمانو! بدبخت یہودیوں نے انبیائے کرام کے حقوق کا احترام نہیں کیا تو تمہیں تمہارا حق کس طرح دے دیں گے؟ ان سے مذاکرات کی میز پر سامنا کرنا اس وقت تک بیکار ہے جب تک جنگ کے میدان میں انہیں نیچا دکھانے کے قابل نہ ہو جاؤ۔

بوسیدہ ٹاٹ:

حقیقت یہ ہے کہ یہودی چونکہ موت سے بہت زیادہ ڈرتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں

سورۂ بقرہ اور سورۂ جمعہ میں بیان کیا گیا ہے، اس لیے وہ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور شوق شہادت سے سخت خوفزدہ رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کوشش ہے کہ مجاہدین سے میدان جنگ میں پنجہ آزمائی مول لینے کی بجائے انہیں مذاکرات کے جال میں اُلجھایا جائے، ورنہ کون نہیں جانتا کہ ان کے دلائل پونچھا لگانے کے ٹاٹ سے زیادہ بوسیدہ ہیں۔ مثلاً ان کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے کہ وہ فلسطین کے قدیم ترین اصل باشندوں کی اولاد ہیں۔ ان کے آباء واجداد نے ہزاروں سال پہلے یہاں یہودی ریاست قائم کی تھی اور بیسویں صدی میں اسی اصلی یہودی ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے...... لیکن اسے کیا کریں کہ مغربی مصنفین سمیت تمام تاریخی مآخذ اس بات پر متفق ہیں کہ فلسطین میں بسنے والے عربوں کی اکثریت کے آباؤاجداد اسلامی فتح کے ساتھ فلسطین میں نہیں آئے تھے بلکہ وہ بنیادی طور پر سامی الاصل ہیں جو تین ہزار سال قبل مسیح کے زمانے میں فلسطین میں آباد تھے۔ نیز مؤرخین اس بات پر بھی متفق ہیں کہ قدیم عبرانی جن کی اولاد اور وارث ہونے کا آج کے یہودی دعویٰ کرتے ہیں وہ تو عراق سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ وہ یہاں کے اصل باشندے تھے ہی نہیں۔ پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہودی جب جلاوطن ہو کر دنیا میں بکھرے تو بہت سے غلام بنالیے گئے تھے جن کا نسب محفوظ نہیں رہا اور وہ دوغلی نسل کے ہیں نیز لاتعداد غیر سامی باشندے اپنا مذہب تبدیل کر کے یہودی ہو گئے تھے اور اس دور کے بہت سے یہودی غیر سامی الاصل قبیلوں کی نسل سے ہیں جبکہ فلسطین کے عرب مسلمان ہزار ہا سال سے وہیں بس رہے ہیں اور خالص نسب کی بنا پر یہاں کے قدیم باشندوں کی اصل نسل ہیں۔

اگر فرض کرلیا جائے کہ یہودی واقعی فلسطین کے قدیم ترین حکمرانوں کی اولاد ہیں تو بھی ارضِ فلسطین پر ان کا دعویٰ ملکیت نہایت کمزور ہے۔ دو ہزار برس پہلے کسی خطۂ ارض کے منتشر حصوں پر باہر سے آکر قبضہ کر لینا آج یہودیوں کو یہاں کا مالک نہیں بنا دیتا۔ اگر ایسا ہو تو تمام استعماری ممالک اپنے زیر قبضہ ممالک پر...... جو جنگ عظیم دوم کے بعد آزاد ہو گئے...... حق ملکیت جتا سکتے ہیں۔ نیز اس اعتبار سے اسپین پر مسلمانوں کا، امریکا پر ریڈ انڈین کا اور آسٹریلیا پر ریب اور جبنز کا حق بنتا ہے، کیا یہودیوں کی حمایت کرنے والے یہ ممالک اپنے ملکوں پر

دوسروں کا اس طرح کا حق تسلیم کرنے پر تیار ہیں؟۔

چیل کا گھونسلا:

غرض یہودیوں کے دلائل وزن سے اسی طرح خالی ہیں جیسے چیل کا گھونسلا گوشت سے...... لیکن وہ اور ان کے بدنیت اور جانبدار سرپرست پھر بھی فلسطینی مسلمانوں سے اسلحہ رکھوا کر ان کے ہاتھ میں مذاکرات کے نوٹس بنانے والا قلم تھمانا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جنت کے شیدائی مسلمان اس وقت تک ان کا ناک میں دم کیے رکھیں گے جب تک کہ انہیں شہادت کے راستے سے ہٹا کر بات چیت کی بھول بھلیوں میں گم نہیں کر دیا جاتا۔ نئے عالمی نظام میں جب سے برطانیہ کی جگہ امریکا نے لی ہے یہودیوں نے اسے مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے رکھا ہے اور وہ اس یہودی غنڈے کے اشارے پر بانس سے بنے شتونگڑے کی طرح گھومتا اور قلابازیاں کھاتا ہے۔ ان سب کی فلسطینی مجاہدین سے جان نکلتی ہے لہٰذا انہوں نے سیاسی گروپوں کو آگے کر کے یاسر عرفات جیسے موم کے لیڈر گھڑ لیے ہیں اور دنیا کو مذاکرات کا جھانسہ دے کر عظیم تر اسرائیل کی طرف پیش قدمی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ فلسطین کے جہادی قائدین تو قید و بند کی مصیبتیں اُٹھاتے ہیں یا دہشت گرد حملوں میں شہید ہو جاتے ہیں لیکن یاسر عرفات جیسے یہودی بیوی رکھنے والے ''مرد آہن'' ہیڈ کوارٹر پر میزائل حملوں کے باوجود ''بال بال'' بچ نکلتے ہیں اور تاحیات فلسطینی مسلمانوں کی نمایندگی کرنے کا اعزاز حاصل کرنے بلکہ ریکارڈ قائم کرنے کی امید باندھے ہوئے ہیں۔

فیصلہ کن معرکہ:

ہوسکتا ہے کہ کوئی نادان ان کی عیاری وہوشیاری کی داستانیں سن کر یا ان کی شیطانی کارروائیوں سے مرعوب ہو کر یہ سمجھتا ہو کہ یہودی ذلت اور خواری کی مہر سے نجات پا چکے ہیں اور ارضِ فلسطین میں ان کی ریاست کا قیام ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا سنگ میل ہے، لیکن جو شخص قرآن وسنت کا عبوری مطالعہ بھی کرتا ہوا سے اس بات میں ذرا شک نہیں کہ مقبوضہ فلسطین میں یہودیوں کا اجتماع درحقیقت ان کی آخری اور ابدی شکست بلکہ روئے زمین سے

ناپیدگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ حدیث شریف کی پیش گوئی کے مطابق ارضِ فلسطین کی طرف دنیا بھر کے یہودیوں کا رجوع اور ان کا یہاں سمٹ آنا دراصل اس آخری اور فیصلہ کن معرکے کا پیش خیمہ ہے جو اس خطے میں اہل ایمان اور خدا ورسول کی گستاخ اور مردود یہودی قوم کے درمیان لڑا جائے گا۔ اس معرکہ میں سرزمین انبیاء کا ہر پتھر اور درخت مسلمان مجاہدین کو پکارے گا کہ اللہ کے بندے! اِدھر آ، یہاں میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہے، اس کی تمام شیطنت اور دجل سمیت اسے اس کے آخری ٹھکانے، جہنم کے آخری سرے تک پہنچا دے۔ بمطابق فرمان صادق امین، نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ''غرقد'' نامی درخت یہودیوں کی نشاندہی نہ کرے گا چنانچہ آج اسرائیلی دارالحکومت اور دیگر شہروں میں صہیونی حکومت نے غرقد کے لاتعداد درخت جابجا لگوائے ہیں لیکن اس بات کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا کہ جب ان کی ہزاروں سال کی نافرمانی اور گستاخی کی سزا قریب آلگے گی تو غرقد کے درخت کب تک انہیں پناہ دیں گے؟؟؟

آخری انجام کی تمہید:

مسلمانوں کو یہودیوں کے بے پناہ ظلم وستم اور جور وجفا سے خائف ہونے کی بجائے شریعت کے کامل اتباع اور جہاد فی سبیل اللہ پر پختہ اور مضبوط ہو جانا چاہیے۔ مقبوضہ فلسطین کی طرف دنیا بھر سے یہودیوں کی نقل مکانی دراصل ان کے آخری انجام کی تمہید ہے۔ جب ان کی اکثریت یہاں سمٹ آئے اور ان کی حرکات حد سے تجاوز کر جائیں گی اور ان کا فتنہ گر وفتنہ پرور رہنما ''دجّال'' ان کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے خلاف اٹھے گا تو حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت مہدی کی قیادت میں مجاہدین کا لشکر ان کی سرکوبی کے لیے دمشق سے فلسطین کی طرف بڑھے گا تب دجال فرار ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کا پیچھا کریں گے اور حدیث شریف کے مطابق مقام ''لُد'' میں اسے جالیں گے۔ یہاں پر انسانیت کا یہ مردود ترین فرد ان کے ہاتھ موت کے گھاٹ اترے گا۔ (صحیح مسلم، باب ذکر الدجال: ج ۲ ص ۴۰۱، ترمذی شریف، باب ماجاء فی فتنۃ الدجال: ج ۲ ص ۴۷) پھر اس کی مردود قوم بھی مجاہدین کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے فنا کے گھاٹ اتر جائے گی۔ ''لُد'' نامی مقام آج اسرائیل کے دارالحکومت

ل ابیب کے قریب ہے۔ کمزور ایمان وعمل والے مسلمان دجّال کے فتنے میں بہ جائیں گے
ہل اللہ سے مضبوط تعلق رکھنے والے اور اس کی خاطر جان دینے کا جذبہ رکھنے والے ثابت قدم
رہیں گے اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے لشکر میں شامل ہوکر مغفرت اور جنت کے
تحق ہوں گے۔ اے اہل ایمان! اپنے اعمال کی جانچ کرو اور اس وقت کی تیاری رکھو جب
مہیں خیر وشر میں سے کسی ایک کی خاطر جان دینے کا سامنا کرنا پڑے گا۔

القدس سے بابل تک

سقوطِ کابل، قندھار اور بغداد کے موقع پر بہت سے افراد کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن اگر ہمیں پتہ چل جائے کہ سقوطِ بغداد کے بعد کس ملک یا علاقے کے سقوط کا منصوبہ دشمنانِ اسلام نے تیار کر رکھا ہے تو شاید ہمارے آنسو ختم ہو جائیں...... یہ ۶ جون ۱۹۶۷ء کا دن تھا جب اسرائیلی فوجیں ''القدس'' شہر میں گھس گئیں اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ اس دن اسرائیلی افواج کے سربراہ نے اپنے جن مذموم عزائم کا اظہار کیا وہ انتہائی قابل تشویش تھے۔ موشے دایان جو صہیونی تحریک کے چوٹی کے رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے اور جو پسِ پردہ رہ کر کام کرنے والے اعلیٰ صہیونی دماغوں کا ترجمان اور ان کے منصوبوں کے نفاذ کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا، یہ اس دن اسرائیلی برّی افواج کا سربراہ تھا۔ اس کی ایک عادت یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ کوئی بھی منصوبہ مکمل ہونے پر پیچھے مڑ کر اس کی مبارکبادیاں لینے کی بجائے کسی نئے منصوبے کی طرف توجہ مرکوز کر لیتا تھا چنانچہ اس نے ''یروشلم آپریشن'' کامیابی سے مکمل ہونے کی اطلاع پا کر کہا: ''ہم نے یروشلم پر قبضہ مکمل کر لیا ہے، اب ہم یثرب اور بابل کی طرف بڑھنے والے ہیں۔''
جس وقت موشے دایان تل ابیب سے یہ بیان جاری کر رہا تھا اس وقت عراقی مسلمانوں کو دیوانیہ، ناصریہ، عمارہ اور دہوک سے نقل مکانی کر کے مقبوضہ فلسطین جانے والے یہودیوں کے الفاظ یاد آئے۔ انہوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے علی الاعلان کہا تھا: ''وہ دن دور نہیں جب ہم عراق واپس آئیں گے اور اپنی جائیدادیں واپس لیں گے۔'' عراقی مسلمان حیران تھے کہ یہ کم بخت اتنے عرصے تک ہمارے پڑوس میں کتنے آرام و سکون سے رہنے کے بعد جاتے وقت ہمیں ہی

تسلی دے رہے ہیں۔ انہیں یہ خبر نہ تھی کہ یہود مردود ان کے احسانات کا ہرگز کوئی لحاظ نہ کریں گے کہ محسن کشی اور بدعہدی ان کی سرشت میں داخل ہے اور اتنے عرصے تک عراقی مسلمانوں نے ان کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا تو اس دوران بھی آستین کے سانپ کی طرح ان کو ڈسنے میں لگے رہے تھے۔

سقوطِ بغداد کی موجودہ کہانی مارچ میں امریکی حملوں سے نہیں بلکہ ۴/ جون ۱۹۰۳ء کو شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ دن تھا جب نئے عثمانی وزیر اعظم عزت پاشا کو تھیوڈور ہرزل نامی یہودی رہنما کا ایک خط موصول ہوا۔ یہ شخص یہودیوں کے موجودہ صہیونی نظام اور بین الاقوامی تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح پیٹر نامی عیسائی پادری صلیبی جنگوں کا محرک تھا اسی طرح یہ شخص اس صہیونی تحریک کا بانی ہے جس نے آج عالمِ اسلام بلکہ کرۂ ارض کے اکثر حصوں میں فتنہ وفساد کی آگ لگا رکھی ہے۔ یہ ہنگری کے دارالحکومت میں ۲ مئی ۱۸۶۰ء کو پیدا ہوا اور اپنے مرنے کے دن ۳ جولائی ۱۹۰۴ء تک یہودیوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا رہا۔ بنیادی طور پر یہ صحافی اور تمثیل نگار تھا لیکن اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہودیت کے لیے اپنے آپ کو ایسا وقف کیا کہ آج ہر یہودی اسے اپنا محسن سمجھتا ہے۔

اس نے ۱۸۹۶ء میں پہلا پمفلٹ شائع کیا جس کا نام (DAR JUDEAS TEET) تھا۔ اس کے ذریعے اس نے دنیا بھر میں دربدر پڑے ہوئے ذلیل وخوار یہودیوں میں حصول وطن کی آگ لگادی۔ اس نے دنیا بھر کے یہودی دماغوں کو جمع کیا اور ان کے سالانہ اجلاس منعقد کروائے۔ ان میں سے پہلے ہی اجلاس میں جو سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں ۱۸۹۷ء میں ہوا، اس نے اعلان کیا کہ دنیا آیندہ ۵۰ سال کے اندر کرۂ ارض پر ایک یہودی ریاست کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گی۔ اس نے اپنی تنظیم کا نام "انجمن محبین صہیون" رکھا تھا جس کا بنیادی مقصد ارضِ فلسطین میں ایک یہودی ریاست کا قیام تھا۔ صہیون بیت المقدس کے قریب ایک پہاڑی کا نام ہے جس کو یہود مقدس سمجھتے ہیں۔ ابتداء میں اس تحریک کے مقاصد کو نہایت سختی کے ساتھ خفیہ رکھا گیا تھا اور اس مقصد کے لیے ممبروں سے مخصوص طریقے سے حلف لیا گیا، مگر بعد میں طے پایا کہ تحریک کے اصل مقاصد عیاں کر دیے جائیں البتہ ان کی تکمیل

کے لیے جو ذیلی تنظیمیں بنائی گئیں انہیں دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے سخت اقدامات کیے گئے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی عثمانی وزیر عزت پاشا کو موصول ہونے والے خط کی...... اس خط میں تھیوڈور ہرٹزل نے ترک حکمرانوں سے درخواست کی تھی کہ یہودیوں کو عراق میں نو آبادیاں قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ عزت پاشا حیران ہوئے کہ یہ بیٹھے بٹھائے یہودیوں کو کیا سوجھی؟ انہیں عراق میں ہر طرح کے حقوق حاصل ہیں پھر الگ سے آبادیاں قائم کرنے کی کیا ضرورت؟ خود بغداد میں یہودیوں نے بہت سی زمینیں خرید رکھی تھیں، خصوصاً بغداد کے مشرق میں مضافاتی بستی ''کرادہ'' میں تو بیشتر زمینیں انہی کی تھیں۔ عثمانی وزیر نے یہ درخواست واپس کردی[1] لیکن آج جب یہود نواز جنرل گارنر بغداد پہنچ چکا ہے، بغداد کی بستیوں کو یہودی نو آبادیاں بننے سے کوئی روکنے والا نہیں۔ صہیونی تحریک القدس سے ہوکر بابل تک پہنچ چکی ہے۔ دجلہ تک قبضے کے بعد ''عظیم تر اسرائیل'' کی مشرقی سرحدوں کی تکمیل ہو چکی ہے اور اب یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ استعمار کا گنجا اژدھا کس طرف رخ کرے گا؟ صہیونی تحریک اپنی چال کامیابی سے چلتی جا رہی ہے اور مسلمان دم سادھے اس دن کے منتظر ہیں جب یہ توبہ کرنا چاہیں گے مگر اس کے الفاظ ان کے منہ سے ادا نہ ہو سکیں گے۔ یہ اپنی کوتاہیوں کی تلافی کے لیے مارے مارے پھریں گے مگر ان کو کوئی راستہ سجھائی نہیں دے گا۔ اے اہل اسلام! کب تک اپنے دشمنوں کو پنپنے کا موقع دو گے؟ کب تک ذلیل و خوار یہودی تم سے علاقے کے بعد علاقے چھینتے چلے جائیں گے؟ بابل تک یہودی جا پہنچے ہیں کیا تمہارے جیتے جی یثرب (مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم) تک رسائی حاصل کرلیں گے؟؟

ا۔ تین سال قبل عراق پر جنرل گارنر کی قیادت میں حملہ کیا گیا۔

اسرائیل کا مطلب کیا؟

ہامان یہودیوں کا مشہور تاریخ داں، جغرافیہ داں، فلسفی، ماہرِ مستقبلیات اور اعلیٰ پائے کا منصوبہ ساز گزرا ہے۔ اس کا پورا نام الفریڈ تھائر ہامان تھا۔ اس کا شمار یہودیت کے لیے فکری سطح پر کارہائے نمایاں انجام دینے والے ممتاز دانشوروں میں ہوتا ہے۔ یہودیت کے دنیا بھر میں بکھرے ہوئے افراد نے پچھلی دو صدیوں میں ایک جسم کی طرح مل کر کام کیا ہے۔ بالکل ایسے جیسے مسلمانوں کو ان کے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ یعنی جس طرح دماغ بہتر سوچ پیش کرتا ہے، دل اس پر پوری ہمت وقوت سے فیصلہ کرتا ہے اور جسم کے اعصاب و اعضاء اس پر پوری تندہی سے عمل کرتے ہیں تو انسان مطلب تک جلد اور بسہولت بلکہ بالیقین پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی قوم (اُمّت مسلمہ کا ہر فرد ایک مجتمع قوم کا فرد ہے) کے کچھ صاحب تدبیر اور صاحب رائے لوگ اس کا دماغ بن جائیں اور اس کو خیر وشر سمجھاتے رہیں، مستقبل کے لیے بہترین منصوبہ بندی کر کے دیتے رہیں، کچھ لوگ اس کا دل بن جائیں اور اس کو درکار وسائل فراہم کرنے کے لیے پوری ہمت اور قوت کے ساتھ محنت کریں اور اس کی معاشی وعسکری ''استعداد'' کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں اور کچھ لوگ اس کے جاندار اور طاقتور اعضاء بن کر ان وسائل کو طے شدہ مقاصد پر صرف کر کے بہترین نتائج حاصل کرنے کے لیے دکھا دیں تو اس کائنات کو تکوینی قوانین کا پابند بنا کر پیدا کرنے والے خدا کا فیصلہ ہے کہ اس قوم کے دن پھر سکتے ہیں............ لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں منصوبہ بندی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے اہلِ علم دنیا کی تین اہم علمی اور عالمی زبانوں (انگریزی، عربی اور معیاری اردو) کی تعلیم

کے لیے، آج سن ۲۰۰۳ء میں وہ نظام نہیں قائم کر پائے جو ۱۹۰۳ء میں کر لینا چاہیے تھا۔ اور سب کچھ جانے دیجیے۔ ہمارے بعض روشن خیال حضرات آج ان کاموں کی طرف توجہ فرما رہے ہیں جو انہیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد کر لینے چاہیے تھے جبکہ مغرب (جس کے دل و دماغ اور اعصاب و اعضاء یہودی ہیں) ۲۰۰۰ء میں ان منصوبوں پر عمل کر رہا تھا جو اس نے ۱۹۰۱ء میں سوچے تھے اور اپنی تجربہ گاہوں میں ان منصوبوں پر تجربے کر رہا ہے جو اسے ۲۱۰۰ء میں پورے کرنے ہیں اور اس کے دماغ ان امور پر سوچ بچار کر کے محتاط انداز ے قائم کر رہے ہیں جو ۲۱۰۰ء کے بعد پیش آ سکتے ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کیپٹن الفریڈ تھائر کی جو ہامان کے نام سے گزشتہ سے پیوستہ صدی میں یہودیوں کے عالمی سطح پر سوچنے والے دماغ کی ایک اہم رگ تھا۔ اس نے یہودی ریاست کی تشکیل کے لیے یہودیوں کو ''روڈ میپ'' کا ابتدائی خاکہ بنا کر دیتے وقت کہا تھا: ''جس کی حکمرانی مشرقی یورپ پر ہو اس کی حکمرانی ہارٹ لینڈ پر ہوتی ہے اور جس کی حکمرانی ہارٹ لینڈ پر ہو اس کی حکمرانی ''ورلڈ آئی لینڈ'' یعنی یوروشیا (یورپ و ایشیا) اور افریقہ پر ہوتی ہے اور جس کی حکمرانی ورلڈ آئی لینڈ پر ہو اس کی حکمرانی ساری دنیا پر ہوتی ہے۔''

ہامان کی بات کو ایک اور یہودی مفکر ہالفرڈ میکنڈر نے آگے بڑھایا۔ اس کا زمانہ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا ہے، یعنی اس کی موت کے اگلے سال اسرائیل کرۂ ارض پر ایک صہیونی ریاست کے طور پر وجود میں آ گیا تھا۔ اس نے کہا: ''ہارٹ لینڈ کرۂ ارض کا وہ علاقہ ہے جو جغرافیائی اعتبار سے ساری دنیا پر حاوی ہے لہٰذا اسے سیاسی اعتبار سے بھی سب خطوں پر فوقیت حاصل ہے، اس لیے کہ عالمی سیاست آخر کار خشکی اور سمندر پر تسلط رکھنے والی قوموں کے درمیان عظیم کشمکش پر آ کر مرتکز ہو جائے گی اور ہارٹ لینڈ اس دنیا کا وہ خطہ ہے جو بحری قوتوں سے محفوظ علاقہ ہے کیونکہ یہ ایک طرف سے سلسلۂ کوہ ہمالیہ، دوسری طرف دریائے والگا، تیسری طرف دریائے یانگ سی اور چوتھی طرف سے بحرِ قطب شمالی سے گھرا ہوا ہے۔''

ہالفرڈ میکنڈر نے ۲۵ جنوری ۱۹۰۴ء کو جبکہ دنیا جنگِ عظیم اول کی طرف بڑھ رہی تھی، اپنے یہ خیالات رائل جیوگرافک سوسائٹی لندن میں پڑھے جانے والے ایک مقالے میں پیش کیے۔

اس کا عنوان تھا: ''دی جیوگرافیکل پوائنٹ آف ہسٹری'' یہ تھے تو مبہم لیکن ان میں ''ہارٹ لینڈ'' پر بالادستی سے ساری دنیا کو تسخیر کر لینے کی قوت حاصل ہوجانے کا جو نظریہ تھا وہ اس کی اصل جان تھا لہٰذا ایک اور یہودی دانشور نکولس اسپائیک مین نے آگے بڑھ کر اس ابہام کو دور کیا اور ان نظریات میں جزوی ترمیم کرتے ہوئے میکنڈر کے متعین کردہ ''ہارٹ لینڈ'' کی حدود سے ملحق حصے کو دنیا کا اہم ترین علاقہ قرار دیتے ہوئے ''رم لینڈ'' کا نظریہ پیش کیا اور اس کے لیے ''تھرٹی فورٹی'' کی اصطلاح وضع کی گئی، یعنی ''روئے زمین کا وہ حصہ جو ۳۰ اور ۴۰ درجہ شمالی عرض بلد کے درمیان ہے۔'' اس نے یہودیوں کے لیے ایک مختصر لائحہ عمل وضع کیا: ''جو رم لینڈ پر قابض ہوگا وہ یوروشیا اور افریقہ پر قابض ہوگا اور جو ان دونوں پر تسلط حاصل کرلے گا وہ بلا شرکت غیرے ساری دنیا پر حکمرانی کرے گا۔'' ایک اور یہودی دانشور آرنلڈ ٹائنبی نے بات کو طول کر یوں بیان کیا: ''انسانی معاملات کے مرکز کشش کا نقطہ اتحاد امریکا اور یورپ کے مشرق اور ہندوستان و چین کے مغرب کے بیچوں بیچ وہ جگہ ہے جو بابل کے نواح میں جزیرہ نمائے عرب و افریقہ کے اس پار عہد قدیم کا مقام نقل و حمل ہے۔'' یہ کم و بیش وہی بات تھی جو عالمی اسرائیلی ریاست کے اولیں خاکہ میں کہی گئی تھی لہٰذا یہودی بڑوں نے اس پر اتفاق کرلیا کہ دنیا کے سب سے بڑے جزیرے...... یوروشیا (یورپ و ایشیا) اور افریقہ...... کے مرکز پر تسلط کا حصول کسی قوت کو ساری دنیا میں ناقابلِ تسخیر بنا دے گا، چنانچہ ان یہودی دانشوروں کی طرف سے یہ خیالات پیش کیے جانے کے بعد چند دہائیاں نہ گزری تھیں کہ مئی ۱۹۴۸ء کی ایک گرم رات میں یہودی ایک صہیونی ریاست کے قیام کا جشن منا رہے تھے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خیالات اسرائیل کے قیام کا اعلان تھے یا اسرائیل کا قیام ان نظریات کی عملی تعبیر تھا۔ بہرحال حقیقت یہ ہے کہ ہوا وہی جو ان لوگوں نے کہا تھا اور اب تک چونکہ ان کے طویل میعاد پر مشتمل منصوبے کامیابی سے مکمل ہوتے چلے آئے ہیں اس لیے اگر کوئی اسرائیل کا مطلب اور اس کی حقیقت جاننا چاہتا ہے تو اسے انہی یہودی دانشوروں کے نظریات کا کھوج لگانا پڑے گا اور ان پر تہہ در تہہ پڑی ہوئی پرتوں کو ہٹا کر باریک بینی سے یہودیت، اس کی نفسیات، طریق کار اور

مستقبل قریب و بعید میں ان کے مقاصد کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ تو آیئے! کچھ وقت یہودیت کے صنم خانے میں گزارتے ہیں۔

قیام اسرائیل کے بعد ابراہام اسحاق کک نامی یہودی عالم کو اسرائیل کا ''رِبیّ اعظم'' منتخب کیا گیا۔ یہ شخص بیک وقت حبر (عالم) بھی تھا اور راہب (روحانی پیشوا) بھی۔ اسے یہود کے ظاہری و باطنی علوم کا اپنے وقت کا سب سے بڑا ماہر اور بزرگ ترین روحانی پیشوا مانا جاتا تھا۔ اس نے اسرائیل کے تصور کو ان الفاظ میں واضح کیا: ''ارضِ اسرائیل کے تصور کو محض اپنی قومی وحدت قائم کرنے کا ایک ذریعہ سمجھنا حتیٰ کہ انتشار کی حالت میں مذہب کو باقی رکھنے کا ذریعہ سمجھنا ایک بانجھ خیال ہے۔ ایسے خیالات اس قابل نہیں کہ انہیں ارضِ اسرائیل کے تقدس سے نسبت دی جائے۔ ارضِ مقدس کو واپس ہونے کی امید یہودیت کی وہ بلا فصل ماخذ و منبع ہے جس سے اس کی انفرادیت برقرار ہے۔ نجات کی امید وہ طاقت ہے جو یہودیت کو انتظار میں باقی رکھتی ہے۔ ارضِ اسرائیل کی یہودیت ہی دراصل حقیقی نجات ہے۔''

''ارضِ اسرائیل کی یہودیت'' اور ''حقیقی نجات'' کی اصطلاحات کو آپ نہ سمجھ سکیں گے جب تک ان کے پسِ منظر سے آگاہ نہ ہوں۔ دراصل جب یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی بداعمالیوں کی سزا دی اور وقفے وقفے سے بخت نصر اور ٹائٹس نے یروشلم کو تباہ، ہزاروں یہودیوں کو قتل اور ہزاروں کو جلاوطن کر دیا تو کئی سال تک ذلیل و خوار رہنے کے بعد ان کو آخری مرتبہ معافی اور ہٹ دھرمی میں سے ایک چیز کے انتخاب کا اختیار ملا اور یہ آخری موقع تھا جب وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو کر رب تعالیٰ کو راضی کر سکتے تھے۔ یہ موقع سیدنا حضرت عیسیٰ مسیح اللہ علیہ السلام کی اطاعت اور ان کے ہاتھ پر توبہ کا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ گناہوں سے الگ ہو کر توبہ و استغفار کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لے گا، ان کے مصائب ختم کر دے گا اور ان کی بحالی کے لیے ایسا نبی بھیجے گا جو ان کا مسیح اور نجات دہندہ ہو گا۔ اس کی اطاعت کی برکت سے وہ مصیبتوں کے بھنور سے نکل جائیں گے۔ اس وقت سے ان میں کے نیک لوگ مسیح کی آمد کا انتظار کر رہے تھے لیکن ان کی اکثریت کو گناہوں کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ ان سے

صبر نہ ہوتا تھا۔ وہ لذت انگیز گناہ بھی نہ چھوڑنا چاہتے تھے اور ساتھ میں اس ذلت اور خواری سے بھی جان چھڑانا چاہتے تھے جوان پر مسلط تھی اور جس کا خاتمہ صہیون کے پہاڑ کے گرد قائم ہونے والی یروشلم کی سلطنت مل جانے سے ہوسکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ جنت گم گشتہ کے طالب تھے لیکن جہنمی حرکات کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ رفتہ رفتہ گناہوں سے شغف کے ساتھ مسیح کا انتظار اور کھوئی ہوئی بادشاہت کی واپسی کا سودا ان کے سر میں ایسے سمایا کہ وہ ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ ان کے نام نہاد علمائے سوء اور جعلی پیروں (احبار و رہبان) نے رحمٰن کو راضی کرنے کے ساتھ ساتھ شیطان کو خوش کرنے کی اس احمقانہ کوشش کو دینی رنگ دینے کے لیے اصلی ''تصور مسیح'' کو مسخ کر کے ایک جعلی اور من گھڑت تصور مسیح پیش کیا اور چونکہ اس جعلی تصور کی مقبولیت تورات اور زبور میں تحریف کیے بغیر ممکن نہ تھی لہٰذا ان مقدس کتابوں میں قطع و برید شروع کر دی گئی۔ لذت پرستی کے اس دور میں جو مشرکانہ اور فاسدانہ خیالات ایجاد کیے گئے تھے اور جنہیں شکم پرست مذہبی پیشواؤں کی محنت سے اللہ کے دین کے متوازی ایک دین کی شکل میں ڈھالا جا چکا تھا، وہ یہودیت کا جزء لازم بنا لیے گئے اس کے مقابلے میں حقیقی اور انبیائی دین، فاسد، باطل اور جعلی قرار پایا۔ اس موقع پر بنی اسرائیل کے علمائے سوء نے انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ وہ سلوک کیا جو آج کل کے دنیا پرست مولوی اور رسوم پرست عوام، علما حق کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان جھوٹے روحانی پیشواؤں نے ان حرکات سے منع کرنے پر انبیائے کرام اور منصف مزاج حق گو لوگوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا، رفتہ رفتہ ایک ایسا دین وجود میں آ گیا جو حق و باطل کا ملغوبہ اور صحیح و فاسد کا معجون مرکب تھا۔ اس میں تصور مسیح کی بنیاد ان امور پر تھی:

(۱) اللہ تعالیٰ یہودیوں کی مصیبتوں کے خاتمے اور ان کی سربلندی کے لیے مسیح بھیجے گا۔

(۲) یہ مسیح ان کے موجودہ دین کی توثیق کرے گا۔ (۳) جو اس موجودہ (فاسد، باطلانہ اور مشرکانہ) دین کی توثیق نہ کرے اور کسی اور دین (حقیقی الٰہی مذہب) کی طرف بلائے وہ جھوٹا مسیح (دجال) ہے اور قابل گردن زدنی ہے۔

چنانچہ اس خود ساختہ تصور مسیح کے تحت اصل مسیح معاذ اللہ جھوٹے اور یہودیت کے دشمن، اور ان کا خاتمہ یہودیت کی خدمت قرار پایا۔ سچے مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے تک یہودی علما اور ربیّین نے اس باطل تصور کو یہود میں اس قدر راسخ کر دیا تھا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو جناب مسیح علیہ السلام کی آمد سے قبل ان کی دعوت کے لیے میدان ہموار کرنے کی خاطر خصوصی محنت کرنی پڑی۔ ''اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْییٰ مُصَدِّقًا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ'' مگر اس کے باوجود یہود وہ جرم کر کے رہے جس نے انہیں اس آخری امتحان میں بری طرح ناکام کر دیا اور جس کے بعد یہود کا رشتہ اللہ تعالیٰ، انبیاء اور آسمانی کتابوں سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو کر رہ گیا۔ یعنی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی تکذیب اور آخر کار ان کو صلیب دیے جانے کی کوشش۔ اب وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ہولناک جرم کے بعد اللہ تعالیٰ، اس کے مقرب فرشتوں اور نیک وسعید بندوں کے ہاں آسمانوں اور زمینوں میں ان کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ خدا کے نہیں رہے نہ خدا ان کا رہا، وہ پورے کے پورے صرف اور صرف ابلیس کے ہیں اور ابلیس پر نازل ہونے والی لعنت و پھٹکار ان کے لیے ہے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب ان کے لیے کوئی مسیح آئے گا نہ وہ سچے مسیح جیسے کسی نجات دہندہ کے قابل ہیں۔ اب جو مسیح آئے گا وہ ان کے لیے سراپا قہر وغضب ہوگا اور اس کے مقابلے کے لیے چونکہ عرش سے فرش تک یہود کے لیے کوئی مددگار نہیں اس لیے انہوں نے شیطان کو، اس کی مخفی قوتوں کو اور اس کے سب سے بڑے نمایندے دجّال کو اپنے لیے آخری امید بنالیا ہے۔ ان کے خیال میں ان کی تمام امیدوں کا مرکز، یروشلم کی سلطنت اور صہیون کے مقدس پہاڑ کی طرف واپسی کا ذریعہ صرف اور صرف دجّالِ اکبر ہے۔ اس کی حکومت ''یہودیت'' کی حکومت ہوگی، اس کی بادشاہت اسرائیل کی ''حقیقی نجات'' کا دن ہے۔ مسیح دجّال کا خروج کب ہوگا؟ اس کے ظاہر ہونے کی راہ کس طرح ہموار ہوگی؟ یہ بھی سن لیجیے! مسجد اقصیٰ کو ڈھا کر اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی سازش کے تمام پہلوؤں کا انتہائی باریک بینی سے جائزہ لینے والا اسرائیلی ماہر زیدی اراں کہتا ہے:

''زیرزمین'' [اس سے فری میسن تحریک مراد ہے، راقم] کے سربراہوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس ''کریہہ عمل'' (مسجد اقصیٰ) کو بم سے اڑا دینا دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو جہاد کے لیے کھڑا کردے گا جو بالآخر پوری انسانیت کو معرکۃ المعارک میں جھونک دے گا۔ اس معرکۃ المعارک کو انہوں نے یاجوج وماجوج کی جنگ سے تعبیر کیا ہے جس کے کائناتی روحانی اثرات مرتب ہوں گے۔ آگ کی اس مطلوب آزمائش سے اسرائیل کا فاتح برآمد ہونا زمین پر مسیح کی آمد کی راہ ہموار کرے گا۔''

حاصل یہ کہ موجودہ اسرائیل محض ایک ریاست نہیں، نہ ہی یہ صرف یہودیت وصہیونیت کی پناہ گاہ ہے بلکہ یہ یہودیت کے ترتیب دیے ہوئے عالمی طاغوتی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) اور دجالی ریاست کا پایۂ تخت ہے جو اپنے صدیوں کے خفیہ عزائم کے تحت مسجد اقصیٰ اور گنبدِ صخرہ کو گرا کر دجال کی آمد اور عظیم تر اسرائیلی ریاست کے قیام کی پہلی اینٹ رکھنے کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔

یہود کے عقائد کے مطابق جب ان کا مسیحا یعنی المسیح الدجال آئے گا تو اس کی عالمی سلطنت کا دارالحکومت یروشلم (القدس شہر) اور صدارتی مقام ہیکل سلیمانی ہوگا۔ اس وقت دنیا میں دو ہی حکومتیں ہیں جو کسی نظریے کے تحت قائم ہوئی ہیں اور جن کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر ان کا مقصد ومنشور درج ہے۔ ایک پاکستان جس کی پارلیمنٹ پر کلمۂ طیبہ تحریر ہے اور جس کا بچہ بچہ ''پاکستان کا مطلب کیا...... لا الہ الا اللہ'' کا ایمان افروز نعرہ وردِ زبان کرنا اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ دوسرے اسرائیل جس کی پارلیمان کا موٹو یہ ہے: ''اے اسرائیل تیری سلطنت کی سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔'' اور جس کا مقصد ''اسرائیل کا مطلب کیا...... دجال کی حکومت بنا'' ہے۔ دونوں حکومتیں زبردست قربانیوں اور جدوجہد کے بعد قائم ہوئی ہیں اور دونوں کا مطمحِ نظر یہ رہا ہے کہ اسلامی ریاست یا یہودی ریاست کا مثالی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر کے اپنا پیغام پورے کرۂ ارض تک پہنچائیں۔ اب غضب انگیز بات دیکھیے کہ دجال کے پیروکاروں نے تو کبھی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی ریاست کو تسلیم نہیں کیا ہے، وہ

اپنے موقف پر پوری شدت سے قائم ہیں لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو ذریعہ شفاعت ونجات ماننے والوں میں دجّالِ اکبر کی طاغوتی سلطنت کی تکمیل سے پہلے اور اس کے دارالخلافہ کے پوری طرح قائم ہونے سے بھی قبل اپنا مقصدِ تشکیل بُھلا کر طاغوت کو تسلیم کرنے کے لیے سوچ بچار اور بحث وتمحیص شروع ہو چکی ہے۔ ربّ کعبہ کی قسم! فلسطینی مسلمانوں کی یہود سے معرکہ آرائی محض زمین کا تنازع نہیں ہے بلکہ یہ حق وباطل کی وہ کشمکش ہے جس کی انتہا دجّال اور حضرت مسیح وحضرت مہدی علیہما السلام کے درمیان حق وباطل کے آخری اور فیصلہ کن معرکے پر ہوگی۔ اب اہلِ ایمان سوچ لیں کہ وہ کس گروہ میں اپنا نام لکھوانا چاہتے ہیں؟

بابل سے یروشلم تک

حرج کی تلاش:

اسرائیل کو تسلیم کرنے نہ کرنے کے دینی اور سیاسی پہلوؤں پر ملک کے مختلف حلقوں میں گفتگو جاری ہے۔ بعض مفکر اور اسکالر آیت کریمہ ''لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء'' کو زمانہ نبوت کے ساتھ خاص قرار دے رہے ہیں اور بعض نے ''اولیاء'' سے حاکم کا معنی کشید کر لیا ہے اور بعض جغادری سیاست دان جو خود کو مجاہد اول کے لقب سے خود ہی سرفراز کرتے رہے ہیں اس ''حرج'' کی تلاش میں تل ابیب سے ہو آئے ہیں جو اسرائیل کو تسلیم کرنے کی صورت میں پایا جاسکتا ہے۔ اس بحث کے اختتام پر جب تمام طبقے اپنی اپنی توانائیاں صرف کر کے نڈھال ہو چکے ہوں گے تو زیرزمین ہونے والے فیصلے کا برسرزمین اعلان کر دیا جائے گا۔ چونکہ ہم دین کا اتنا گہرا علم نہیں رکھتے کہ دینی اعتبار سے اس مسئلہ پر لب کشائی کر سکیں نہ ہی اس درجے کا سیاسی شعور ہمیں حاصل ہے کہ ایسے اہم اور بین الاقوامی مسئلے پر کسی گفتگو میں حصہ لے سکیں، اس لیے ان دونوں پہلوؤں سے کچھ کہنے کی بجائے ہم اس مسئلے کو یہودیت کے نکتۂ نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس موضوع کے ٹوٹے پھوٹے مطالعے میں ہم بہت سا خونِ جگر جلا چکے ہیں۔ توراۃ کی سورت یسعیاہ کے دوسرے رکوع میں کہا گیا ہے:

''آخری دنوں میں ایسا ہوگا کہ یہووا کی عمارت کا پہاڑ تمام پہاڑوں پر مستحکم کیا جائے گا اور تمام پہاڑیوں سے زیادہ بلند کیا جائے گا اور ہر قوم کے لوگ موج کی طرح اس کی جانب چلیں گے اور بہت سے ملکوں کے لوگ آئیں گے اور آپس میں کہیں گے: آؤ! ہم یہووا کے پہاڑ پر چڑھ

کر یعقوب کے خدا کے گھر میں جائیں۔ تب وہ ہمیں اپنا راستہ دکھلائے گا اور ہم اس کے راستے پر چلیں گے کیونکہ یہوا کا انتظام صہیون سے اور اس کا کلام یروشلم سے نکلے گا، وہ قوموں کا فیصلہ کرے گا اور قوموں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرے گا۔‘‘

مسیح ربّانی اور مسیح دجّال:

یہ پیش گوئی ایک سچی حقیقت ہے جو قیامت سے پہلے پوری ہو کر رہے گی لیکن یہودیوں کی فطرت کی طرح چونکہ ان کی عقل بھی مسخ ہو چکی ہے لہٰذا وہ اس کا غلط مطلب لے کر اسے غلط مصداق پر منطبق کرتے ہیں۔ یہ پیش گوئی دراصل اللہ کے سچے مسیح جناب عیسیٰ بن مریم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے تھی اور سچے خدا کے آخری سچے نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق کی ہے۔ کتب حدیث میں ’’اشراط الساعۃ‘‘ یعنی علاماتِ قیامت کے تحت بہت سی احادیث میں اس کی تفصیل ہے۔ آخر زمانہ میں جب زمین مسلمانوں پر تنگ ہو جائے گی، مسلمان کفر کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر جہاد کے لیے یکسو اور پر عزم ہو جائیں گے اور کسی مخلص اور باصلاحیت قائد کی طلب اور کھوج میں ہوں گے (آج کل سارے عالمِ اسلام کی کیفیت کو ذہن میں رکھیے) تو اللہ تعالیٰ سادات گھرانے کے ایک فرد کو ان کا قائد بنا کر بھیجے گا جس کی روحانی اور اصلاحی تربیت مختصر عرصے میں کر دی جائے گی۔ ان کا نام محمد بن عبداللہ اور لقب مہدی ہوگا۔ وہ مسلمان مجاہدین (خوشخبری ہو ان نیک بختوں کے لیے جو دین اور جہاد پر استقامت کے ساتھ جمے رہیں گے) کی قیادت فرما رہے ہوں گے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام دمشق کے مشرق میں سفید مینار کے قریب نازل ہوں گے۔ وہ حضرت مہدی کی اقتدا میں نماز پڑھیں گے تاکہ عیسائیوں کو بھی پتہ چل جائے کہ وہ شریعت محمدیہ کے پیروکار کے طور پر آئے ہیں پھر آپ مسلمان مجاہدین کے ساتھ مل کر دجّال سے جہاد کے لیے دمشق سے تل ابیب روانہ ہوں گے جہاں ’’لُد‘‘ نامی مقام پر (یہاں آج کل تل ابیب کا بین الاقوامی ایئرپورٹ ہے) اسے قتل کر دیں گے۔ اس کے بعد طاغوت کی عالمی ریاست کے مرکز اسرائیل میں دنیا بھر سے جمع ہو جانے والے یہودیوں کو ان کی سازشوں کی اجتماعی سزا ملے گی۔ اگر کوئی یہودی کسی پتھر یا درخت کے پیچھے چھپے گا

(میدان سے بھاگ کر چھپنا ان کم بختوں کی پرانی عادت ہے) تو وہ درخت یا پتھر بھی مسلمان مجاہد کو آواز دے گا: اے اللہ کے ولی! اللہ کا دشمن میرے پیچھے چھپا ہے، آ کر اس کا کام تمام کر دے، سوائے غرقد کے درخت کے کہ وہ یہودیوں کا درخت ہے۔ اسرائیل کی حکومت نے چند سال پہلے کثیر تعداد میں غرقد کے درخت کی شجر کاری کی ہے۔ راقم کو عرصہ تک یہ تلاش رہی کہ یہ کون سا درخت ہے؟ اس کی شکل کیا ہے؟ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس میں کامیابی عطا فرمائی۔ آپ متعلقہ تصویر کو دیکھیے فی الواقع اس درخت کے پتے اور پھل ایسے کریہہ المنظر ہیں کہ اللہ کے نافرمان اور شیطان کے پجاری یہودیوں کے حصے میں ایسا ہی درخت آنا چاہیے۔ فلسطین کی سرزمین میں زیتون جیسا مبارک درخت بکثرت اُگتا ہے لیکن یہودیوں کی آخری پناہ گاہ جو درخت قرار پایا ہے اس کے پھل کو عوام ''خایۂ ابلیس'' کہتے ہیں۔ اہلِ علم فارسی لغات میں ''خایہ'' کے معنی دیکھ سکتے ہیں اور وہاں نہ دیکھ پائیں تو تصویر کو دیکھ کر اس لفظ کے معنی کا اندازہ لگانا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں۔

خرابے کی جڑ:

بات اسرائیل کے تسلیم ہونے سے شروع ہوئی تھی اور اس کے ہولناک انجام تک آ پہنچی۔ بعض قارئین کو یہ طوالت موضوع سے انحراف معلوم ہوگی لیکن اس انحراف میں اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے کہ ہمیں دنیا میں خرابے کی جڑ اسرائیل کو تسلیم کرنا چاہیے یا نہیں؟ کسی کو اب بھی یہ جواب سمجھ میں نہ آئے تو اس سے کوئی شکوہ نہ ہونا چاہیے کہ یہود کے مکر و فریب کے جالے ہمارے علم و دانش کے علمبرداروں کے ذہنوں پر بھی تنے ہوئے ہیں، لہٰذا اس پر کسی جذباتی تبصرے کی بجائے ہم خیر خواہانہ طور پر بات کو دوبارہ وہیں سے شروع کریں گے جہاں سے چھوٹی تھی۔ توراۃ کی درج بالا پیش گوئی سچے مسیح جناب عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے لیے تھی، لیکن یہودی ان کی دنیا میں آمد سے پہلے اللہ ربّ العزت کی جانب سے بھیجے گئے مسیح صادق کی بجائے روئے زمین پر ابلیسی قوتوں کے سب سے بڑے نمایندے مسیح الدجال سے اپنی امیدیں وابستہ کر بیٹھے تھے اور وہ ایسے کسی مسیح کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جو ان کے خود ساختہ مذہبی روایات اور من گھڑت یہودیت کے خلاف کسی چیز کی دعوت دیتا ہو۔ وہ صرف

ایسے مسیح کو ماننے پر آمادہ ہیں جو ہر قیمت پر ان کی بادشاہت ان کو واپس دلائے، دنیا میں ان کا کھویا ہوا مقام ان کو لوٹا دے اور اس سب کے ساتھ ان کی موجودہ بداعمالیوں اور بدکرداریوں کی اصلاح کی بجائے انہیں اسی حالت میں ''تسلیم'' کر کے ان کی عالمی حکومت کی توثیق اور تائید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسا صرف وہی کر سکتا ہے جو اس روئے زمین پر برپا ہونے والے فتنوں میں سے سب سے بڑا اور گندا فتنہ ہوگا اور جس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے حضور خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کو دعا سکھائی ہے، تدابیر بتائی ہیں اور جسے ''کانے دجّال'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہودی ساختہ فرقہ:

توراۃ میں تحریف کر لینے کے بعد یہود کے نام نہاد عالموں اور جھوٹے پیروں کے پاس اپنے عوام کی دل بستگی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا تھا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں کی گئی توراۃ کی پیش گوئیوں کو مسیح دجّال پر منطبق کریں اور اللہ اور اس کے فرشتوں کی مدد سے یروشلم اور اس میں موجود صہیون کے مقدس پہاڑ کو دوبارہ حاصل کرنے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعے قائم ہونے والے نظام عدل میں ان کے مددگار بننے کی بجائے مسیح دجّال کی شیطانی حکومت کے پایۂ تخت کے لیے یروشلم کو مفسدانہ کارروائیوں کے ذریعے حاصل کریں، اس کے مقام صدارت کے لیے ہیکل سلیمانی کو تعمیر کریں اور اس مجسم فساد کی آمد سے قبل اس کے لیے فضا ہموار کریں۔ یہاں پہنچ کر ہمیں ان تین فرقوں میں سے دوسرے کا ذکر کر دینا چاہیے جو واضح طور پر بلکہ ناقابلِ تردید شواہد کی روشنی میں یہودیوں کے ساختہ پرداختہ اور ان کے آلۂ کار ہیں۔ یہودیوں نے اپنی دانست میں سیدنا عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو سولی دے دی تھی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ صحیح سالم بحفاظت آسمانوں پر اٹھا لیے گئے تھے اور قیامت کے قریب دوبارہ تشریف لا کر یہود کو ان کی گستاخیوں اور بدسلوکیوں کی سزا دیں گے۔ اس وقت ان پر ایمان نہ لانے والے تمام یہودی ان کے ہاتھوں مارے جائیں گے، تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں گے اور مجاہد مسلمان ان کے جھنڈے تلے جمع ہو کر دجّال اور اس کے یہودی لشکر سے جہاد کریں گے۔ یہود کو چونکہ یہ پیش گوئی

بہت زیادہ چبھتی ہے لہٰذا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسمانوں پر موجودگی اور دوبارہ زمین پر آمد کا سختی سے انکار کرتے ہیں، مسلمانوں میں جذبۂ جہاد کے فروغ سے بہت زیادہ گھبراتے ہیں اور اپنے آلہ کاروں کے ذریعے مسلمانوں میں بھی اس نظریے کو فروغ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ نہیں اور جہاد دہشت گردی ہے۔ اس خدا کی قسم جس نے اپنے بندے مسیح علیہ السلام کو عزت کے ساتھ آسمانوں پر مہمان بنا رکھا ہے، جو شخص یا فرقہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرے یا کسی اور کو مسیح موعود مانے یا نظریۂ جہاد کی مخالفت کرے وہ قادیانی ہو یا کوئی اور، اس کی ڈور فری میسن تحریک کے ان ابلیسی دماغوں کے ہاتھ میں ہے جو اپنے آخری انجام سے ڈرتے ہیں لیکن اپنی شیطانی حرکتوں سے ساری دنیا کے نظام خصوصاً اُمت مسلمہ کے عقائد و اعمال میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں اور خدا اور اس کی رحمت سے مایوسی کے سبب شیطان کی جماعت میں داخل ہو چکے ہیں۔

عبوری ریاست اور باضابطہ حکومت:

بات چل پڑتی ہے تو کہیں سے کہیں نکل جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد یہود نے انہیں سولی دینے کا جشن صحیح طرح منایا نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رومی بادشاہ ٹائٹس کو مسلط کر دیا۔ اس نے ہیکل سلیمانی کو ڈھا دیا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور ان کو بیت المقدس سے نکال کر در بدر کر دیا۔ یہ واقعہ سن ۷۰ بعد رفعِ مسیح کا ہے۔ اس وقت سے ۱۹۴۸ء میں قیام اسرائیل تک ۱۹۰۰ سال سے کچھ اوپر گزرے ہیں یعنی تقریباً دو ہزار برس۔ ان انیس یا بیس صدیوں میں یہود دنیا بھر میں ذلت وخواری کا نمونہ بن کر رہے اور اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ توبہ کیے بغیر انہیں دوبارہ پہلی سی فضیلت اور باعزت زندگی مل جائے۔ آخر کار ۱۷۰۰ سال کے بعد ایک کٹر فری میسن جارج واشنگٹن کے ہاتھوں روئے زمین پر ان کی پہلی عبوری ریاست بحر اٹلانٹک کے اس پار قائم ہو گئی جسے دنیا ریاست ہائے متحدہ امریکا کے نام سے جانتی ہے لیکن یہودی اسے ''نیا بابل'' کہتے ہیں۔ یہ حکومت قیام اسرائیل اور دجّال کی باضابطہ حکومت سے قبل ایک عبوری یہودی ریاست کے طور پر قائم کی گئی تھی جس کا

مقصدِ وجود ارضِ فلسطین سے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ، فلسطین پر قبضہ، مسجدِ اقصیٰ کا انہدام اور گنبدِ صخرہ کو ڈھا کر اس کے نیچے موجود مقدس چٹان پر ہیکل سلیمانی کی تعمیر اور پھر عظیم تر اسرائیل کا قیام ہے۔ چونکہ اُمّتِ مسلمہ کے علاوہ کوئی طاقت یہود کی راہ میں حائل نہیں اور چونکہ اس دور میں عالمِ اسلام میں سب سے زیادہ بیدار مغز، ذہین اور باصلاحیت مسلمان برصغیر میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ کے مبارک جذبات سے صرف پاکستان کے مسلمان عملاً آشنا ہیں، اس لیے کوئی اور ملک اسرائیل کو تسلیم کرے یا نہ کرے، امریکا کو مسلمانانِ عالم کے دل و دماغ اور واحد ایٹمی طاقت ہونے کے ناتے اس کے دست و بازو ہونے کی حیثیت رکھنے والے پاکستانی مسلمانوں سے اس دجّالی مملکت کو تسلیم کروانے کی ضرورت ہے جس کے عوام شرار الناس ہیں اور جس کا ہونے والا لیڈر شرار خلق اللہ ہوگا۔ مسجدِ اقصیٰ کے سوگوار مینار اور ستم رسیدہ دیواریں اپنے پاکستانی بیٹوں سے پوچھتی ہیں: کیا میری حرمت اور عزت بابری مسجد سے کم ہے کہ تم مجھ پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کی سیاسی اور سفارتی حیثیت تسلیم کر کے ان لوگوں کو اپنے ہاں باعزت حیثیت دو گے جو اللہ اور اس کے مقدس پیغمبروں کی نظر میں مردود اور دھتکارے ہوئے ہیں؟ کیا ایسا کرنے کے بعد خدا سے تمہارے ''عہد'' کا کچھ حصہ باقی رہ جائے گا؟ کیا شیطان کے پیروکاروں کے راستے سے رکاوٹ ختم کرنے کے بعد رحمٰن سے تمہارا اتنا تعلق رہ جائے گا کہ تم مشکل وقت میں اس کی مدد طلب کر سکو؟ کیا تم اس ظلم کے انتقام کو بھول جاؤ گے جو یہود نے بابل جلاوطنی سے یروشلم واپسی تک میرے محافظ بیٹوں پر کیا؟ مسجدِ اقصیٰ یہ سب کچھ پکارتے ہوئے روتی ہے لیکن افسوس کہ اس کا جواب دینے والی قوم ابھی تک سوتی ہے۔

دو ڈاکٹروں کی کہانی

قومیں افراد سے مل کر بنتی ہیں اور افراد اگر چاہیں تو اپنی جدوجہد اور عزم سے ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ اس کلیے کی ایک بھرپور مثال ڈاکٹر تھیوڈور ہرٹزل اور ڈاکٹر ویزمین (WAIZ MANN) ہیں۔ ہرٹزل ایک یہودی اخبار نویس اور ویزمین ایک یہودی سائنس دان تھا۔ ڈاکٹر تھیوڈور ہرٹزل کو تحریک صہیونیت کا بانی اور ڈاکٹر ویزمین کو اس کا فکری رہنما کہا جاتا ہے اور کوئی شک نہیں کہ ان دونوں ڈاکٹروں نے صہیونیت کے لیے وہ کارنامے انجام دیے جن میں اسلامی تحریکوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کے لیے کئی کارآمد سبق پوشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر ہرٹزل مشرقی یورپ کا باشندہ تھا اور انیسویں کے آخر میں مشرقی یورپ کے یہودی خاص طور پر قومی وطن بنانے کے فکر میں تھے۔ یہ یہودی دراصل ان خانماں برباد یہود کی اولاد تھے جو اسپین سے اسلامی سلطنت کے سقوط کے بعد نکالے گئے تھے۔ اسپین میں دنیا بھر کے اسلامی سلطنتوں کی طرح غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی ہمدردانہ اور فیاضانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ اسلام نے مسلمانوں کو جو اخلاقی تعلیم دی تھی اس کا نتیجہ تھا کہ وہ فاتح اور مطلق العنان حکمران بن کر بھی ظلم کی کمینگی سے دور رہتے تھے۔

اسپین میں مسلم حکومت کا دور...... حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کے بعد...... یہود کی تاریخ کا سنہری دور کہلاتا ہے جس میں انہیں ہر طرح کی آزادی اور حقوق حاصل تھے لیکن مسلمانوں کے ہاتھ سے اسپین نکل جانے کے بعد عیسائیوں کی حکومت یہود کے لیے عذاب بن کر آئی۔ عیسائی فاتحین بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا نے ان سے تمام دولت چھین کر انہیں گھر بار سے جلاوطن کر دیا اور وہاں سے ذلت و خواری کے عالم میں روانہ ہو کر قسطنطنیہ کی اسلامی

سلطنت میں آبسے۔ یہاں کے مسلمانوں نے اپنی روایتی فراخدلی اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور انہوں نے اطمینان سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اب ان میں انسانیت اور شرافت ہوتی تو مسلمانوں کا یہ حسن سلوک کبھی نہ بھولتے لیکن یہود کے ہاں مشہور ہے کہ عام لوگ دغابازی، احسان فراموشی اور بے ایمانی اپنے بائیں ہاتھ سے جبکہ یہود یہ حرکتیں اپنے دائیں ہاتھ سے کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے یہاں آباد ہوتے ہی اپنے داہنے ہاتھ سے کام لینا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی دی ہوئی سہولتوں اور رعایتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے کاروبار کو خوب فروغ دیا، سودی قرضوں کے ذریعے امراء اور شرفاء تک رسائی حاصل کی اور انیسویں صدی کے آخر میں جب دنیا پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تو انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مذکورہ بالا دونوں ڈاکٹر اس دور کی پیداوار تھے۔

ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح یہودیوں کو متحد کر کے انہیں ''قومی ریاست'' کے تصور میں رنگ بھرنے کے لیے آمادہ کیا جائے چنانچہ ڈاکٹر ہرٹزل نے ''ریاست یہود'' کے نام سے ایک رسالہ شائع کر کے خودمختار اسرائیلی ریاست کا تصور پیش کیا جس نے دنیا بھر میں دربدر بکھرے ہوئے خوار و رسوا یہودیوں میں جوش و جذبے کی ایسی لہر دوڑا دی جیسے کہ بند گٹر کھلنے سے گندا پانی غلیظ جھاگ اڑانے لگے۔ اس شخص نے اپنی بقیہ زندگی اسی مقصد کے لیے وقف کر دی اور اس نے یہود کے سامنے یہ نظریہ پیش کیا کہ کوئی بھی یہودی جو مذہبی اعتبار سے کیسا ہی بے راہ رو اور بدعمل کیوں نہ ہو مگر اسے سیاسی طور سے یہود کی فلاح و بہبود کے لیے بہر حال کام کرنا چاہیے چنانچہ اس دن سے دنیا ''صہیونیت'' کی اصطلاح سے آگاہ ہوئی اور یہودیت، مذہبی اعمال اور ''صہیونیت'' سیاسی تحریک کا نام قرار پایا۔ تحریک صہیونیت کا ابتدائی محرک یہ ڈاکٹر اپنے رسوائے زمانہ خواب آنکھوں میں لیے ۱۹۰۴ء میں مر گیا لیکن مرنے سے پہلے اس نے دو ایسے کام کر دیے جس سے پیچھے آنے والوں کا کام آسان ہو گیا۔ موت سے قبل یہ شخص ۱۸۹۸ء میں ''یہودی بینک'' اور ۱۹۰۱ء میں ''یہودی بیت المال'' (یہودی فنڈ) قائم کرنے میں کامیاب

ہو گیا۔ بینک کا مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کی منتشر بچت فالتو پڑی رہنے کی بجائے ایک جگہ جمع ہو کر سرمایہ کاری میں لگے اور اس سرمائے سے حکومتوں، اداروں اور اہم افراد کو قرضے جاری کر کے بوقت ضرورت ان سے اپنے کام نکلوائے جائیں۔ اس بینک کا منظور شدہ سرمایہ ۳۰ لاکھ پاونڈ تھا اور ۲۴ لاکھ کی رقم اعلان ہوتے ہی فوراً جمع کر دی گئی۔ یہود کے قومی فنڈ کی غرض اسرائیلی ریاست کے لیے کی جانے والی کوششوں کے لیے درکار سرمایہ چندہ کے ذریعے فراہم کرنا تھا۔ شقاوت کی حد تک کنجوس اور بخیل کہلانے والے یہودی اس کام میں بھی پیچھے نہ رہے (افسوس! کہ مسلمانوں کی صفات یہود میں اور یہود کی صفات مسلمانوں میں آتی جا رہی ہیں) چندہ جمع کرنے والی کمیٹیاں دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں۔

ڈاکٹر ہرٹزل نے یہود کے بڑوں کو جمع کر کے یہ منشور منظور کرایا کہ دنیا کے ہر یہودی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ماہ اپنے مال کا ایک متعین حصہ اسرائیل کے لیے بطور چندہ ادا کرے۔ وہ اس چندہ کی ادائیگی میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں کر سکتا اور نہ اس میں ایک پیسہ کی کمی کر سکتا ہے۔ اس کے کر سکنے کا کام صرف یہ ہے کہ اس پر جتنا چندہ عائد ہے، اس میں رضا کارانہ طور پر اضافہ کرے۔ یہ چیز بھی اس کے بس سے باہر ہے کہ ایک ماہ جتنا چندہ وہ دے چکا ہے کسی ماہ اس میں کمی کرے۔ یہ شرح جسے دنیا کا ہر یہودی ادا کرتا ہے، اس کی ماہانہ آمدنی کا فیصدی حصہ ہوتی ہے جس کی ادائیگی اس کے لیے مشکل بھی نہیں بنتی اور نہ اس کی طاقت سے زیادہ ہوتی ہے۔ فنڈ جمع کرنے کے اس بچے تلے طریقے نے صہیونیوں کا ایک ایسا پائیدار بجٹ بنا دیا ہے جس پر بدلتے ہوئے حالات اور بحرانوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آج روئے زمین میں جگہ جگہ پھیلی یہود کی تمام ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے نفع کا مخصوص فیصدی حصہ اسرائیل کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں جب کہ مشکل سے ہزاروں میں ایک مسلمان سرمایہ کار ہو گا جس نے اپنی آمدنی کا فیصدی حصہ اسلامی تحریکوں اور اداروں کے لیے رکھ چھوڑا ہو۔ مسلمان تاجر تو اس بات کے منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی ان کے دروازے پر آ کر اپنی خودی کو ذبح کرے، اشاعت دین کے اعلیٰ مصرف کی توہین کرے تب یہ اس کو اپنے احسان سے زیر بار کریں گے۔ فیصدی حصے کے علاوہ بھی

یہودیوں نے اپنے خفیہ خزانوں کے منہ کھول دیے۔ لارڈر چرڈ جیسے متمول یہودیوں نے ''مال کماؤ یہودیت کی خاطر اسے کھپاؤ مسیحا کی خاطر'' کے فلسفے پر عمل شروع کیا۔ صرف ایک یہودی بیرن دی ہرش نے اپنی جیب سے اس زمانے میں ۹۰ لاکھ پونڈ کا عطیہ دیا اور یوں دنیا بھر سے آنے والے یہودی سرمایہ کے ذریعے سے ارضِ مقدس میں زمینوں کی خریداری اور ان میں یہودی نو آبادیوں کی تعمیر نہایت منظّم انداز میں شروع کر دی گئی حتیٰ کہ جنگ عظیم سے پہلے ارضِ فلسطین میں یہود صرف دو لاکھ ایکڑ زمین کے مالک تھے مگر ۱۹۳۶ء میں ان کے قبضہ میں ایک کروڑ ۴ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ زمین آچکی تھی۔ زمین خریدنے کے ساتھ یہودی نو آبادیاں قائم کر کے ان میں بیرونی یہودیوں کو تیزی کے ساتھ لا لا کر بسایا جانے لگا۔ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں حیفہ کے قریب پہلی نو آبادی کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۱۴ء تک اس میں صرف ۱۸۲ خاندان تھے مگر ۱۹۴۱ء میں یہ نو آبادی ایک شہر کی شکل اختیار کر گئی تھی جس میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار مالدار یہودی آباد ہو چکے تھے۔ یہ نو آبادی ''تل ابیب'' تھی جو آج کل اسرائیل کا دارالحکومت ہے۔ اس لفظ کا لوگ صحیح تلفظ نہیں کرتے اور معنی تو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ عربی زبان کے اس لفظ کا صحیح تلفظ ''تَلُ اَبِیْب'' ہے اور اس کا معنی ہے: ''بہار کی پہاڑی''۔ تَلُ کے معنی چھوٹی پہاڑی اور اَبِیْب قبطی سال کا گیارہواں مہینہ ہے جو بہار میں آتا ہے۔

ڈاکٹر ہرٹزل جب مرا تو اگر چہ اس کا کام ادھورا تھا لیکن اس نے اتنی بنیاد فراہم کر دی تھی جس پر چل کر یہود اسرائیلی ریاست قائم کر سکتے تھے چنانچہ ڈاکٹر ویزمین نے اس کے مشن کو وہیں سے آگے بڑھایا جہاں سے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ ڈاکٹر مانچسٹر یونیورسٹی میں کیمسٹری (فن کیمیا) کا استاد تھا۔ اس کو دو تین ایسے مواقع مل گئے جن سے فائدہ اٹھا کر یہ اپنی شیطانی منصوبے میں کامیاب ہوتا گیا۔ پہلا واقعہ یہ ہوا کہ جنگ عظیم کے موقع پر برطانیہ کے پاس بھک سے اڑ جانے والے مادے کا فقدان تھا۔ اس مادے کا ایک جز (ACETONE) اس وقت صرف جرمنی کے پاس تھا اور جرمنی کی یہ برتری برطانوی افواج کے لیے نہایت ضرر رساں تھی۔ اس کا توڑ بے حد ضروری تھا۔ ڈاکٹر ویزمین نے اس

کٹھن وقت میں اپنے شاگردوں کی ٹیم کے ساتھ دن رات جان توڑ کام کیا اور مصنوعی طور پر یہ جز تیار کر کے برطانیہ کی پریشانی کو بڑی حد تک دور کر دیا۔ برطانوی حکومت نے اس کا معاوضہ ادا کرنا چاہا تو اس یہودی سائنسدان نے ''حب الوطنی'' کا ثبوت دیتے ہوئے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔ انگریز یوں تو عقلمند تھے مگر یہ نہ سمجھے کہ وہ ''حب الوطنی'' کے لفظ میں کون سا وطن مراد ہے؟ دوسرا موقع جس نے مذکورہ ڈاکٹر کا کام آسان کر دیا، یہ ہوا کہ مانچسٹر یونیورسٹی اتفاق سے مشہور برطانوی مدبر آرتھر جیمس بالفور کے حلقہ انتخاب میں آتی تھی۔ ڈاکٹر مذکور نے بالفور سے ہر ممکن تعاون کیا اور اس پر کیے گئے احسان کے بدلہ میں کچھ لینے کی بجائے اس موقع کو بھی محفوظ رکھا۔ وہ اپنی ان خدمات کو مناسب موقع پر کیش کروانا چاہتا تھا۔ انہیں دنوں ایک تیسری بات یہ ہوئی کہ یہودی برطانیہ کے وزیر نوآبادیات کے طور پر مسٹر ایڈون مانیٹگ کو منتخب کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ شخص یہودی النسل تھا اور اس نے ڈاکٹر ویزمین اور اس کے ساتھیوں کا کام آسان کر دیا کہ اب ضرورت صرف کامیاب سفارتکاری کی رہ گئی تھی جسے انہوں نے جنگ عظیم دوم کے دوران بھرپور طریقے سے استعمال کیا اور ہزاروں سال بعد یہود کو ایک وطن دلانے میں کامیاب ہو گئے۔

ہوا یوں کہ پہلی جنگ عظیم میں ابتداء یہودیوں نے جرمنی سے سودا کرنا چاہا تھا کیونکہ جرمنی میں اس وقت یہودیوں کا اتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکا میں ہے۔ انہوں نے قیصر ولیم سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنوادے گا لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر یہ اعتماد نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا، وہ یہ تھی کہ ترکی کی حکومت اس وقت جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی۔ یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کر سکے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر ویزمین آگے بڑھا اور اپنی خدمات کا حوالہ دینے کے ساتھ اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی ساری قوت و قابلیت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آسکتی ہے، اگر آپ ہم کو یہ یقین دلا دیں کہ آپ فتحیاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دیں گے۔ برطانیہ کو جنگ

کے اخراجات کے لیے خطیر رقم درکار تھی اور یہاں یہودی اس کو بغیر گنے امداد کی پیشکش کر رہے تھے۔ آخر کار ڈاکٹر مذکور نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کر لیا جو ''اعلان بالفور'' کے نام سے مشہور ہے، اس میں برطانیہ کی طرف سے جنگ کے اختتام پر یہودیوں کے لیے فلسطین میں ایک مملکت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی ایک خودمختار ریاست بنائیں گے۔ اور اس غرض کے لیے انہوں نے شریف حسین کو تحریری وعدہ دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین، عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرا دیا تھا، دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریز قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ کی پیشانی سے کلنک کے اس ٹیکے کو نہیں مٹا سکے گی۔ ڈاکٹر ویزمین کو اس کی خدمات کے صلے میں اسرائیلی ریاست کی پہلی کونسل کا صدرِ اعلیٰ منتخب کیا گیا اور یہودی آج تک اسے اپنا محسن سمجھتے ہیں۔ ان دونوں ڈاکٹروں کی کہانی موجودہ حالات کو سمجھنے میں کافی مدد دیتی ہے۔

آج کل امریکا آزادی عراق کے مہم سے فارغ ہوتے ہی ''مشرق وسطیٰ کے روڈ میپ'' کی تشکیل میں جت گیا ہے۔ اور ''تاحیات مجاہد'' یاسر عرفات کا نائب تلاش کر کے فلسطینی مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دنیا کے سادہ لوح مسلمانوں کی اکثریت اس گورکھ دھندے کی حقیقت نہیں سمجھ رہی اور نہ کوئی حجرہ نشین مولوی، دانشورانِ وقت کو یہ پیچیدہ حقیقت سمجھا سکتا ہے، البتہ چند باتیں ایسی ہیں جن پر اصحاب فکر غور کریں تو وہ اصل منصوبے کے خدّ و خال سمجھ سکتے ہیں۔

(۱) ''اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں: ''اے اسرائیل! تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔'' اس طرح اسرائیل دنیا کا واحد ملک ہے جو دوسرے پر قبضے کا علی الاعلان ارادہ اور عزم رکھتا ہے لیکن شور اس بات کا مچاتا ہے کہ اسے پڑوسی ممالک سے خطرہ ہے۔

(۲) ۶ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے بیت المقدس کے قدیم حصے پر قبضہ کیا تو اسرائیل کا صدر ریاست، وزیر اعظم اور دوسرے وزراء جن کے پیش پیش اسرائیل کا سب سے بڑا یہودی مذہبی پیشوا تھا، جلد از جلد دیوارِ براق (دیوارِ گریہ) پہنچے اور اعلان کیا ''اب یثرب...... مدینہ منورہ مراد ہے...... جانے کا راستہ کھل گیا ہے۔''

(۳) پہلا اسرئیلی وزیر اعظم کھلم کھلا کہتا تھا: ''یروشلم کے بغیر اسرائیل کا کوئی مطلب نہیں اور ہیکل کے بغیر یروشلم کا کوئی مطلب نہیں۔''

ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ دنیا عنقریب ''مشرق وسطیٰ کے روڈ میپ'' کے عقب میں سے خونریز معرکوں کو ابھرتا دیکھے گی۔ برطانیہ کے رہنے والے ۲۱ سالہ مسلم نوجوان آصف محمد حنیف نے...... یہ پہلا غیر فلسطینی نوجوان ہے جس نے تل ابیب کے ایک شراب خانے میں فدائی بمبار حملہ کر کے وفا و ایثار کی تاریخ میں تابناک باب کا اضافہ کیا ہے...... یہود اور ان کے سرپرستوں کی صفوں میں کھلبلی مچادی ہے اور مسلمان نوجوانوں کو اپنے لہو سے پیغام دے دیا ہے کہ یہود جو کچھ بھی کر لیں، فدائی حملے ان کے تمام تر عیاری و مکاری کو روند ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔ اے نوجوانانِ مسلم! یہ دنیا تو آہستہ آہستہ کر کے ہم سے چھینی جا رہی ہے۔ کیا اس چھینی ہوئی چیز کے پیچھے پڑ کر آخرت سے بھی محروم رہو گے؟؟؟ آصف محمد کے جسم کے خوبصورت چیتھڑے مسلمان نوجوانوں کو اقصیٰ کے حوالے سے ان کا فرض اور مشن یاد دلا رہے ہیں۔ کاش! غیر فلسطینی نوجوان اس کام کی تکمیل کے لیے تیار ہو جائیں جس کا آغاز اس خوش نصیب نوجوان نے اپنے لہو کے چھینٹوں سے کیا ہے۔

اگلے سال یروشلم میں......!

چار سال بعد:

لحمیاہ ہودی موجودہ بنی اسرائیل کا ممتاز حبر (عالم اور مذہبی رہنما) ہے۔ اس وقت یہودی قوم میں اس کے جاری کردہ فتویٰ کو اہم ترین حیثیت حاصل ہوتی ہے اور یہود کے مذہبی معاملات میں اس کی رائے کو بہت وزن دیا جاتا ہے۔ لحمیاہ نے یہود کی ایک اعلیٰ اختیاراتی مجلس کی طرف سے یہودی فوجیوں کو تازہ ترین ہدایت ایک دعاء کی شکل میں جاری کی ہے۔ یہ دعاء ہزاروں سال بعد یہود کی مذہبی کتب سے جھاڑ پونچھ کر کے برآمد کی گئی ہے اور اسے عراق میں مصروف کار یہودی فوجیوں کے لیے جو امریکا و برطانیہ کی فوج میں شامل ہیں، ترجمہ، تشریح اور آداب کے ساتھ ارسال کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق "یہودی سرزمین" کو دشمن سے آزاد کرانے سے ہے۔ یہودی فوجیوں کے لیے جاری کردہ اس خصوصی پیغام میں انہیں کہا گیا ہے کہ وہ ساری یہودی اُمّت کی طرف سے نمائندہ بن کر اس خصوصی عبادت کا اہتمام کریں جس کا موقع انہیں چار ہزار سال بعد ملا ہے۔ یہ عبادت دریائے فرات کے مغربی کنارے میں کوئی بھی خیمہ نصب کرتے وقت یا موقع مل جائے تو عمارت تعمیر کرتے وقت ادا کی جائے گی۔ پیغام کے آخر میں تاکید کی گئی ہے کہ دریائے فرات کی مغربی سرزمین کا ہر حصہ عظیم اسرائیل کا "اٹوٹ انگ" ہے، لہٰذا اس بے مثال تاریخی موقع پر جو خداوند نے عراق پر امریکی قبضے کی شکل میں قومِ یہود کو ہزاروں سال کے بعد عطا کیا ہے، جاری کردہ یہ دعاء پڑھنا ضروری ہے تاکہ اس کی برکت سے عظیم اسرائیل کے بقیہ حصے بھی جلد جنٹائل (جانور: یہود کی مخصوص اصطلاح جو وہ غیر یہود تمام

انسانوں کے لیے استعمال کرتے ہیں) کے قبضے سے آزاد ہوسکیں۔

خیبر سے تبوک تک:

یہ خبر عرب ممالک کے ممتاز اخبارات میں شائع ہوئی ہے اور یہود کی اس جدوجہد کی کامیابی کی خبر دیتی ہے جو وہ ''اگلے سال یروشلم میں'' (Next Year in JERUSALAM) کے نام سے کرتے چلے آئے تھے۔ انہوں نے یہود قوم میں ''ارضِ موعود کو واپسی'' (Back To The Promissed Land) کی تحریک اس مجنونانہ جوش و خروش اور زبردست پروپیگنڈے سے چلائی کہ انہیں دیوانہ کرڈالا۔ آج کل اسی طرح کی ایک تحریک بیت المقدس میں چل رہی ہے لیکن اس کا ذکر آگے چل کر...... پہلے ایک اور وحشت ناک خبر جو سعودی عرب سے تعلق رکھتی ہے اور سعودی عرب سے چونکہ تمام عالمِ اسلام کا تعلق ہے اس لیے یہ سوا ارب مسلمانوں کے ایمان، عقیدے اور غیرت سے تعلق رکھتی ہے لیکن افسوس کہ اس پر کوئی ردعمل تاحال سامنے نہیں آیا۔ آپ یہ خبر سننے سے پہلے اس کا پس منظر سمجھ لیجیے تاکہ معاملے کی سنگینی کا کماحقہٗ ادراک ممکن ہو سکے۔ شاہ فہد کی عاجزانہ اور ملتجیانہ درخواست پر جب سعودی عرب میں امریکی افواج بھیجی جانے لگیں تو امریکیوں نے ان سے ایک شرط منوائی۔ امریکیوں کا کہنا تھا: ''ہمارے ہاں جب کوئی سعودی یا غیر ملکی باشندہ پانچ سال رہتا ہے تو ہم اسے اپنے ملک کی شہریت دے دیتے ہیں۔ اگر ہمارے فوجی سعودی عرب میں پانچ سال گزاریں گے تو آپ کو انہیں بھی شہریت دینا ہوگی۔'' جلالۃ الملک اور ان کے باہمت مشیران گرامی کی طرف سے یہ شرط قبول کر لی گئی۔ آج ان ہزاروں فوجیوں کو (کوشش کے باوجود ان کی صحیح تعداد معلوم نہ ہوسکی۔ امریکا و برطانیہ کی طرف سے اس امر کو نہایت خفیہ رکھا جارہا ہے اور جو تعداد ظاہر کی جارہی ہے، اگر اسے امریکی اڈوں پر تقسیم کیا جائے تو عقل نہیں مانتی کہ یہ درست ہوسکتی ہے) سعودی عرب آئے ہوئے ۱۲ سال اور شہریت کا استحقاق حاصل کیے ۷ سال ہوچکے ہیں۔ شہریت کے حصول کے بعد کسی ملک میں قدم جمانے کا دوسرا مسئلہ ملکیت کے حصول کا ہوتا ہے۔ یہودیت کی پوری کوشش ہے کہ خیبر سے لے کر تبوک تک جتنا آباد یا غیر آباد علاقہ ہے اس میں زیادہ سے زیادہ زمینیں حاصل کی جائیں۔ اس خبر کو بندہ بھی کسی صحافی کا پھیلایا ہوا سسپنس سمجھ کر نظر انداز کر دیتا اگر وہ فون نہ موصول ہوا ہوتا جس میں بات کرنے

والے کے لفظ لفظ سے ایمانی درد کا اظہار ہو رہا تھا۔

جتنی اور جس قیمت پر:

بندہ کو ایک دن بتایا گیا کہ کوئی صاحب سعودی عرب سے آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں اور مقصد و غرض بتانے سے انکاری ہیں۔ سعودی عرب کا نام سن کر بندہ نے اپنا اصول توڑتے ہوئے فون کا چونگا تھام لیا۔ ادھر سے السلام علیکم کے بعد پوچھا گیا: ''آپ وہی مولوی صاحب ہیں جو عرب ممالک میں غیر مسلم افواج پر لاحق خطرات کے مطابق لکھتے رہتے ہیں؟''

''آپ فرمایئے!'' ادھر سے گول مول جواب دیا گیا۔

''نہیں! آپ بتایئے، کیا آپ وہی ہیں؟''

''عجیب بات ہے۔ آپ نے اپنا تعارف تو کروایا نہیں اور بندہ کی شناخت پر اصرار کررہے ہیں۔''

''دیکھیے! میں ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں اور چونکہ بار بار فون نہیں کرسکتا لہٰذا کسی طرح میری ان سے بات کروا دیجیے۔''

''آپ یقین رکھیے! آپ کی بات ان تک پہنچ جائے گی۔''

''میں یہاں ایک امریکی کمپنی ...... میں اعلیٰ عہدے پر کام کرتا ہوں۔ میں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ کمپنی کے یہودی افسران بلا وجہ ہی گرد و پیش میں دور دور تک زمینیں خرید رہے ہیں۔ اس غرض کے لیے انہیں پیسے اور زمین کی نوعیت کی کوئی پروا نہیں۔ بس جتنی قیمت میں جیسی بھی زمین ملے، لیتے چلے جارہے ہیں۔ یہ بات بڑی عجیب و غریب ہے۔ آپ اس کے مضمرات پر غور کیجیے اور میرا نام پتہ ظاہر نہ کرنے پر معذرت قبول کیجیے۔''

''اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہوجائے۔ فی امان اللہ۔ السلام علیکم۔''

شہریت اور ملکیت:

حیرت کی بات ہے کہ ایک غیر ملکی انجینئر کو احساس ہے کہ کچھ گڑبڑ ہورہی ہے لیکن مقامی رہنمایانِ قوم اس بارے میں رسمی تشویش کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ نہ کوئی حکمرانوں کو توجہ دلاتا

ہے کہ آپ فلسطین والی غلطی کیوں دہرا رہے ہیں؟ وہاں کے عوام نے علمائے کرام کے منع کرنے کے باوجود یہودی این جی اوز کو زمینوں کے بڑے بڑے قطعے فروخت کیے اور یہودیوں کو ملکیت کے ذریعے شہریت کا حصول آسان ہوگیا۔ سعودی عرب میں پہلے شہریت اور اب ملکیت حاصل کی جارہی ہے لیکن وہاں کے علما کی اکثریت چونکہ ''ماڈرن مدارس'' کی فارغ شدہ ہے لہٰذا ان میں کوئی اللہ کا شیر ڈھونڈے سے نہیں ملتا جو حق گوئی کا فریضہ اللہ والوں کی سنت کے مطابق ادا کرسکے۔ ہمارے ہاں سے جو عمائدین سعودی عرب جاتے ہیں انہیں وہاں کے فرمانرواؤں سے چند ایک باتیں کھل کر کرنی چاہییں۔ ایک تو یہی کہ آپ ہمارے ہاں اختلافی مسائل پر مشتمل تفاسیر تقسیم کرنے اور اپنے منظورِ نظر افراد کو موزائیک کے فرش والی مسجدیں بنا کر دینے کی بجائے کچھ فکر اِن بن بلائے مہمانوں کی بھی کیجیے جو میزبان کی پلیٹ میں سوراخ ہی نہیں کررہے بلکہ سارا دسترخوان ہی گندا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ آپ ہمارے ہاں فروعی مسائل اور ضمنی اختلافات کی اتنی زور و شور سے تبلیغ بند کردیجیے اور اُمّت مسلمہ کی طرف سے ارضِ حرمین کے تحفظ کا جو فریضہ آپ پر عائد ہے اس کی ادائیگی کی فکر کیجیے ورنہ یاد رکھیے! کہ آپ یاسر عرفات سے زیادہ تابعدار اور شاہِ ایران سے زیادہ وفادار نہیں۔ کہیں وہ دن نہ آجائے کہ آپ خوشامدیوں میں چندے تقسیم کرتے رہیں اور خاکم بدہن یہودی فوجی خیبر کے متروکہ قلعوں میں مخصوص دعائیں پڑھنے کے لیے ان کی تزئین و آرائش شروع کردیں۔

کچھ احباب کو یہ باتیں نامناسب لگیں گی۔ شاید وہ یہ کہیں کہ کچھ بھی ہو سعودیہ کے حکمرانوں کے بارے میں احترام کا رویہ رکھنا چاہیے، لیکن یہ بات سمجھی جانی چاہیے کہ سعودی حکمرانوں سے مسلمانوں کی کسی درجے میں بھی جو عقیدت یا محبت ہے وہ ارضِ حرمین کی وجہ سے ہے اور اگر وہ اس کا تحفظ واکرام نہیں کریں گے تو خود اپنی قدر گنوا دیں گے اور پھر جہاں بات پوری ملت کے اجتماعی اور اہم مرکزی مسئلے کی ہو، وہاں افراد کی قدروں کو گنا نہیں جاتا۔ افراد تو وہی قدر پاتے ہیں جو کسی بلند مقصد پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے پُرعزم ہوتے ہیں۔ خیر ہم اس بات کو زیادہ نہیں بڑھاتے۔ یہ چند باتیں تو ہمارے محترم اکابر حضرات کے سامنے عاجزانہ درخواست

ہیں۔ وہ مناسب سمجھیں تو غور فرمائیں کہ عربستان میں ان کی پہنچ جہاں تک ہے وہاں یہ باتیں کہنی مناسب ہیں یا نہیں؟

ماشِ......ماشِ:

اب ہم القدس میں آباد یہودیوں کی اس دیوانگی کا ذکر کر کے اس مجلس کو ختم کرتے ہیں جس کا تذکرہ آغاز میں ہوا تھا۔ اس وقت پورے اسرائیل خصوصاً القدس میں صورت حال یہ ہے کہ پوری اسرائیلی قوم مسجدِ اقصیٰ کے انہدام اور وہاں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے جنون میں پاگل ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح مزارات کے عرس کے لیے چندہ کرنے والے بینڈو بہروپیئے رنگین جھنڈا اٹھا کر اور سبز چادر پھیلا کر ڈھولک کی تھاپ پر چندہ مانگنے نکلتے ہیں اور رقص و نعروں سے عوام کے جذبات بھڑکا کر ان کی جیبوں میں نقب لگاتے ہیں اسی طرح آج کل اسرائیل کی سڑکوں پر ربیّوں کی مستانہ ٹولیاں گھومتی ہیں۔ ان کا ایک پسندیدہ نعرہ جوان کے دماغی خلفشار کی نشاندہی کرتا ہے یہ ہے: ''ماشِ...... ماشِ'' یعنی ہم اسی وقت مسیح کو چاہتے ہیں۔ ابھی، اسی لمحے اور اسی وقت...... اسرائیلیوں کی گندی کھوپڑی میں یہ غلیظ بخارات کیوں چڑھ گئے ہیں؟ اس کی وجہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ دراصل ان کو بہت پہلے سے اس کی امید تھی۔ ایک دعوتی کارڈ جو کتابوں کے ایک پرانے ذخیرے سے ہاتھ لگا ہے اس میں آج سے نصف صدی قبل مسیحا کے استقبال کی بات کی گئی ہے لیکن آج اسرائیل کے قیام کو ۵۵ برس گزر جانے اور دنیا بھر میں فتنہ و فساد کی آگ لگانے کے باوجود مسیح دجال ان کو اپنا دیدار کروا کے نہیں دے رہا۔ یہود کی تمام تر کوششوں اور شیطانی تدبیروں کے باوجود اور عالمِ اسلام کے حکمرانوں اور مقتدر طبقے کی خاموشی، جانبداری اور کلی اطاعت کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ مسلم اُمّہ بطور خاص عراق و کشمیر، فلسطین اور چیچنیا کے مسلمان اور بالخصوص پاکستان اور افغانستان کے عامۃ المسلمین میں مغرب سے نفرت، دینی رجحان اور دین کی خاطر جان دینے کے شعور میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے یہود کو حواس باختہ، برافروختہ اور مزید ظلم و تشدد اور خوفناک غیر انسانی حرکتوں پر آمادہ کر دیا ہے لیکن مسلمانوں کے قتلِ عام، نسل کشی، جلاوطنی، عصمت دری،

بائیکاٹ، اذیت رسانی اور ہمت توڑ کر بے عزت کر دینے والے پروپیگنڈے کے باوجود وہ دیکھ رہے ہیں کہ اُمّت کے عزم میں لچک کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے۔ حال ہی میں انڈونیشیا میں پھانسی کی سزا سننے والے نوجوان نے جس ایمان افروز ردِعمل کا اظہار کیا ہے وہ اس کی تازہ ترین اور بہترین مثال ہے۔ اس نے خوشی میں بے خود ہو کر نعرۂ تکبیر لگایا اور شہادت کی نعمت ملنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ یہود اپنی بے لگام شیطانی طاقت، بے حساب سودی سرمایہ، پہاڑوں کو ہلا دینے والی سازشیں اور قوموں کا نام مٹا دینے والی تخریب کاریاں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جھونک دینے کے باوجود دیکھ رہے ہیں کہ ان کے حسبِ منشا نتائج حاصل نہیں ہو رہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ جتنا نقصان عالمِ اسلام کو پہنچنا چاہیے تھا نہیں پہنچ سکا اور اس کی بنیادی، ایمانی اور نظریاتی طاقت محفوظ ہے اور اگر مزید مظالم کیے گئے تو وہ ایسا رخ اختیار کر سکتی ہے جسے روکنا بزدل خارش زدہ لومڑی جیسے یہودیوں کے بس کی بات نہ ہوگی لہٰذا اگر نئے عالمی نظام کو فوری طور پر اور پوری قوت سے نافذ نہ کیا گیا تو یہود کا برپا کیا ہوا نظام ہمیشہ کے لیے بکھر جائے گا۔

فلیش پوائنٹ کے گرد:

اب انہوں نے اس بات کا فیصلہ کر لیا ہے کہ مزید تاخیر ان کے عالمی منصوبے کو درہم برہم کر دے گی اور وہ دجّال کے خروج کے لیے مطلوبہ حالات پیدا کرنے میں صدیوں تک کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اس شکست کے احساس، ناکامی کی ذلت اور فطری کمینگی نے انہیں نیم دیوانہ کر چھوڑا ہے۔ انہوں نے مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا لیکن طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ چند سال پہلے تصور میں نہ تھی۔ مسلمانوں کو فحاشی میں مبتلا کرنے کے لیے اپنی بہو بیٹیوں کو بھی داؤ پر لگا دیا مگر عمرہ اور حج میں حاضری پہلے سے چار گنا بڑھ گئی ہے۔ دہشت گردی کی رٹ لگا کر جہاد سے تعلق کے حوالے سے دہشت پھیلانی چاہی مگر ماڈرن مسلمان نوجوان ہی نہیں، امریکی بچے بھی جہاد کے متعلق مزید متجسس ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مسلمان نوجوان کی نظر، سماعت، سوچ اور ماحول کو گندا کرنا چاہا مگر مساجد میں معتکفین کی حاضری اتنی بڑھ گئی کہ جہاں اعتکاف والے ڈھونڈے سے نہ ملتے تھے وہاں آغازِ ماہِ رمضان میں رجسٹروں میں نام لکھوایا

جاتا ہے اور امیدواروں میں اکثریت نوجوانوں کی ہوتی ہے۔ آخری حربہ مغربی نظام تعلیم کا تھا جس نے اُمّت کو دوحصوں میں تقسیم کردیا تھا مگر علمائے کرام اس میدان میں بھی جدوجہد کررہے ہیں اور مسلم تو کیا غیر مسلم ممالک میں بھی اسلامک اسکولز کی چین قائم ہوچکی ہے اور اس سلسلے میں دنیا بھر میں مزید کام تیزی سے جاری ہے اور جس دن مسلمان اہل علم اپنا ترتیب دیا گیا خالص اور مکمل اسلامی نصاب تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے اس دن یہودی دانشوروں کو منہ چھپانے کو جگہ نہ ملے گی۔ اس لیے وہ ذلت آمیز غصے اور بے بسی کے احساس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ مسجدِ اقصیٰ کو ڈھانے، ہیکل سلیمانی کی تعمیرِ نو اور پورے جزیرۃ العرب پر قبضہ کرلینے کو مزید ٹالنا خطرناک ہوگا لہٰذا اس آپریشن کا وقت گزرتا جارہا ہے۔ ''ابھی نہیں تو کبھی نہیں'' کی اس کیفیت اور سامنے مجاہدینِ اسلام کے نہ ختم ہونے والے جذبے کی طاقت نے انہیں مرکھنی گائے کی طرح دیوانہ بنادیا ہے لہٰذا وہ بیت المقدس کے فلیش پوائنٹ کے گرد اپنی پوری عسکری طاقت جمع کررہے ہیں۔ یروشلم کے محاذ کو اس جنگ کے لیے تیار کررہے ہیں جس کا بارود مہیا ہوچکا ہے بس اس بات کی دیر ہے کہ جہاں جہاں سے ردِعمل کا لاوا پھٹنے کا امکان ہے وہاں سے ''تسلیم'' ورضا کی حفاظتی ڈھال فراہم کرلی جائے۔

گُدّی اور چوٹی سے:

حال ہی میں مفکرِ اسلام شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے غاصب امریکیوں سے تعاون کے لیے پاکستانی فوج بھیجنے کی صریح حرمت کا تاریخی فتویٰ دے کر اہلِ حق کی طرف سے جو فرض کفایہ ادا کیا ہے اس کے بعد تو شیطان کے پیروکار یہودی دانشور آگ پر لوٹ رہے ہوں گے۔ حضرت کی علمیت اور متانت کے حسین امتزاج کا شاہکار یہ فتویٰ ان شاء اللہ مکّار اور بُزدل یہودیوں کو عراق میں اس طرح سرگرداں رہنے پر مجبور کردے گا جیسے ان کے آباؤاجداد ''وادئ تیہ'' میں بھٹکتے رہے تھے۔ اے اہلِ ایمان! یہ کیا غضب ہے کہ خدا، اس کے فرشتے، سنت کا نور، راسخین فی العلم کی رہنمائی اور جذبۂ جہاد کی لازوال طاقت آپ کے ساتھ ہے، تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ سیاسی دانشوروں اور نام

نہاد فلسفی جغادریوں کی ساری قلابازیاں ناکام ہوگئیں، یہ صرف مُلّا اور مجاہد تھے جنہوں نے ساری دنیا کے شکست قبول کر لینے کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور امریکا کو افغانستان میں گدّی سے اور عراق میں چوٹی سے ''نپ'' لیا ہے، پھر بھی تم دین سے دور، اللہ والوں سے بیزار اور دشمنوں کے پروپیگنڈے سے خوفزدہ ہو۔ قبر کی دلہن والی رات پر بیڈروموں کی حبس زدہ راحتوں کو ترجیح دیتے ہو۔ خدا نے تمہیں اس گئے گزرے زمانے میں جہاد کی برکت سے غازیوں کے کمالات اور شہداء کا چہرہ دیکھنے کی توفیق دی، زخمیوں کی خدمت اور جہادیوں کی اعانت کی سعادت بخشی، پھر بھی تم خود کو مجرموں کی طرح احساسِ کمتری میں مبتلا سمجھتے ہو؟ مشرق سے طلوع ہونے والے سورج کا پیغام سمجھو اور اس وقت سے پہلے توبہ کی فکر کرو جب وہ مغرب سے طلوع ہونے لگ جائے گا پھر سب کیا دھرا ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا اور بنجارہ اتنی دور لاد چلے گا کہ کوئی آہ وزاری کام نہ آسکے گی۔

دو جڑواں مثالیں

بعض چیزیں بظاہر اتفاقی معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر حقائق کے تناظر میں ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں زبردست عقلی اور منطقی ربط ہوتا ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ آج کی مجلس میں ایسے ہی دو تاریخی امور سے گفتگو ہوگی۔ پاکستان اور بھارت کی تاریخی دشمنی اور بابری مسجد کا قضیہ اور دوسری طرف اسرائیل و فلسطین کی باہمی کشمکش اور مسجدِ اقصیٰ کا معاملہ بظاہر دو الگ الگ واقعات معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت ان میں گہرا تعلق اور تاریخی ربط ہے۔ اس تعلق کو صحیح طرح سمجھے بغیر اس کشمکش کی معنویت کا کماحقہٗ ادراک نہیں کیا جاسکتا جو ان دو خطوں میں جاری ہے اور تاریخِ عالم کے انوکھے واقعات پر منتج ہوگی۔ ایسے واقعات جو سعادت مندوں کے لیے نیک بختی کی انتہا اور بدبختوں کے لیے ازلی شقاوت کی ابدی مہر ثابت ہوں گے۔

اصل بات تک پہنچنے سے پہلے ہمیں اس کی ابتدا تک جانا ہوگا۔ دنیا میں یوں تو سینکڑوں قومیں بستی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض کو آباد کر رکھا ہے لیکن ان میں دو قومیں ایسی ہیں جن میں ایک مخصوص قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ ان کا ایک خاص مزاج ہے جس کی بنا پر وہ خود کو نسلی اور خونی اعتبار سے دوسری قوموں سے جدا اور ممتاز رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کی ظاہری اجتماعیت کی بنیاد اگرچہ مذہب پر ہے، لیکن وہ کسی دوسری قوم کو جو ان کا مذہب قبول کر لے اپنا ہم پلہ قرار دینے پر تیار نہیں ہوتیں۔ عصبیت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ان کی یہ شدت پسندی انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ غالب ہوں یا مغلوب ہر صورت اور ہر حالت میں اپنی نسل پرستانہ سوچ کو برقرار رکھیں اور فضیلت کا سبب عمل اور کردار کو نہیں بلکہ خون، ہڈی اور نسل جیسی غیر اختیاری اور مادی

چیزوں کو قرار دیں۔ اس موقع پر اسلام کی آفاقیت اور فضیلت واضح ہوتی ہے کہ اگر نک کٹا حبشی غلام بھی آج مسلمان ہو جائے تو کل وہ مسلمانوں کی عبادت میں ان کا امام اور سیاست میں امیر المؤمنین بن سکتا ہے۔ بہر حال یہ دو قومیں اپنے تقدس اور برتری کی بنیاد اپنے مذہب کو بتاتی ہیں لیکن ان کا رخ باہر کی طرف پھیلنے اور عام انسانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی بجائے اندر کی طرف سکڑنے اور دوسرے انسانوں کو کمزور اور حقیر (اچھوت اور جنٹائل) سمجھ کر انہیں دھتکارنے، محکوم بنانے اور خود سے فاصلہ پر رکھنے کی طرف ہوتا ہے۔

ان میں سے پہلی قوم برہمن ہے جو اصل ہندو ہیں۔ ہندوؤں کی بقیہ تین ذاتیں کھتری، شودر اور اچھوت یا وہ غیر ہندو جو ''شدھی'' کر کے ہندو بنائے گئے ہوں، وہ کتنے ہی پکے اور کھرے ہندو کیوں نہ ہو جائیں لیکن وہ برہمن کے مندر میں جا سکتے ہیں نہ انہیں قیامت کی صبح تک ان جیسا مرتبہ اور مقام مل سکتا ہے۔ برہمن کتنا ہی بدکردار اور ہندو مذہب سے دور یا اس کا باغی ہو لیکن وہ پوتّر ہے اور بقیہ انسان اگرچہ کٹر ہندو کیوں نہ ہوں دوسرے درجے کی مخلوق ہیں۔ گویا کہ عقیدے کی بنیاد مذہب اور کردار نہیں بلکہ نسل اور قومیت ہے۔

اس جاہلانہ اور غیر انسانی نظریے کی حامل دوسری قوم یہود ہے۔ یہود آسمانی مذہب اور آسمانی کتاب کی پیروی کے مدعی ہیں۔ ان کے مشہور مذہبی اور سیاسی نشان ''ستارۂ داؤدی'' کے چھ کونے اس دعویٰ پر علامتی تعبیر ہیں۔ یہ ستارہ دو مثلثوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک سیدھی اور دوسری الٹی۔ سیدھی کے تین کونے ''خدا، انسان اور دنیا'' اور الٹی کے تین کونے ''وحی، مخلوق اور نجات'' کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن ان سب دعووں کے باوجود یہودیت دنیا کو بے دینی، فحاشی، بے راہ روی اور خدا فراموشی میں مبتلا دیکھنا چاہتی ہے اور اس کے لیے کمیونزم جیسے دہریہ انقلاب سے لے کر فحاشی و عریانی پھیلانے تک ہر حربہ آزماتی ہے تاکہ دنیا پیٹ اور شرم گاہ کے تقاضوں کی تکمیل کے چکر میں پڑ کر ان کی غلامی کرتی رہے اور کسی بلند مقصد زندگی کا تصور بھی اس کے حاشیۂ خیال میں نہ آئے۔ یہود دنیا پر اپنی برتری قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کی شکل یہ نہیں کہ نسلِ انسانی ان کا خدائی مذہب قبول کرلے اور اگر اس میں نجات ہے تو اُخروی نجات

پالے بلکہ ان کے نزدیک اس کی مطلوبہ شکل یہ ہے کہ سارے لوگ جانوروں کی طرح بے دین، ملحد، لامذہب اور بے راہ رو ہو جائیں اور ان کی چاکری کریں۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ کوئی غیر یہودی یہودی ہو جائے۔ اگر کوئی دل و جان سے اور پوری عقیدت و اخلاص سے یہودیت قبول کر لے تو بھی ان کے نزدیک وہ یہودی نہیں بن سکتا اور نہ اسے یہودیوں جیسی مراعات حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہاں جب وہ تعداد کی کمی سے مجبور ہو جائیں تو ''غیر خاندانی یہودی'' کو اپنا آلہ کار بنانے کے لیے دل بہلاوے کی خاطر کوئی اچھا سا نام دے کر ''اچھے سے کام'' پر لگا دیتے ہیں۔

اسرائیل میں یہودیوں کی آباد کاری کے وقت جب موت سے خائف یہودی ترغیبات کے باوجود ''ارضِ موعود'' میں رہنے کو تیار نہ ہوئے اور قابض نفری کی کمی کا مسئلہ پیدا ہونے لگا تو بہت سی ٹھکرائی ہوئی قوموں کو ''بناسپتی یہودی'' کا اعزاز دے کر ارضِ فلسطین میں دھڑا دھڑ بھجوایا گیا لیکن ان کی شناخت کو جدا اور ممتاز رکھا گیا اور ان کی آبادیاں ''اصلی تے وڈے'' یہودیوں سے جدا ہیں۔ اصل دیسی یہودیوں کو جو اسرائیل کے مالک اور اس کا طبقہ اشرافیہ ہیں ''اش کے نازم'' (ASHKENAZIM) کہتے ہیں اور درآمد کردہ ''نو یہودی'' جو اِن کی ڈھال بننے کے لیے قربانی دینے کی خاطر بلائے گئے ہیں، سفرڈم (SEPHERDIM) پکارے جاتے ہیں۔

نسلی تفوق کو اپنے مذہب، ملت اور اُمّت کی بنیاد بتانے کے جاہلانہ اور شیطانی نظریے کے علاوہ بھی ان دونوں قوموں میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ مثلاً:

یہ دونوں طبقے خود کو اللہ ربّ العالمین کے مقبول اور اس کی طرف سے مبعوث سمجھتے ہیں پھر بھی اللہ کے ساتھ اس کے نیک بندوں کو شریک کرتے اور انہیں اللہ کا بیٹا، اوتار یا مظہر مانتے ہیں۔ ہنود اللہ تعالیٰ کے گستاخ ہیں کہ اس کے ساتھ بندروں، سانپوں اور چوہوں جیسی مخلوق کو شریک کرتے ہیں اور یہودی انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء و اہل اللہ کے گستاخ ہیں۔ ان پر تہمت لگانے اور قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ایک اور قدر مشترک یہ کہ دونوں مسلمانوں کے مقابلے میں ایک طرح کی محرومی اور احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ ہنود کے دل میں یہ احساس

جاگزیں ہے کہ ہمارے خداؤں کو نہ ماننے والے کس طرح عرب و ہند میں ہم پر غالب آئے اور یہود کو اس بات کا رنج کھایا جاتا ہے کہ ہمیں نبوت و قیادت سے محروم کر کے ان اُمّی اور ان پڑھ لوگوں کو کس طرح دنیا کی علمی اور سیاسی قیادت پر فائز کر دیا گیا۔ ان جڑواں مثالوں کی مشترک قدریں یہیں پر ختم نہیں ہو جاتیں کہ ان دونوں قوموں نے گزشتہ صدی میں مسلمانوں کے خلاف باہمی اتحاد کو ''تحالف'' کی حد تک پہنچا دیا ہے اور کشمیر کے مظلوموں پر ستم آزمائی کے نت نئے حربے موساد کے وحشیوں سے سیکھنے سے لے کر کہوٹہ کے پلانٹ کے خاتمہ کی سازش تک اور مسجدِ اقصیٰ پر قبضہ اور اسے جلانے کی کوشش سے بابری مسجد کے انہدام تک یہ دونوں ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ آپ اس بات کو بھی مدنظر رکھیے کہ جس طرح اسرائیل گردوپیش کے ملکوں کو ضم کر کے گریٹر اسرائیل کے قیام کے سرسام میں مبتلا ہے اسی طرح گائے کے پیشاب میں شفا تلاش کرنے والے ہندو برصغیر میں گریٹر ہندو ایمپائر کے قیام اور اکھنڈ بھارت کے منصوبہ کو عملی شکل دینے کے لیے جنون کی حدوں سے گزر رہے ہیں۔ صہیونیت کے خفیہ حلقوں میں جس طرح عظیم اسرائیل کا نقشہ اردن، لبنان، شام، عراق اور سعودی عرب کو اپنی حدود میں دکھاتا ہے اسی طرح اکھنڈ بھارت کے منصوبے میں بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، مالدیپ، اور انڈونیشیا و برما کے علاوہ پاکستان و افغانستان بھی شامل ہیں۔ یہود کی طرح ہندو قوم اپنی عظمتِ رفتہ اور سلطنتِ گم گشتہ کی تلاش میں ہے۔ وہ ان تمام علاقوں کو جو ماضی میں ہند کے ساتھ منسلک رہے، عسکری طاقت سے فتح کر کے وہاں کے باشندوں کو شدھی کرنا چاہتی ہے۔ بھارت کی طرف سے پڑوسی ملکوں میں سازشیں کرنے، وہاں اپنے اثر و رسوخ میں اضافہ اور بغیر ضرورت کے بے پناہ فوجی طاقت بڑھانے کے پیچھے وہی توسیع پسندانہ ذہنیت کارفرما ہے جس نے یہود کو سراپا شر بننے پر مجبور کر رکھا ہے۔ مزید سنیئے! جس طرح بھارت کے راستے میں پورے خطے پر مکمل بالادستی میں واحد رکاوٹ پاکستان کی شکل میں حائل ہے اسی طرح یہود کی نظروں میں بھی پاکستان اسی لیے کھٹکتا ہے کہ وہ کرۂ ارض پر اس کا واحد مدِ مقابل بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دونوں سمجھتے ہیں کہ اس کی فوج کی پیشہ ورانہ مہارت اور عوام کا بے پناہ جذبۂ جہاد اور گزشتہ دو عشروں

سے جہد میں عملی شمولیت اور اس کا شوق، اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی بنیاد بن سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ اور قرآنی نظامِ حیات کے نفاذ کا آغاز اگر ہوگا تو اسی خطے (پاکستان وافغانستان) سے ہوگا۔ فی الحال یہ خدائی نظامِ تربیت سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے یہ دونوں دشمن اس ڈر کی وجہ سے بظاہر ''دوستی دوستی'' اور ''تسلیم تسلیم'' کا کھیل کھیلتے ہیں لیکن بباطن ریاستِ پاکستان کے خلاف باہمی اتحاد وتعاون کی ضرورت کو اور زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کر کے اسے بڑھاتے چلے جارہے ہیں۔

آخری بات یہ کہ دونوں اسلام اور مسلمانوں سے دائمی اور ابدی نوعیت کی نہ ختم ہونے والی دشمنی اور خون کو جلا دینے والے حسد میں مبتلا ہیں۔ چھٹے سپارے کی آخری آیت ''اور تم اہلِ ایمان کا سب سے زیادہ دشمن یہود اور مشرکین کو پاؤ گے'' اس پر شاہد ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے کچھ قوموں نے ایسی دشمنی بھی کی کہ ان کا وجود مٹانے کے درپے ہوگئے لیکن بعد میں ایسی کایا پلٹی کہ نہ صرف یہ وقتی عداوت اور عارضی رنجش ختم ہوگئی بلکہ یہ گروہ مسلمان ہوگئے۔ تاتاریوں اور ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے لیکن یہود و ہنود کے دل میں اسلام دشمنی کی نہ بجھنے والی آگ ایسے دائمی بُغض اور ابدی جذبۂ عناد میں تبدیل ہو چکی ہے کہ اس کرۂ ارض پر انسانی حیات کی بقا کے ساتھ ساتھ چلے گی تا آنکہ ربِّ تعالیٰ ان تینوں گروہوں میں سے جو حق پر ہے اسے کُلّی فتح نصیب کرے گا۔ ابتداءِ اسلام میں مکہ مکرمہ کے بت پرستوں اور یثرب کے یہودیوں نے باہم معاہدہ کے ذریعے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانا چاہا اور قیامِ پاکستان (۱۹۴۷ء) اور قیامِ اسرائیل (۱۹۴۸ء) کے وقت ان دونوں نے برصغیر اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں پر انتہائی مظالم ڈھا کر ان کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جواب تک ان کے باہمی گٹھ جوڑ سے جاری ہے۔ اس طرح کی بہت سی باتیں ان دونوں میں مشترک ہیں لیکن ہم ان کے درمیان جس قدرِ مشترک کا ذکر کرنے چلے ہیں وہ اس کشمکش کے تباہ کُن انجام میں ان کا اشتراک ہے جو انہوں نے مسلمانوں سے برپا کر رکھی ہے۔ اس سلسلے میں آپ یہ تین احادیث مبارکہ پڑھیے جو حیرت انگیز طور پر ان کے انجام کی مماثلت سے آگاہ کرتی ہیں۔

(۱) عن ثوبان قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''عصابتان من أمتي أحرزهما الله من النار، عصابة تغزوا الهند و عصابة تكون مع عيسى ابن مريم عليهما السلام.''

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مروی ہے:

''اللہ رب العزت میری اُمّت کے دو گروہوں کو دوزخ کے عذاب سے بچائے گا۔ (یعنی وہ عذابِ جہنم سے محفوظ رہیں گے اور جنتی ہوں گے) ان میں سے ایک ہندوستان میں جہاد کرے گا اور دوسرا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ ہوگا۔''

(كنز العمال، مسنداحمد، سنن نسائي، معجم الطبراني)

(۲) عن أبي هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم و ذكر الهند: ''يغزوالهند منكم جيش يفتح الله عليهم حتى يأتوا بملوكهم مغللين بالسلاسل، يغفر الله ذنوبهم، فينصرفون حين ينصرفون فيجدون ابن مريم بالشام.'' (الفتن لنعيم بن حماد، حديث ۱۲۳۶، ۱/۴۰۹، كنز العمال ۱۴/۶۱۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے ایک جماعت ہندوستان کے ساتھ جنگ کرے گی۔ اسے اللہ تعالیٰ فتح نصیب فرمائیں گے۔ یہاں تک کہ یہ فاتحین، اہلِ ہند کے حکمرانوں کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کو مغفرت کا تمغہ عطا فرمائیں گے۔ اس (جہادِ ہند) سے مسلمان فارغ ہوں گے اور (مشرقِ وسطیٰ کی جانب یہودی فتنہ کی سرکوبی کے لیے پہنچیں گے تو) شام میں مسیح ابن مریم علیہما السلام کو پائیں گے۔''

اس حدیث میں ہندوستان کے حکمرانوں کو زنجیروں میں جکڑنے کی بات کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سرکش اور شدت پسند جنونی ہوں گے ممکن ہے کہ اس سے مراد انتہا پسند ہندو تنظیموں کے رہنما ہوں۔

(۳)عن نهيك بن الصريم السكوني قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لتقاتلن المشركين، حتىٰ يقاتل بقيتكم الدجّال علىٰ نهر الأردن، أنتم شرقية وهم غربية."

قال الحافظ الهيثمي في مجمع الزوائد: رواه الطبراني، والبزار، ورجال البزار ثقات(۷/۲۶۸)وكذافي الإصابة في تمييز الصحابة. (۶/۳۷۶)

"تم مشرکین سے جنگ کرو گے حتیٰ کہ تمہارے باقی ماندہ لوگ نہرِ اُردن پر دجّال سے جنگ کریں گے، تم (دریائے اردن کی) مشرقی جہت میں ہو گے اور وہ مغربی جہت میں ہوں گے۔"

قال راوي الحديث ابن صريم السكوني: "وما أدري أني الأردن يومئذٍ من الأرض؟"

راوی حدیث ابن صریم السکونی کہتے ہیں کہ معلوم نہیں اردن اس دن اس زمین کے کس خطہ پر ہوگا؟ دریائے اردن آج اردن اور اسرائیل کی سرحد پر واقع ہے۔اس کے مشرقی جانب مسلمان اور مغربی جانب یہودی بستے ہیں۔ "غرب اردن" یعنی اردن کے مغربی کنارہ کی اصطلاح اکثر قارئین نے سُنی ہوگی، یہ وہ حصہ ہے جہاں اسرائیل نے حال ہی میں یہودی بستیوں کے گرد اونچے حفاظتی حصار تعمیر کیے ہیں۔

ان تینوں احادیث میں آپ غور کریں (اور یہ فتن وحوادث کے باب میں سند ومتن ہر دو اعتبار سے قابل استدلال ہیں) تو معلوم ہوگا کہ آخر زمانہ میں اللہ ربّ العزت پاکستان (و افغانستان) اور فلسطین کے مسلمانوں سے جہاد اور نصرتِ اسلام کے حوالے سے اہم کام لے گا اور ان کے دشمنوں، برصغیر میں ہنود اور مشرق وسطیٰ میں یہود کو ان کے ہاتھوں عبرتناک انجام سے دوچار کرے گا۔احادیث شریفہ میں دنیا کی ان دو مشہور اور فیصلہ کن جنگوں کے حالات، واقعات اور وقت اور شریک مجاہدین کی فضیلت (دنیا میں فتح اور آخرت میں مغفرت وجنت کی بشارت) میں بھی یکسانیت ملتی ہے۔ہم اللہ تعالیٰ کی مہربان ذات،اس کی بے پایاں رحمت اور اُمّتِ محمدیہ کے مجاہدین سے اس کی محبت سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ان مجاہدین سے محبت و

عقیدت رکھنے والے اور ان کے سلسلے سے جڑے رہنے والوں کو بھی اس اجر و فضیلت میں کسی قدر حصہ ضرور دے گا جس کا اس کے سچے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وعدہ کیا ہے۔ اے اہلیانِ وطن! اے افغانِ غیرت مند! اے القدس کے باسیو! اسلام کی جو قوت اور جو نعمتیں تمہیں ملی ہیں ان کی قدر پہچانو! اور اللہ کے دشمنوں سے دوستی لگا کر خود کو اللہ کی نظر سے گرانے کی بجائے اللہ اور اللہ والوں کے دشمنوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے اللہ کی رحمت اور رضا کا استحقاق حاصل کرو۔ بہلاووں میں پڑ کر خود کو دھوکا مت دو اور اس دن کے لیے صداقت، شجاعت اور عدالت کا سبق یاد کرو جب تم سے دنیا کی امامت کا کام لیا جائے گا۔

پُراسرار حروف کیا کہتے ہیں؟

کچھ شمارے قبل شائع ہونے والے ایک مضمون کے بارے میں لاہور سے کچھ دوستوں نے خط بھیجا ہے کہ ایک ڈالر کے نوٹ پر درج الفاظ کے بارے میں وضاحت نہیں کی گئی کہ ان کا کیا مطلب ہے؟ لہٰذا آج کی مجلس انہی علامات اور نامانوس الفاظ کے لیے وقف ہے جو دجّال کی عبوری ریاست کی کرنسی کی بنیادی اکائی پر درج ہیں۔

ایک ڈالر کے نوٹ کے دائیں حصہ پر جو علامات ہیں...... عقاب، اس کے دائیں ہاتھ میں گندم کی بالیاں اور بائیں ہاتھ میں تیروں کا گٹھا وغیرہ...... بائیں طرف جو دائرہ ہے اس میں جو شکلیں، علامات اور الفاظ ہیں وہ غیر معمولی اور چونکا دینے والے ہیں۔ ان پر بطورِ خاص غور و فکر کی ضرورت ہے۔ مثلاً:

☆ اہرامِ مصر کی شکل کی ایک مخروطی تکون کے سرے پر ایک آنکھ ٹکی ہوئی ہے۔ یہ سراغ رساں آنکھ نہایت مکروہ قسم کا تاثر پیدا کرتی ہے گویا کہ اس کے ذریعے ساری دنیا کو تاڑا جا رہا ہے۔ صہیونی دماغ اس کے ذریعے بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے آقا مسیح دجّال کی اکیلی آنکھ ساری دنیا کو اپنی نادیدہ گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ اگر کوئی شخص یہودیوں سے پوچھے کہ آخر تمہارا مسیح پسِ پردہ رہ کر دنیا پر گرفت مضبوط کرنے کے چکر میں کیوں ہے؟ ظاہر کیوں نہیں ہو جاتا تاکہ جو کچھ ہونا ہے اس کا فیصلہ ہو جائے اور قصہ زمین برسرِ زمین نمٹ جائے تو اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ ایسا اس وقت ہوگا جب زمین پر ایک زبردست قسم کی مقدس جنگ چھڑ جائے جو انتہائی خونریز بھی ہو اور عالمگیر بھی، اس میں اسرائیل ساری مسلم دنیا کا فریق ہوگا کیونکہ یہ جنگ (معاذ اللہ) مسجدِ اقصیٰ کو بم سے اڑانے کے نتیجے میں شروع ہوگی اور دجّال کو

مجبور کردے گی کہ وہ ہیکل کی تیسری مرتبہ تعمیر اور اپنے پیروکاروں کی حمایت کے لیے مداخلت کرے اور یوں دنیا اس مجسمِ شر کے ظہور کا تماشا کر سکے گی۔ یہودیوں کو اس امر کا اتنا یقین ہے کہ انہوں نے مسجدِ اقصیٰ کی جگہ ہیکل کی تعمیر کے لیے سامان تک فراہم کر لیا ہے۔ بیت المقدس کے قریب بہت سی دکانیں ہیں جہاں کچھ کٹر قسم کے یہودی کاریگر وہ نادر اشیا تیار کر رہے ہیں جو ہیکل کی سجاوٹ کے لیے استعمال کی جائیں گی۔ ایک یہودی خالص ریشم کا تھان بُن رہا ہے جس سے ان یہودی ربّیوں کے لباس تیار کیے جائیں گے جو تقریباً چار ہزار سال بعد ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کریں گے۔ یروشلم میں چند برس قبل ایک یہودی مدرسہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کا نام ''راہبوں کا تاج'' ہے (ہماری اصطلاح میں تاج العلوم بلکہ تاج العلماء کہہ لیجیے) اس میں قدیم رسوم پرست ربّی، نوجوان یہودی طلبہ کو اس امر کی تربیت دے رہے ہیں کہ ہیکل میں خداوند کے حضور سرخ سانڈ یا کنواری بے داغ سرخ گائے کی قربانی کیسے دی جائے گی؟ اس مدرسے کے بانی ساری دنیا کے یہودیوں سے خطیر مقدار میں چندہ جمع کرتے ہیں اور انہیں بڑے فخر سے ان زیرتربیت نوجوانوں سے ملواتے ہیں جو اس یہودی مدرسہ کے طالب علم ہیں اور ''روحانیت کی پختگی'' کے لیے انہیں عملاً مشاہدہ کرواتے ہیں کہ طلبہ کو جانوروں کی قربانی کا طریقہ کیسے سکھایا جاتا ہے؟

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ End Time آ پہنچا ہے اور ہر یہودی کو اپنے آقا کے استقبال کی تیاریوں میں حصہ لینے کے لیے چندہ دینا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر یہود کی طرف سے مدارس دینیہ کے خلاف پروپیگنڈے اور ان کے لیے عطیات مہیا کرنے والے مسلمانوں کو متنفر کرنے کی مہم کا پس منظر سمجھ میں آ جانا چاہیے۔

☆ اب ذرا تکون کے اوپر لکھے گئے حروف پر نظر ڈالیے: Annuit Coeptis امریکی قوم یونانی اور لاطینی زبان نہیں جانتی، انگلش اور ہسپانوی جانتی ہے مگر حیرت ہے کہ اس کے نوٹ پر غیر انگریزی زبان کے الفاظ درج ہیں۔ ان الفاظ کے معنی ''کامیابی سے ہمکناری'' کے ہیں اور کامیابی سے ہمکناری کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہودیوں کے لیے ایک جنتی منصوبہ بنایا ہے اور ایک ارضی منصوبہ۔ جنّتی منصوبہ کی تفصیلات تو یہود کے ربّی سناتے رہتے

ہیں۔ ارضی منصوبہ یہ ہے کہ اسرائیل کے دوبارہ قیام کے بعد ہیکل سلیمانی میں تخت داؤدی کی تنصیب کی جائے جہاں ان کا یک چشمی سربراہ بیٹھ کر ساری دنیا پر حکومت کرے گا۔ اس وقت دنیا کی سیاست، معیشت، تجارت، ذرائع ابلاغ اور تعلیم وغیرہ پر یہودیوں نے جو قبضہ جمایا ہوا ہے یہ اسی ''کامیابی سے ہمکناری'' کی تمہید ہے۔

☆ تکون کے نیچے نیم دائرے کی شکل میں یہ الفاظ درج ہیں Novus Ordo Seclorum ان کا سیدھا سادہ ترجمہ وہی ہے جسے سینئر بش ''نیو ورلڈ آرڈر'' نیا عالمی معاشرتی نظام کے نام سے ظاہر کر چکے ہیں۔ اس نظام کے تحت افریقہ، ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے پیچیدہ اور مختلف الخیال معاشروں کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ خدا کے اس عظیم اور بے مثال منصوبے میں یہود کے رفیقِ کاربن کر اپنا کردار ادا کریں جو قبلِ قیامت ظہور پذیر ہو کر رہے گا۔ یہود کے اس قیامت خیز پروپیگنڈے کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس وقت دنیا میں یہودیوں سے بڑھ کر اسرائیل کے ایسے وفادار موجود ہیں جو نہ صرف یہ کہ یہودی نہیں بلکہ ماضی قریب و بعید میں یہودیوں کے زبردست دشمن رہے ہیں۔ مثلاً: امریکا میں لاتعداد ایسے عیسائی ہیں جن میں چند چوٹی کے لوگ بھی شامل ہیں جن کی اسرائیل کے لیے پرزور حمایت اور تعاون یہودیوں سے بھی زیادہ ہے۔ اسرائیل کے لیے ان کی ہمدردی کسی احساسِ جرم کے تحت نہیں ہے کہ ماضی میں انہوں نے یہودیوں پر ظلم کیا اور نہ اس لیے کہ یہودیوں نے زبردست تباہی (Holocaust) دیکھی۔ بلکہ ان کو یہودیوں نے یہ باور کرا رکھا ہے کہ اسرائیل ''وہی جگہ'' ہے جہاں ''خدا کی مرضی'' کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ ظہور کریں گے اور آخری جنگِ عظیم Armagadon کے بعد سارے غیر عیسائی عیسائیت قبول کر لیں گے لہٰذا دینی لحاظ سے ہر عیسائی کو چاہیے کہ وہ اسرائیل کی حمایت کرے۔ اگر عیسائی اسرائیل کو تحفظ دینے میں ناکام رہے تو وہ خدا کے آگے اپنی اہمیت کھو دیں گے نیز یہ کہ عرب دنیا چونکہ ایک عیسیٰ دشمن (Antichrist) دنیا ہے لہٰذا عربوں کو نہ صرف یروشلم سے بلکہ مشرق وسطیٰ سے نیست و نابود کر دینا عیسائیوں کی اپنے مسیح سے محبت کا تقاضا ہے۔ یہ عرب خدا کے وعدوں کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

اب آپ یہود کی شاطرانہ چال دیکھیے کہ مسیح دجال کی ریاست کے تحفظ کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر وہ مسیح موعود جناب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو استعمال کر رہے ہیں اور بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو اس حد تک ورغلانے میں کامیاب ہو چکے ہیں کہ وہ سرگرم (Warm) یہودیوں سے بھی زیادہ پُرجوش ہیں اور اس طرح صہیونیت کے طاغوتی قافلے میں یہودیوں کے ساتھ عیسائی بھی شامل ہو چکے ہیں جو خدا تعالیٰ کے بارے میں اس نظریے کے قائل ہیں کہ وہ روئے زمین پر آباد چھ ارب انسانوں میں سے صرف دو قوموں کو جانتا ہے، انہیں اپنا بندہ تسلیم کرتا ہے، ایک یہودی اور دوسرے عیسائی۔ باقی دنیا کا اس کی نظرِ رحمت میں کوئی مقام نہیں۔ وہ آخری جنگِ عظیم میں ہلاک ہوتے ہیں تو ہو جائیں، نجات تو صرف دو منتخب اقوام کو ملے گی۔

☆ تکون کی بنیاد پر یہ حروف نما اعداد درج ہیں MDCC XXVI ان اعداد کو جمع کیا جائے تو ۱۷۷۶ بنتا ہے۔ بظاہر یہ امریکا کی آزادی کا عیسوی سن ہے لیکن اس کا تعلق امریکا کی حب الوطنی سے ہرگز نہیں۔ دراصل اس سال صہیونیت کے چوٹی کے دماغوں نے مل کر ''آرڈر آف الیومیناتی''، یعنی روشن ضمیر لوگوں کا نظام وضع کیا تھا۔ اس نظام کی تکمیل کے لیے یہودیوں نے امریکیوں کو یہ باور کرا رکھا ہے کہ ''خدا امریکا پر مہربان ہے اس لیے کہ امریکا یہودیوں پر مہربان رہتا ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ امریکا کے ٹیکس دہندگان اسرائیل کی چھوٹی سی ریاست کو ہر سال چھ بلین ڈالر کی فوجی امداد دیتے ہیں۔ یہ رقم، ان رقوم کے علاوہ ہے جو لاکھوں ڈالر کی صورت میں وفاقی بجٹ کی دوسری مدات کے ذریعے اسرائیل کو پہنچتی ہیں۔ اسرائیل کے لیے امریکا کی امداد کی مجموعی رقم کانگریس کے ارکان بھی نہیں بتاتے۔ غالباً اس لیے کہ اگر وہ اصل رقم بتا دیں تو وفاق کی دوسری ریاستیں سوال کر سکتی ہیں کہ ان ریاستوں کے مقابلے میں جن کی آبادی بھی اتنی ہی ہے اور اس کے شہری وفاقی حکومت کو ٹیکس بھی دیتے ہیں، اسرائیل کو مقابلتاً بہت زیادہ رقم کیوں دی جاتی ہے؟ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۵ء تک ۴۶ سال کے عرصے میں امریکا کے ٹیکس دہندگان نے اسرائیل کو غیر ملکی امداد کی مد میں ۶۲۶۵ ملین ڈالر دیے ہیں۔ اس کے

معنیٰ یہ ہیں کہ امریکا نے دنیا کے سب سے چھوٹے ملکوں میں سے ایک ملک کو جس کی آبادی کئی ملکوں کی آبادی سے کم ہے، امداد میں اتنی بڑی رقم دی ہے جو افریقہ اور لاطینی امریکا کے ملکوں اور کیربیین ممالک کو دی جانے والی مجموعی امدادی رقم کے برابر ہے۔ ان ملکوں کو ملنے والی مجموعی رقم ۴۰ ڈالر فی کس ہے جبکہ اسرائیل کو ملنے والی رقم ۱۰ ہزار ۷۷۵ ڈالر فی کس ہے۔

عیسائیوں کی اس طاقت سے تقویت پا کر یہودیوں کا ایک گروہ سینا کے صحرا میں مسجدِ اقصیٰ کے نمونے بنا کر اس پر حملے کی مشق اور اس بات کے عملی تجربے کرتا رہتا ہے کہ بم دھماکوں کے بعد (معاذ اللہ) مسجد کس طرف گرے گی اور بم کے ٹکڑے کتنی دور تک جائیں گے۔ گویا کہ یہودی بیک وقت اندرونِ اسرائیل (مقدس سرزمین) اور بیرونِ اسرائیل (موعود سرزمین) دونوں محاذوں پر کام جاری رکھے ہوئے ہیں اور ایک دن اس کا براہِ راست شکار ہم یعنی پاکستانیوں نے ہونا ہے کیونکہ یہ واحد ایٹمی طاقت ان کے راستے کی آخری رکاوٹ ہے۔ عظیم تر اسرائیل اور عظیم تر بھارت ایک دوسرے کے قدرتی حلیف ہیں اور فلسطین کے جانبازوں کے ساتھ کشمیر کے جانثار بیٹوں کو جلد یا بدیر ایک دوسرے کا حلیف بننا ہوگا۔ بابری مسجد کی جگہ رام مندر اور بیت المقدس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر ایسے منصوبے ہیں جن میں سے ایک کی تکمیل دوسرے کی راہ ہموار کرے گی اور ہم کو خواہی نخواہی اس آگ میں کودنا ہوگا جس کا ظاہر موت لیکن باطن ابدی حیات ہے، لہٰذا ہمیں ایمان یا نفاق میں سے ایک کی راہ اختیار کر لینی چاہیے۔ ایمان کی علامت جان و مال سے جہاد فی سبیل اللہ اور نفاق کی نشانی بزدلی اور کنجوسی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ یہود خود تو نوجوانوں کو تربیت دے کر قربانی کے رضا کار اور وفاداروں کا دستہ (Block of the Faithful) تیار کرتے ہیں اور ساری دنیا کے یہودیوں سے ان یہودی مدرسوں اور معسکرات کے لیے چندہ کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کے دینی مدارس اور جہادی تنظیموں کے خلاف زہر اگلتے وقت ان کی زبانیں لٹک کر دنیا والوں کے تلوے چاٹنے لگتی ہیں۔ دینی اور جہادی تحریکوں کے بے بس ہونے کی دیر ہے، یہود کے ہراول دستے تمام عالمِ اسلام خصوصاً پاکستان اور سعودی عرب پر جا چڑھیں گے۔

اب آپ سنیے! جب دجّال مدینہ منورہ پہنچے گا تو اُحد پہاڑ پر کھڑا ہو کر مسجدِ نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر ایک نظر ڈالے گا اور اپنے ساتھ کے لوگوں (کٹر یہودی، ورغلائے ہوئے عیسائی اور ولایتی مسلمانوں) سے پوچھے گا: ''تم یہ سفید محل دیکھ رہے ہو؟ یہ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مسجد ہے۔'' پھر وہ مدینہ میں داخل ہونا چاہے گا مگر اس کے ہر راستے پر مسلح فرشتہ ہوگا۔ یہ حدیث مسند احمد، ج ۴، صفحہ ۳۳۸ اور مجمع الزوائد جلد ۳، صفحہ ۳۰۸ پر موجود ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۹۴ پر یہ حدیث نقل فرمائی ہے لیکن مسجد نبوی کے سفید اور چمکدار ہونے کی وضاحت نہیں فرمائی۔ آج کل سیٹلائٹ یا بلندی سے لی گئی تصاویر میں مسجدِ نبوی روشن اور چمکدار نظر آتی ہے۔ یہ خدا کی شان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی پیش گوئی کا سچا معجزہ ہے۔

ڈالر کی پشت پر موجود ذو معنی تصاویر، خفیہ علامات اور پراسرار حروف واعداد سالہا سال سے گردش میں ہیں۔ یہودیوں کے منصوبے مسلمان جیبوں میں ڈالے پھرتے ہیں لیکن اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے بے خبر ہیں: ''خراسان (افغانستان سمیت ماوراء النہر کا سارا علاقہ خراسان ہے) سے کالی جھنڈیوں والے نکل کر بیت المقدس پر جھنڈا لہرائیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں روک نہ سکے گی۔'' (ترمذی شریف، ابواب الفتن جلد: ۲، صفحہ ۵۲، مطبع ایچ ایم سعید کراچی)

اے پاکستان و افغانستان کے خوش نصیب طالبو اور مجاہدو! حوصلہ رکھنا کہ سچے نبی کی سچی پیش گوئی کا مصداق تم ہی ہو۔

داستان ملت فروشوں کی

نامبارک آدمی:

اس مضمون میں بنیادی طور پر ایک ایسے شخص کی رودادِ جفا کو ظاہر کرنا ہے جس نے ہندوستان سے لے کر حجاز تک کے مسلمانوں سے وہ افسوسناک غداری کی جس کا خمیازہ آج تک برصغیر، ترکی، حجاز، اُردن اور فلسطین کے لاکھوں مسلمان بُھگت رہے ہیں۔ یہ شخص مسلمانوں کے حق میں جتنا نامبارک نکلا اتنا ماضی قریب میں کم ہی کوئی اور ہوگا۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ تاریخِ اسلام جہاں جوانمرد جانبازوں اور پیکر خلوص جاںنثاروں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے وہیں اس میں بعض ایسے بدبختوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور بعض نے تو اپنے مذہب اور ملت سے غداری میں ایسا مذموم اور قابل نفرت وملامت کردار ادا کیا کہ اس کی وجہ سے تاریخ کا رُخ پلٹ گیا اور دشمنانِ اسلام کو زمانہ طویل تک بے انتہا شر وفساد پھیلانے کا موقع ملا جو ان ازلی بدنصیبوں کے نامۂ اعمال میں سیئہ جاریہ کے طور پر لکھا جاتا رہے گا۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ضمیر فروشی اور ملت دشمنی اس شخص کے خاندان میں اب تک چلی آرہی ہے اور اس کی اولاد آج تک مسلمانوں سے غداری اور یہود ونصاریٰ سے وفا شعاری کی مرتکب ہو رہی ہے۔ اس خاندان سے گزشتہ سو سال کے دوران عرب وعجم کے مسلمانوں کو ہولناک نقصان پہنچا اور نجانے یہ منحوس سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

مردانِ حریت:

اس داستان کی ابتدا جنگ عظیم اول سے ہوتی ہے جب حجاز سمیت سارا جزیرۃ العرب

سلطنت عثمانیہ کے زیرنگین تھا۔ ترکوں کی اسلام سے محبت، حرمین شریفین کی خدمت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے باعث دنیا بھر کے مسلمان ان کے گرویدہ اور معتقد تھے۔ انگریز اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر سلطنت عثمانیہ سے محاذ آرا تھا۔ وہ مسلمانوں کے اتحاد کا یہ مرکز اوران کی مذہبی وسیاسی قوت کے اس محور کو ختم کرنا چاہتا تھا تا کہ ایک طرف برصغیر پر اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہ رہے اور دوسری طرف جزیرۃ العرب کی قیادت سلاطین آل عثمان کے ہاتھوں سے جاتی رہے تا کہ فلسطین کے اردگرد وہ اپنے من پسند حکمران بٹھا کر صہیونی ریاست کو تحفظ فراہم کر سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہٗ انگریز کے خلاف عسکری انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ صوبہ سرحد کے آزاد علاقہ میں موجود اپنے شاگرد علما اور مریدین کی مدد سے ہندوستان پر حملہ آور ہو کر انگریزوں کو نکال باہر کریں اور یہاں نظام خلافت راشدہ کی علمبردار اسلامی حکومت قائم کریں۔ اس غرض کے لیے آپ نے اپنے شاگرد رشید مولانا عبیداللہ سندھی صاحب رحمہ اللہ کو کابل بھیجا تا کہ وہ جماعت مجاہدین کو منظم کریں اور خود حجاز روانہ ہوئے تا کہ سلطنت عثمانیہ سے تائیدی خط اور مجاہدین کی امداد کا وعدہ حاصل کر سکیں۔

دودھاری تلوار:

اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا مگر اس موقع پر ایک حرماں نصیب شخص آڑے آیا۔ اس کی ہوسِ جاہ ومال نے مسلمانوں کو یہ بُرا دن دکھایا کہ سرزمین عرب سلاطین عثمانیہ کے مضبوط ہاتھوں سے نکل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ان دنیا پرست حکمرانوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو حرمین کی حفاظت کے لیے یہود و نصاریٰ کے محتاج ہیں اور جن کے زیرانتظام سرزمین اسلام کی دولت لٹ لٹ کر نیویارک اور لندن کو آباد کر رہی ہے۔ اس شخص کا نام شریف حسین تھا اور یہ مکہ مکرمہ کا والی تھا۔ اس ظالم نے مسلمانوں کے ارمان پر دودھاری تلوار چلائی۔ ایک طرف تو اس نے یہ کیا کہ مرکز خلافت کو یقین دلاتا رہا کہ حجاز اور حرمین کے معاملات دیکھنے کے لیے میں کافی ہوں، آپ بے کھٹکے اپنی افواج کو انگریزوں کے مقابلے کے لیے دوسرے محاذوں پر بھیج دیں۔ دوسری طرف انگریزوں کے کہنے پر عربوں کو ترکوں کے خلاف اُکساتا رہا

اور انہیں خلافت اسلامیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتا رہا۔ تیسری طرف اس کم بخت نے یہ حرکت کی کہ جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ترکوں کی طرف سے حجاز کے گورنر غالب پاشا سے مسلمانانِ ہند اور سلطنت عثمانیہ کے جملہ عہدیداران کے نام اپنی حمایت کا خط حاصل کر چکے (جو بعد میں ''غالب نامہ'' کے نام سے مشہور ہوا) نیز خلافت عثمانیہ کے وزیر جنگ انور پاشا سے ملاقات کر کے اسی مضمون کا ایک خط اس سے بھی لے لیا تو اب آپ چاہتے تھے کہ جلد از جلد افغانستان اور وہاں سے آزاد قبائل پہنچ جائیں تاکہ مرکز خلافت کی طرف سے تائید و حمایت مل جانے کے سبب جملہ مسلمانانِ ہند آپ کا ساتھ دیں۔ آپ آزاد قبائل کے مجاہدین کی جماعت لے کر انگریزوں پر باہر سے حملہ آور ہوں اور ہندوستان کے چپے چپے پر بسنے والے آپ کے متعلقین اور عام مسلمان اندر سے بغاوت برپا کر دیں تاکہ فرنگی سے آزادی حاصل کر کے اسلامی خلافت کی بنیاد رکھ دی جائے۔ لیکن مذکورہ بالا شخص نے انگریزوں کے کہنے پر اس نازک موقع میں آپ کو مع رفقا کے گرفتار کر لیا اور پھر آپ کو مصر اور وہاں سے مالٹا بھیج دیا گیا جہاں آپ نے قید کا طویل زمانہ کاٹا اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان آزاد ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ نہ آسکا بلکہ مقامات مقدسہ بھی اسی شخص کی سازشوں سے عثمانی سلطنت کے زیر نگین نہ رہے اور جزیرۂ عرب کے حصے بخرے کر کے اسے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہاں کی حکومت ان حکمرانوں کے ہاتھوں میں آگئی جو کثیر وسائل اور بے حساب دولت اکٹھی کرنے کے باوجود اپنے پڑوس میں موجود فلسطینی مسلمانوں کے کسی کام آتے ہیں اور نہ دنیا کے دیگر حصے میں بسنے والے مسلمانوں کو ان سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ مانا کہ یہ اسرائیل کی عسکری مزاحمت نہیں کر سکتے لیکن جو فلسطینی مہاجرین پڑوسی ممالک کے کیمپوں میں بستے ہیں ان کی مالی مدد کر کے ان کو معاشی مسائل سے تو بے پروا کر سکتے تھے تاکہ ان کے نوجوان بے فکر ہو کر جہاد میں حصہ لے سکیں......لیکن ان سے یہ بھی نہیں ہوتا۔

بے برکت ہاتھ:

انگریزوں کے اس گماشتے کو لالچ تھی کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسے حجاز کی حکومت مل جائے گی لیکن اس کا یہ ارمان پورا نہ ہو سکا۔ آلِ سعود کے حجاز پر غلبہ پا لینے کے بعد

انگریزوں نے اس سے نظریں پھیرلیں اور اسے یہاں سے رسوائی اور ہزیمت اٹھا کر بھاگنا پڑا۔اس نے شام میں جا کر پناہ لی۔اس موقع پر انگریزوں نے اسے دوسرا کام سونپا جس کو اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد آج تک پورا کررہی ہے۔اس کم نصیب نے انگریزوں کی بے وفائی کا مشاہدہ کر لینے کے بعد بھی ان کا آلۂ کار بننا منظور کر لیا اور اس کا خاندان نسل در نسل یہ ذمہ داری پوری کرتا آرہا ہے۔اس مرتبہ اسے یہ ذمہ داری دی گئی کہ فلسطین کے مشرقی کنارے کی، جہاں اُردن واقع ہے، نگرانی سنبھال لے اور صہیونی مفادات کا تحفظ کرے۔اس علاقے سے نہ فلسطینی مسلمانوں کو کوئی امداد پہنچ سکے اور نہ بیرونی دنیا کا فلسطین سے زمینی رابطہ رہے۔وہ دن اور آج کا دن یہ شخص اور اس کی اولاد فلسطین کے پڑوس میں وہ سب کچھ کرتی ہے جس سے یہودیوں کو تحفظ ملے۔گویا کہ اس نے مسلمان ہو کر فلسطین کے گرد ایسا حصار قائم کر رکھا ہے جس کا فائدہ مظلوم اور محصور فلسطینیوں کو نہیں، غاصب اور جابر یہودیوں کو ملے۔اس کے مرنے کے بعد اس کا ایک بیٹا عراق وشام اور دوسرا اُردن کا حکمران بنا۔عراق اور شام کی حکمرانی تو ۱۹۵۸ء میں اس خاندان سے چھن گئی، البتہ اُردن ابھی تک ان کے بے برکت ہاتھوں میں ہے۔

بیمار بطخ:

اس کے بیٹے عبداللہ بن حسین نے ۳۰ سال تک (۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۰ء) اُردن پر حکمرانی کی۔اسی دوران اسرائیل وجود میں آیا، مستحکم ہوا اور یہ غدار ملت تماشا دیکھتا رہا۔اس کے بعد شریف حسین کا پوتا طلال بن عبداللہ اردن کا حکمران ہوا لیکن اسے ایک ہی سال حکومت نصیب ہوئی۔(۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء) بعد ازاں دماغی بیماری کی وجہ سے اسے تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد اس کا پڑپوتا حسین بن طلال حکمران ہوا جسے دنیا شاہ حسین کے نام سے جانتی ہے۔ اس نے تقریباً نصف صدی تک اُردن کو صہیونیت کے تحفظ کا مرکز بنائے رکھا۔اسی کے دور میں ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے حملہ کر کے دریائے اردن کا مغربی کنارہ چھین لیا اور اسے ''یہودا'' اور ''سامرہ'' نامی دو حصوں میں تقسیم کیا لیکن فلسطینی مہاجرین سے وحشیانہ سلوک کرنے والا یہ حکمران بیمار بطخ کی طرح مریل آواز نکالنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔اسی کے دور میں ملی بھگت

سے کی جانے والی ایک مصنوعی جنگ کے بعد بیت المقدس اسرائیل کے حوالے کر دیا اور اس نے بیت المقدس واپس لینے کی بجائے نہ صرف یہ کہ اسرائیل کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا بلکہ اسرائیل کے تحفظ کے لیے امریکا و برطانیہ کو فوجی اڈے بھی فراہم کیے۔ یہود و نصاریٰ سے اس کے خصوصی تعلقات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن کے مرنے پر اس نے اُس کی قبر پر حاضری دی اور زار و قطار رویا جبکہ یہودی روایات کے مطابق کسی ''مسلمان'' کو یہودیوں کی قبر پر جانے کی اجازت نہیں، دوسری طرف جب یہ کینسر میں مبتلا ہو کر صاحب فراش ہوا تو یہودی عبادت خانوں میں اس کی صحت کے لیے خصوصی دعائیں کی گئیں۔

ہرے زخم:

یہ ایسا نامبارک شخص تھا کہ صہیونی مفادات کی نگہبانی کے لیے اپنے دینی بھائیوں پر ظلم کرنے سے بھی نہ چوکا۔ ستمبر ۱۹۷۰ء میں یہودیوں کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کرنے والے تین ہزار فلسطینی مسلمانوں کو اس کے حکم پر گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ فلسطینیوں نے اس مہینہ کو ''سیاہ ستمبر'' کا نام دیا۔ وہ فلسطینی مہاجرین جو اُردن کے مہاجر کیمپوں سے نکل کر مقبوضہ فلسطین (اسرائیل) میں کارروائیاں کرتے تھے یا اسرائیل کے خلاف مظاہرے کرتے تھے ان پر اس نے اتنا تشدد کیا کہ ان کی آواز کو کچل کر رکھ دیا۔ اس کی انہی خدمات کے اعتراف میں دنیا بھر کے چوٹی کے پانچ متعصب یہودی اور عیسائی سربراہان مملکت سمیت کئی کافر حکمرانوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی اور اسے برے انجام کی طرف رخصت کیا۔

فلسطینی مسلمانوں نے اسے بُرے القاب دے رکھے تھے مگر اسرائیل نے اس کے نام پر ایک سڑک کا نام رکھا جو غدّاران ملت کے لیے جہنم کی طرف رہنمائی کرتی رہے گی۔ آج کل اس کا لڑکا شاہ عبداللہ حکمران ہے۔ اس کی ماں برطانوی عیسائی ہے۔ شاہ حسین کی دو بیویاں تھیں، ایک امریکی یہودی اور دوسری برطانوی عیسائی۔ اس سے بھی یہود و نصاریٰ کے ساتھ قریبی رابطوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شاہ عبداللہ کی تربیت خصوصی طور پر غیر اسلامی انداز

میں کی گئی ہے اور یہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ سب کچھ کر رہا ہے جس سے فلسطینی مسلمانوں کے زخم ہرے ہوتے رہیں اور انہیں اپنے پڑوس سے کوئی مدد نہ مل سکے۔ دیکھیے کب قدرت کا دستِ انتقام حرکت میں آتا ہے اور یہ خاندان اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

داستان فلسطین فروشوں کی

ایک سنسنی خیز تحقیق پہلی بار منظرِ عام پر

یہ فروری ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ جدہ میں متعین امریکی سفیر ولیم ایڈی کو ''انتہائی خفیہ اور اہم'' کے عنوان سے ایک پیغام ملا۔ اس میں کہا گیا تھا امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ سعودی حکمران شاہ عبدالعزیز سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اس کا انتظام کیا جائے۔ اس ملاقات کا وقت اور جگہ کسی کو معلوم نہ تھی۔ ایک سے زیادہ وجوہ کی بنا پر ان دونوں سربراہوں کی اس بیٹھک کو اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ جدہ میں ملاقات کے انتظام کا علم صرف پانچ افراد کو تھا۔ شاہ عبدالعزیز، سعودی وزیر خارجہ، امریکی سفارت خانہ کا ٹائپسٹ، امریکی سفیر اور اس کی بیوی۔ امریکی سفیر نے رابطے شروع کر دیے۔ سفارتکاری کی ڈوریاں ہلائی جانے لگیں۔ مشکل یہ تھی کہ یہود نواز عیسائی مملکت کا صدر سعودی سرزمین پر نہ آ سکتا تھا کیونکہ اس وقت عرب کے مسلمانوں کو آسائش و آرائش اور آرام کوشی میں مبتلا کر کے غیرت ایمانی سے محروم نہ کیا گیا تھا، خصوصاً شہروں سے دور رہنے والے عرب قبائل اس بات کو قطعاً برداشت نہ کر سکتے تھے کہ سرزمین اسلام پر کسی ایسے مسلم دشمن حکمران کے قدم پڑیں جنہیں ہزاروں برس پہلے یہاں سے جلا وطن کیا گیا تھا۔ دوسری طرف شاہ عبدالعزیز اس سے قبل کسی بیرونی دورے پر نہ گئے تھے۔ یہ ان کی کسی غیر مسلم ملک کے سربراہ سے پہلی ملاقات تھی اور اسے امریکا کے رقیب برطانیہ کے جدہ میں موجود خفیہ اہلکاروں سے چھپانا بھی مقصود تھا (اگرچہ بعد میں ان دونوں ملکوں نے رقابت ختم کر کے مل بانٹ کر کھانے پر ایکا کر لیا تھا) چنانچہ اس ملاقات کے لیے سمندر کی وسعتوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

شاہ عبدالعزیز کی عادت تھی کہ وہ سال میں ایک مرتبہ جدہ آیا کرتے تھے۔ اس دوران یہاں کی انتظامیہ سے ملاقات کے علاوہ فقراء و مساکین میں امداد بھی تقسیم کرتے تھے چنانچہ ان کی آمد سے قبل اعلان کیا گیا کہ امریکا کا جنگی بحری جہاز ''میرفی'' بندرگاہ پر لنگر انداز ہو رہا ہے۔ میرفی کے اس دورے کو خیرسگالی کے تحت کیا جانے والا عام دورہ ظاہر کیا گیا جبکہ اس سے پہلے کوئی امریکی جنگی جہاز جدہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز نہ ہوا تھا۔ جہاز کی واپسی کا اعلان ۱۲/ فروری کو کیا گیا اور اس سے ایک دن پہلے یعنی ۱۱/ فروری ۱۹۴۵ء کو اس جنگی جہاز کا کپتان اور فرسٹ آفیسر، شاہ عبدالعزیز سے جدہ میں واقع ان کے محل میں ''سلام'' کرنے گئے اور اس دوران روانگی کی تمام تفصیلات طے پا گئیں۔ اسی دن امریکی سفیر نے جہاز کے عملے کے علاوہ جدہ میں مقیم ۱۴۵ امریکی باشندوں کو الوداعی عشائیہ دیا اور جہاز کی واپسی مشتہر کر دی گئی۔ دوسری طرف شاہ کی طرف سے دو شہزادوں کے ساتھ سفر کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ جہاز کی روانگی والے دن شاہی محل سے اعلان ہوا کہ شاہ مکہ مکرمہ واپس جا رہے ہیں۔ شاہی قافلے کی گاڑیاں محل سے مکہ مکرمہ واپسی کے لیے نکلیں لیکن راستے میں انہیں اچانک حکم دیا گیا کہ بندرگاہ کی طرف چلیں، ساتھ ہی شاہ نے ولی عہد شہزادہ سعود بن عبدالعزیز کو ٹیلی گرام روانہ کیا کہ وہ تاحکم ثانی ملک کا نظم و نسق سنبھالیں اور شہزادہ فیصل بن عبدالعزیز (جو بعد میں شاہ فیصل کے نام سے سعودی عرب کے فرمانروا اور عالم اسلام کی مقبول شخصیت بنے اور ان کی انقلابی نظریات کی وجہ سے دشمنانِ ملت نے عربستان پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے انہیں شہید کروایا) کو بلا کر ملک سے باہر جانے کے بارے میں مطلع کیا اور انہیں حجاز میں نظم و نسق برقرار رکھنے کی ہدایات دے کر ایک فہرست حوالے کی جس میں ان کے ساتھ جانے والوں کے نام تھے۔ امریکی سفیر کو ''اوپر'' سے ہدایات ملی تھیں کہ بادشاہ کے ہمراہ وفد بہت محدود ہونا چاہیے۔ چار صاحب حیثیت افراد اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ آٹھ محافظ اور خدمت گاروں یعنی بادشاہ کے علاوہ کل ۱۲ افراد، مگر جب بادشاہ کا قافلہ بندرگاہ پر پہنچا تو اس میں ۴۸ افراد، ۱۰۰ بکریاں اور منوں کے حساب سے سبزیاں اور خوراک وغیرہ تھی۔ شاہ کا ارادہ اپنے امریکی مہمانوں کی ضیافت کا

تھا مگر جہاز کے کپتان کمانڈر کیٹنگ نے شاہ کے نمایندے وزیر مالیات شیخ عبداللہ السلیمان کو بتایا کہ بحری جہاز پر مخصوص قواعد کے تحت منظور شدہ غذا دی جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کی سزا قید ہے۔شاہ نے اس کی رعایت کی اور صرف ۷ بکریاں جہاز پر چڑھائی گئیں۔

شاہ عبدالعزیز کے پہنچتے ہی میرفی نے ساحل چھوڑ دیا اور نہر سوئز کی طرف روانہ ہو گیا۔ ۱۲ فروری ۱۹۴۵ء کو شام ساڑھے چار بجے کا وقت تھا، سورج سمندر کے کنارے اُفق کی طرف جھک چلا تھا، جہاز کے مسافر جنگی آلات کے مشاہدے اور سیر و تفریح سے لطف لے رہے تھے، مگر کسے خبر تھی کہ اس سفر کا اختتام کچھ ایسے معاہدوں پر ہوگا جو عالم اسلام کو اپنے حریفوں سے کئی سو سال پیچھے دھکیل دیں گے۔ بادشاہ کے ہمراہ ان کے بھائی شہزادہ عبداللہ، دو بیٹے شہزادہ محمد بن عبدالعزیز اور شہزادہ منصور بن عبدالعزیز کے علاوہ ان کا معالج، خصوصی مشیر اور فلکی ماہر ماجد بن حیقلہ بھی تھا جو نماز کے وقت قبلہ کی سمت نکال کر دیتا تھا۔ یہ ایک عجیب ستم ظریفی رہی ہے کہ سعودی حکمران نماز، تلاوت اور حرمین کی خدمت کا اہتمام تو خوب کرتے ہیں لیکن اس بات سے غافل رہتے ہیں کہ شعائر اللہ کی تعظیم ان کے احترام سے زیادہ ان کے تحفظ میں مضمر ہے اور یہ تحفظ جہاد فی سبیل اللہ کی بہتر سے بہتر تیاری کے بغیر ناممکن ہے۔ اب اس بات کو دیکھ لیجیے کہ جہاز کے عرشے پر فلکی ماہر کی رہنمائی سے نماز ادا ہو رہی تھی جبکہ جہاز کے اندر میٹنگ روم میں مسلمانوں کی شہہ رگ کفار کے انگوٹھے تلے دینے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ بحر احمر کی لہروں پر جہاز کا یہ سفر دو رات اور ایک دن جاری رہا۔ جس وقت جدہ سے یہ جہاز روانہ ہو رہا تھا اس وقت مالٹا کی بندرگاہ سے ایک اور جہاز روانہ ہو رہا تھا۔ خصوصی طور پر تیار کیے گئے ''کوئنسی'' نامی جہاز میں امریکی صدر روز ویلٹ سوار تھا۔ میرفی میں مسلمانوں کے بادشاہ کی طرف سے امریکی افسروں کی ضیافتیں ہو رہی تھیں، جہاز کے ہوادار عرشے کی پُر لطف فضا میں خالص عربی انداز میں قالین بچھا کر دستر خوان بچھے تھے اور گپ شپ کی محفلیں سج رہی تھیں۔ خدام خاص عربی ڈشیں تیار کر رہے تھے جو فرحت بخش ہوا میں بیٹھ کر بے فکری کے ساتھ تناول فرمائی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف امریکی صدر کے جہاز کی دیواروں پر نقشے لگے ہوئے تھے، میزوں پر

رپورٹیں دھری تھیں، یہودی ریاست کی تشکیل کے خواہش مند امریکی صدر سعودی فرمانروا سے کی جانے والی گفتگو کے نکات پر اپنے مشیروں سے بحث و مشورہ کر رہے تھے۔ فریقین کی جو ذہنی حالت اور عمومی رویہ اس وقت تھا آج بھی تقریباً ویسے ہی ہے۔ ایک مکمل بے فکری اور آرام طلبی کی کیفیت میں تھا اور دوسرا مکمل چوکس اور بیدار مغزی کی حالت میں۔ اس چیز نے اُمّت مسلمہ کو خون کے آنسو رُلا رکھا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اب مسلمانوں کے پاس رونے کے آنسو رہے ہیں نہ بہانے کو خون، فقط حسرتیں ہی حسرتیں ہیں۔

۱۴/ فروری ۱۹۴۵ء کو صبح دس بجے میرفی اور کوئنسی دونوں طے شدہ مقام پر پہنچ گئے۔ دونوں جہازوں کے چاروں طرف فوجی کھڑے ہو گئے۔ ایک عارضی پل کے ذریعے دونوں جہازوں کو جوڑا گیا اور ''جلالۃ الملک'' اپنے دونوں صاحبزادوں کے ہمراہ امریکی صدر کے جہاز پر تشریف لے گئے۔ یہ خصوصی، اہم اور خفیہ ترین ملاقات ایک گھنٹہ دس منٹ جاری رہی۔ اس کے موضوعات کے متعلق کچھ کچھ باتیں تو اب منظر عام پر آ گئی ہیں اور مشرق وسطیٰ پر تحقیق کرنے والے مصنفین نے ان کو ڈرتے ڈرتے محتاط انداز میں نقل کیا ہے۔ اگر اس سارے موضوع کو کوئی چند لفظوں میں سمیٹنا چاہے تو وہ یوں ہوں گے: ''فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے حوالے سے سعودی فرمانرواؤں کو جکڑنا، ان کے پاس موجود تیل کی خداداد دولت پر تسلط پانا اور عربوں کی اس سے ہونے والی آمدنی کو عسکری ترقی کی بجائے سامان عیش و عشرت پر خرچ کروانا۔'' مجموعی طور پر پانچ گھنٹے اس جہاز پر رہنے کے بعد جب شاہ عبدالعزیز واپس ہوئے تو انہوں نے جہاز کے عملے میں تحفے تقسیم کیے۔ افسران کو ایک ایک گھڑی اور چھوٹے عملے کو ۱۵، ۱۵ پاؤنڈ دیے۔ یہ ان کی طبعی شرافت اور مہمان نوازی تھی لیکن انہیں کیا خبر کہ یہود کی خباثت ایسی شریفانہ روایات کا لحاظ نہیں رکھتی۔ آخر میں امریکی سفارت کار ولیم ایڈی اور سعودی نمایندے یوسف یاسین نے ایک مشترکہ بیان تیار کیا۔ اس پر جانبین کے دستخط ہوئے اور جب صدر روز ویلٹ کا جہاز نہر سوئز سے گزر کر پورٹ سعید سے آگے جا رہا تھا اور برطانوی خفیہ ادارے کے اہلکار ملاقات کے نتیجے کی سن گن لینے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے، اس وقت

یہود کی بدنام زمانہ تنظیم ''فری میسن'' کے قاہرہ میں واقع دفتر میں..... جوان کا ہیڈکوارٹر بھی تھا..... کامیابی کے جام ٹکرائے جا رہے تھے اور صہیونی ریاست کی تشکیل کا اہم مرحلہ طے ہو جانے پر یہودیوں کے ''بزرگ رہنما'' خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں یہ ملاقات ہوئی اور صرف دو سال بعد ۱۹۴۸ء میں دنیا کے نقشے پر صہیونی ریاست اُبھر کر آ گئی جو گزشتہ تین ہزار سال میں پیش آنے والا انوکھا واقعہ ہے۔ انوکھا اس واسطے کہ یہود پر بحکم الٰہی ذلت وخواری کی مُہر لگ چکی تھی پھر بھی انہیں ایک ملک مل گیا۔ یہ آخر کس طرح ممکن ہوا؟ خود قرآن کریم بتاتا ہے: ''إلا بحبل من الله وحبل من الناس'' یہود نے کسی حد تک تکبر وشرارت چھوڑ کر گریہ وزاری شروع کی اور دنیا میں طاقت کے دھارے کا رخ پہچان کر خود کو اس میں اس طرح ضم کیا کہ اس کو اپنی مرضی کے تابع کر لیا جبکہ مسلمانوں نے باہمی اختلاف ومفاد پرستی کو اپنا شعار بنایا، طاقت کے حصول سے غافل ہوئے، چھاؤنیوں میں اسلحہ جمع کرنے کی بجائے بیڈ روموں میں فرنیچر اور باتھ روموں میں ٹائلیں سجانے لگے، چنانچہ خود اپنے اوپر اس ذلت کو مسلط کر لیا جو یہود کے لیے لکھی گئی تھی۔ ہوا یوں کہ سعودی عرب نے فلسطین کے ساتھ لگنے والی اپنی سرحد کو پیچھے ہٹا لیا تا کہ وہ فلسطین کے پڑوسیوں میں شمار ہی نہ ہو، نہ اس کی طرف سے فلسطینیوں کو امداد جائے نہ فلسطینی مہاجرین پناہ لینے جلالۃ الملک ''ظل الٰہی'' کے سائے میں آ سکیں۔ جدید دنیا کی تاریخ میں ایسا نہیں ہوا کہ کوئی ملک چپکے سے اپنا حصہ کاٹ کر کسی کو دے دے، مگر سعودی عرب کے بہادر فرمانرواؤں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا اور فلسطین سے ملنے والا سرحدی علاقہ اُردن کے سپرد کر کے خود پیچھے ہٹ آئے تا کہ نہ مسلمانوں کی طرف سے کوئی ان کو غیرت دلائے نہ یہودیوں کے سرپرستوں کی ناراضی مول لینی پڑے۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

واپسی میں جدہ کی بندرگاہ پر جلالۃ الملک کو قدم رکھے کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ راتوں رات ''المملكة العربية السعودية'' کا نقشہ تبدیل ہو گیا اور تبوک سے آگے کے سرحدی علاقے ''المملكة الهاشمية الأردنية'' کے حوالے کر دیے گئے جس کے

فرمانروا اعلیٰ حسب ونسب کے مالک نجیب الطرفین ہاشمی ہیں۔

بعض حضرات جزیرۃ العرب کے احوال کے اس رخ کو سامنے لانے پر معترض ہوتے ہیں کہ اس سے عرب حکمرانوں کے احترام میں کمی آتی ہے۔ بندہ عرض گزار ہے کہ ہم تو صرف ''اظہار حقیقت'' کے مجرم ہیں۔ آگے اہل اسلام کی مرضی ہے کہ ان دل سوز حقائق کو جس پہلو سے چاہیں لیں، جس رنگ کی عینک سے چاہیں دیکھیں اور جس معنی میں چاہیں سمجھیں۔ اگر کوئی شخص سلامت طبع کے بغیر مروارید بھی کھائے تو وہ زہر ہلاہل بن جاتی ہے۔ اگر کسی کے دل ودماغ پر ان مضامین سے اُمت کے مستقبل کی فکر کی بجائے کوئی اور تاثر چھا جاتا ہے تو اس کے لیے سلامتی فکر کی دعا کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

کھیلا کی کہانی

نئے یروشلم کی طرف:

امریکا میں یہودیوں کی تاریخ کا آغاز کرسٹوفر کولمبس سے ہوتا ہے۔ یہودیوں نے سقوطِ غرناطہ سے پہلے ہی خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور انہیں احساس ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی خلافت کا سایہ ہٹنے کے بعد عیسائی ان کی بوٹیاں کچر کچر کرکے نوچیں گے۔ مشہور امریکی صنعت کار اور مصنف ہنری فورڈ نے اپنی کتاب "The InterNational Jew" میں لکھا ہے: ''کولمبس کے ارادوں کی بھنک پا کر یہودیوں نے اس سے میل جول خوب بڑھا لیا تھا اور اس کے ساتھ جانے والے ہمراہیوں میں ایک گروہ یہودیوں کا بھی تھا۔'' اندلس کے مشہور یہودی عالم اور شاعر یہودا حلیوی (Judah Halevi) نے بدنام زمانہ یہودی تاویل وتحریف سے کام لیتے ہوئے ملتِ یہود کو اجازت دے دی تھی کہ وہ دنیوی مصائب سے بچنے اور اپنا دین بچانے کے لیے اپنا مذہب پوشیدہ یا تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے لیے بدترین دشمن سے تعلقات قائم کرنا بھی مشکل نہ رہا تھا۔ یہ کسی بھی مذہب والوں سے بڑھ کر مذہبی بن جاتے اور انہیں شیشے میں اتار لیتے تھے چنانچہ کولمبس سے جلد ہی ان کا یارانہ لگ گیا۔ انہیں اس وقت ''ارضِ نجات'' اگر کوئی دکھائی دیتی تھی تو وہ یہی ''بحرِ ظلمات'' کے پار کی دنیا تھی۔ اس ناقابلِ عبور سمندر کے اِس طرف کی دنیا میں تو وہ اپنی حرکتوں کے سبب ہر جگہ دھتکار دیے گئے تھے اور سمٹتے سمٹتے اس کے کنارے آ پہنچے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں کئی شواہد ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کو اس بحری مہم سے جو سقوطِ غرناطہ کے بعد مسلمانوں کے بحری

تجربات سے فائدہ اٹھا کر روانہ ہو رہی تھی، خصوصی دلچسپی تھی۔ پہلا تو یہ کہ اس بحری سفر کے اخراجات کے لیے بدنام زمانہ یہودی سودی سرمایہ کام آیا تھا، ملکہ ازابیلا کے جواہر فروخت کر کے اس بحری سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی روایت محض افسانہ ہے۔ دوسرا یہ کہ نئی سرزمین کی دریافت کے بعد کولمبس نے جو پہلا خط لکھا وہ ایک سرمایہ دار یہودی کے نام تھا جس نے اس سفر کے لیے کئی ہزار پاؤنڈ فراہم کیے تھے۔ تیسرا یہ کہ لوئی ڈیٹورس نامی پہلا شخص جو ''نئی دنیا'' کے ساحل پر اترا وہ یہودی تھا۔ اس نے تمباکو کا استعمال دریافت کیا، اسے تمباکو کی عالمی تجارت کا ''باپ'' کہا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے آج دنیا میں تمباکو کا سارا کاروبار یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ پہلے پہل یہودی کیوبا اور برازیل میں آباد ہوئے لیکن جب یہاں سے اپنی حرکتوں کے سبب جلد دھتکار دیے گئے تو انہوں نے نیویارک کا رخ کیا کیونکہ وہ شمالی امریکا کا تجارتی دروازہ تھا۔ نیویارک اس وقت ڈچ کالونی تھا۔ یہاں کے مقامی لوگوں نے ان کی آمد کو پسند نہیں کیا تاہم یہودی سرمایہ کا طلسم کام آیا اور ڈچ گورنر پیٹر اسٹائی ویسنٹ نے یہودیوں کو اس پابندی کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی کہ وہ سرکاری ملازمت نہیں کریں گے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ جن لوگوں پر ملازمت کی پابندی لگا رہا ہے وہ اپنی سازشی فطرت کے بل بوتے پر کل اس شہر کے تمام کاروبار اور عہدوں کے مالک ہو جائیں گے۔ الغرض اس گروہ نے امریکا کو ''ارضِ موعود'' اور ''نیویارک'' کو نیو یروشلم قرار دے کر یہودیوں کو یہاں نقل مکانی کی ترغیب دی اور اس طرح نیویارک دنیا کی یہودی آبادی کا بہت بڑا مرکز بنتا چلا گیا۔ انہوں نے اس شہر کی زمین کی ملکیت حاصل کرنا شروع کر دی، اس کی تجارت، سیاست اور انتظامیہ کو اپنے زیر اثر لانا شروع کیا اور اس مقصد کے لیے ''کہیلا'' نامی تنظیم وجود میں آئی۔

اچھی امید کا کنارہ:

کہیلا کی کہانی شروع کرنے سے پہلے مکافاتِ عمل کی ایک تاریخی مثال کا مطالعہ کرتے چلتے ہیں۔ کولمبس نے مسلمانوں کی دریافت کی ہوئی نئی دنیا کی دریافت کا کارنامہ اپنے نام لکھوا لیا لیکن وہ اس ملک کو براعظم کولمبس یا یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کولمبس نہ کہلوا سکا۔ مسلمانوں

کی یہ دریافت اپنے نام کرنے کے باوجود وہ اس اعزاز سے محروم رہا۔ ہوا یوں کہ مسلم ہسپانیہ کے سقوط کے بعد ہسپانیہ کے حریص حکمرانوں نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کے لیے دو ٹیمیں بھیجیں۔ ایک واسکوڈی گاما کی سربراہی میں تھی۔ یہ مہم جب جنوبی افریقہ کے آخری زمینی کنارے کے پاس پہنچی تو اسے سمندر مڑتا ہوا دکھائی دیا۔ انہیں امید پیدا ہو چلی کہ یہ راستہ مڑ کر ہندوستان کو جائے گا۔ لہٰذا اس کا نام...... کیپ آف گڈ ہوپ (عربی میں رأس الرجاء الصالح، اردو میں ''اچھی امید کا کنارہ'' کہہ لیجیے) رکھ دیا گیا۔ جنوبی افریقہ کا یہ کنارہ کرۂ ارض کے جنوب میں خشکی کا آخری سرا ہے اس کے بعد قطب جنوبی تک پانی ہی پانی ہے۔ یہاں بحرِ ہند اور بحرِ اوقیانوس دو سمندر آکر ملتے ہیں اس وجہ سے تلاطم برپا رہتا ہے۔ اس سے قبل ہسپانوی جہاز راں افریقہ کے مغربی کنارے پر واقع ممالک سینیگال، گنی، گمبیا، سیرالیون وغیرہ تک تو آئے تھے لیکن اس سے آگے نہ جاسکے تھے۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ وہ اس کنارے تک آ پہنچے تھے۔ مشہور ہے کہ یہاں پہنچ کر جب انہوں نے سمندر بہت زیادہ خراب دیکھا تو واسکوڈی گاما سے واپس چلنے پر اصرار کیا اور نہ ماننے پر قتل کی دھمکی دی۔ واسکوڈی گاما بڑا کائیاں تھا۔ اس نے بحری راستوں کے نقشے ان کے سامنے پھاڑ دیے اور کہا کہ اب واپسی کا راستہ صرف میرے ذہن میں ہے، تم نے مجھے قتل کیا تو میرے بغیر واپس نہ جاسکو گے حالانکہ یہ راستے اس کے ساتھ جانے والے عرب مسلمان بھی جانتے تھے۔ الغرض اس نے اس طرح سے دنیا کے اس جنوبی کنارے کو پار کیا اور موزمبیق چینل سے گزرتے ہوئے موزمبیق جا پہنچا۔ وہاں سے راشن، خوراک اور جہازوں کی مرمت کا بندوبست کر کے اس نے بحرِ ہند عبور کیا اور ہندوستان کی بندگارہ کالی کٹ جا اُترا۔ یہ ہندوستان کی سرزمین پر غیر ملکی استعمار کا پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد ولندیزی، پھر فرانسیسی اور آخر میں انگریز آدھمکے، آگے کی دل فگار داستان سب کو معلوم ہے۔

امریگو سے امریکا تک:

کولمبس کی بحری مہم کا احوال آپ سن چکے ہیں چونکہ وہ بھی ہندوستان کی دریافت کی مہم پر روانہ ہوا تھا اس لیے جزائر بہاماس اور سان سلواڈور کے پاس پہنچ جانے پر وہ اسے مغربی

ہندوستان کے جزائر (ویسٹ انڈیز) سمجھتا رہا، اس کا خیال تھا کہ ان جزائر کے بعد ہندوستان کا براعظم ہے۔ اس کی اس غلط فہمی سے ان جزائر کا نام تو جزائر الہند پڑ گیا اور آج تک یہی نام چلا آتا ہے مگر امریکا اس کے نام سے موسوم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ان جزائر کو انڈونیشیا اور فلپائن سے ممتاز کرنے کے لیے ''جزائر غرب الہند'' اور انڈونیشیا وغیرہ کو ''جزائر شرق الہند'' کہتے ہیں۔ کولمبس کے پانچ سال بعد ۱۴۹۷ء میں ایک اطالوی بحری مہم جو اور سمندری جغرافیہ دان امریگو واسپوشی سمندر پار پہنچنے کی مہم میں کامیاب ہوگیا۔ یہ شخص لکھاری بھی تھا۔ اس نے واپس پہنچ کر اپنی مہم کے احوال، نئی دنیا کے محل وقوع اور بحری نقشہ جات کے ساتھ قلم بند کیے۔ مہم جوئی کی یہ بحری داستان یورپ میں کافی مقبول ہوئی۔ ۱۵۰۷ء میں مشہور جرمن جغرافیہ دان پروفیسر مارٹن الڈسیمولر نے اپنی مشہور کتاب Cosmographia introduction میں امریگو کو امریکس کے نام سے متعارف کرواتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ چونکہ امریکس نے یہ نئی دنیا دریافت کی ہے اس لیے اس نئے دریافت شدہ براعظم کا نام اس کے نام سے منسوب کر دینا چاہیے۔ اس نے یورپ اور ایشیا کے نسوانی طرز کے ناموں کے مقابلے میں امریکس کے نام پر امریکا تجویز کیا۔ پروفیسر مارٹن کا یہ نظریہ مقبول ہوا اور یوں یورپ میں براعظم کولمبس کی بجائے براعظم امریکا کے نام سے یہ نئی دنیا مشہور ہوگئی۔ کولمبس نے مسلمان جہاز رانوں کی محنت پر اپنی شہرت کا تنبو تاننا چاہا تھا مگر یہ ناانصافی اسے راس نہ آسکی اور وہ مغربی منطقہ حارّہ کی دریافت کو اپنے نام سے منسوب کیے جانے کے اعزاز سے محروم رہا۔ مکافاتِ عمل کی اس روداد کے بعد واپس ''کہیلا'' کی طرف چلتے ہیں۔

دنیا کے بارہ حصے:

''کہیلا'' کے معنی گورنمنٹ کے ہیں۔ یہ یہودیوں کی زیرزمین تنظیم ہے جو جتنی پوشیدہ ہے اتنی ہی طاقتور بھی ہے۔ نیویارک کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اس کا عمل دخل اتنا زیادہ ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں نیویارک کے باشندے غیرمحسوس طریقے سے اس کے پروگرام پر چلتے ہیں اور اس کا پروگرام کیا ہوتا ہے؟ یہود، یہودیت اور یہودی مفادات۔ یہ صرف تنظیم نہیں،

خفیہ حکومت ہے۔ ایسی خفیہ حکومت جس کا ہر لفظ قانون ہے اور ہر عمل یہود نوازی، یہود پروری اور یہود کی سرپرستی کے گرد گھومتا ہے۔ یہ تنظیم امریکا کے سب سے بڑے تجارتی وسیاسی مرکز میں بیٹھ کر امریکی رجحانات اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے ایسے طور طریقے اختیار کرتی ہے کہ ان کا مطالعہ کرنے والا انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اس نے امریکی طرزِ معاشرت، امریکی فکر اور امریکی سیاست کو اس قدر اپنا تابع بنا لیا ہے کہ یہ سب چیزیں یہودیت زدہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ امریکی معاشرے کی کسی چیز کی اپنی کوئی انفرادیت باقی نہیں رہی ہے۔ یہودیوں کے بڑوں نے نیویارک کو چھوٹے چھوٹے بارہ ٹکڑوں میں اور پورے امریکا کو بارہ حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ہر ٹکڑے اور حصے کا سربراہ ایک طاقتور اور بااثر یہودی ہے۔ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کے ۱۲ بڑے یہودیوں کی نگرانی میں ۱۲ قبیلے اور ہر قبیلے کا ایک الگ سردار بنایا گیا تھا) امریکا پر غلبہ پانے کے بعد انہوں نے پوری دنیا کو بھی بارہ بڑے یہودیوں کی نگرانی میں بارہ حصوں میں تقسیم کر دیا اور نیویارک کو تمام دنیا کا مرکز مان کر اسے یہودی دارالخلافہ قرار دے دیا۔ آج کل کے باخبر امریکی بھی نہیں جانتے کہ اگرچہ ان کے ملک کا دارالحکومت واشنگٹن ڈسٹرکٹ آف کولمبیا (واشنگٹن ڈی سی) ہے لیکن ان کے ملک میں ایک قوم ایسی بھی رہتی ہے جو نیویارک کو اپنا دارالحکومت مانتی ہے اور اس قوم کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے افراد نیویارک کو (جو فلسطین میں واقع اصل یروشلم تک رسائی سے پہلے یہودیوں کے لیے نیو یروشلم تھا) اس طرح احترام سے دیکھتے ہیں جیسے کیتھولک عیسائی روم (ویٹی کن سٹی) کو اور مسلمان مکہ معظمہ کو۔ ریاست کے اندر ریاست کی اصطلاح مشہور تو بہت ہے لیکن اگر کوئی اس کی عملی مثال دیکھنا چاہے تو نیویارک کو دیکھے کیونکہ یہ ریاست کے اندر ریاست بلکہ عالمی ریاست کا کھلا نمونہ ہے۔ لفظ کہیلا کے معنی گورنمنٹ کے ہیں اور یہود نے خفیہ گورنمنٹ بلکہ سپر گورنمنٹ قائم کر کے اس لفظ کی معنویت کو پوری شدت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔

یہودیوں کی یہ خفیہ تنظیم "زیرِ زمین ندی" (Underground River) کی طرح ہے اور یہودیت پر تحقیق کرنے والے ماہرین اسے یہودیوں کی اعلیٰ ترین تنظیم زنجری (Zinjry) کا

مضبوط ترین عضو قرار دیتے ہیں۔ یہ ''زنجری'' بین الاقوامی صہیونی یہودیت (Zionist International Jewry) کا مخفف ہے۔ یہ صہیونیت کے بڑے دماغوں پر مشتمل وہ اعلیٰ ترین باڈی ہے کہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہزاروں یہودی تنظیمیں اس کے ماتحت کام کرتی ہیں۔

یہودن عورتوں کے شوہر:

یہاں پر قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ذلت کے مارے یہود کو اس قدر عروج کیسے مل گیا کہ وہ پس پردہ رہ کر سپر پاور کی ڈور کھینچتے اور ڈھیلی چھوڑتے ہیں؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں ''کتاب حقیقت'' کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو ہمارے اور خالق کائنات کے درمیان رابطے کے دو مستند ذرائع میں سے پہلا ذریعہ ہے اور کائنات کے حقائق کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ اللہ پاک نے قرآن کریم میں یہود کی ذلت کے جو اسباب بیان فرمائے تھے، لگتا ہے صدیوں تک زمانے بھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد انہوں نے ان کا کسی حد تک تدارک کیا ہے اور افسوس ہے کہ مسلمانوں نے صدیوں تک ان ملعون صفات سے بچنے کے بجائے اب ان کو مکمل طور پر اپنا لیا ہے...... لہٰذا نتیجہ کائنات پر نتائج برعکس پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً ایک سبب یہ تھا کہ یہود میں اتفاق نہیں، مگر اب یہودیوں کا حال یہ ہے کہ عملاً سب یہودی ایک، اور ان کی تمام تنظیمیں متحدہ مقاصد کے حصول کے لیے یکجان ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات ان میں اتنا تعلق اور تعاون نہ رہے مگر غیر یہود سے ان کی نفرت ہر حال میں قائم رہتی ہے اور یہی چیز انہیں متحد رکھنے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ان کی مرکزی تنظیموں اور دانشوروں کے دستور میں ایک بات یہ بھی شامل ہے کہ وہ یہودی عوام یا یہودی تنظیموں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کروائیں اور انہیں باہم دست و گریباں ہو کر اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف خرچ کرنے سے بچائیں۔ خدا لگتی کہیے! یا مسلمانوں میں بھی ایسا کوئی نظم موجود ہے؟ قرآن کریم نے یہود کے بارے میں جو فرمایا تھا: ''تم انہیں متحد سمجھتے ہو مگر درحقیقت ان کے دل جدا ہیں۔'' یہ آیت آج ہم پر صادق آتی ہے یا یہود پر؟ پھر اگر کوئی معاملہ ایسا ہو جو ان تنظیموں کے بس میں نہ رہے تو فریقین متفقہ طور پر کسی ایک بزرگ یہودی

شخصیت کو اپنا ثالث تسلیم کر لیتے ہیں جیسے کہ مصر کے صدر انور سادات کی یہودن بیوی، جہاں سادات کو یہود کی دو بڑی تنظیموں کے مشہور زمانہ اختلاف کے وقت متفقہ طور پر ثالث تسلیم کر لیا گیا تھا۔ (یہودی بیویاں رکھنے والے مسلم اور غیر مسلم حکمرانوں مثلاً یاسر عرفات، شاہ حسین، عمران خان[1] وغیرہ کی فہرست اور کارنامے ایک مستقل مقالے کا موضوع ہیں۔ ہمارے تحقیق کار اس پر دلجمعی سے کام کریں تو دنیا کے سامنے حیرت انگیز انکشافات ہوں گے)

وادیٔ طور میں گریہ وزاری:

قرآن شریف کے مطابق ان کی پسماندگی اور خواری کا ایک سبب بُخل تھا۔ آج کا یہودی...... اجتماعی مقاصد کے لیے خرچ کرنے والوں میں سب سے آگے ہے اور یہودی تنظیموں کو سرمائے کی کمی کبھی بھی مسئلہ نہیں رہی۔ اس میدان میں اگر کوئی پیچھے ہے تو مسلمان کہ دینی اداروں اور تنظیموں کو سب سے بڑا اور گھمبیر مسئلہ مالیات کے حوالے سے ہوتا ہے۔

یہودیوں کے خوار ہونے بلکہ خواری میں ضرب المثل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بزدل اور کم حوصلہ تھے۔ بزدل تو وہ آج بھی ہیں لیکن ان کے حوصلے کو دیکھیے کہ خدائی سزا کے طور پر مسلط کردہ اقوام کے ہاتھوں صدیوں تک مار کھانے کے بعد پھر اپنے مقرر کردہ راستے پر چلنا شروع ہوگئے ہیں۔ وہ ذلت کا طویل دور گزارنے کے باوجود ذہنی الجھاؤ یا بے حوصلگی کا شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنا مقصد ایسا معین اور ذہن ایسا صاف رکھا ہے کہ ہر افتاد کے بعد جرأتمندانہ قدم اٹھا لیتے ہیں۔ اے میری قوم! کیا تجھ سے ایسا نہیں ہوسکتا؟ کیا ہم یہود کو دیکھ کر بھی غیرت نہ پکڑیں گے؟؟؟

ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اللہ اور اس کے پیغمبروں کے گستاخ و بے ادب تھے اور پھر بھی خود کو اللہ کا بیٹا اور محبوب سمجھتے تھے۔ قرآن شریف میں ان پر لگائی گئی ''مُہرِ جباریت'' سے نکلنے کا

---

(۱)......اب خان صاحب نے اپنی یہودی بیوی جمائما کو طلاق دے دی ہے۔ یہ خاتون یہودیوں کے دس بڑے آدمیوں میں سے ایک، سر جیمز گولڈ سمتھ کی بیٹی تھی۔

ایک راستہ "اِلّا بحبل مّن اللّٰہ" تھا، یعنی اللہ تعالیٰ سے کسی نوع کا تعلق ورشتہ، (اس آیت میں بہت غور وفکر کے بعد ذہن اسی مطلب کی طرف جاتا ہے۔ قبول جزیہ کی تفسیر کو دل اس لیے نہیں مانتا کہ یہ تو خود بدترین ذلت ہے، اس کا ذلت سے استثناء کیسے درست ہوگا؟ اہلِ علم رہنمائی فرمائیں تو انتہائی مشکور ہوں گا) اور ندامت وپشیمانی سے بڑھ کر انسان کا اللہ تعالیٰ سے رشتہ اور کیا ہوگا؟ آج دیوارِ براق کے نزدیک اور صحراء سینا میں واقع وادیٔ طور میں یہودیوں کے اجتماعات کے دوران ان کی گریہ وزاری کو کوئی دیکھے تو تعجب ہوتا ہے، دوسری طرف شبِ قدر میں مسلمانوں کی غفلت اور دنیا میں مشغولیت ملاحظہ کر کے سینہ پھٹنے لگتا ہے۔

نظریۂ دائمی جدلیت:

ممکن ہے قارئین یہ سوال کریں یہود کے اتنے تذکرے اور قصہ خوانی سے کیا مقصد ہے؟ اس کا جواب بھی قرآن کریم سے ملتا ہے کہ مسلمانوں کو دو گروہوں سے ابدی اور دائمی دشمنی کا سامنا رہے گا (سورۂ مائدہ: آیت نمبر ۸۲) یہ دو گروہ یہود اور ہنود ہیں، ان سے مسلمانوں کی عظیم معرکہ آرائی نوشتۂ تقدیر ہے، جسے آپ تیسری یا آخری جنگِ عظیم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور انہی دو سے لڑنے والوں کو صحیح حدیث شریف میں عظیم بشارتیں دی گئی ہیں لہٰذا مسلمانوں کو ہمہ وقت ان کی نفسیات، منصوبوں اور کارکردگی پر نظر رکھنے اور ان سے معرکے کی تیاری کیے بغیر چارہ نہیں۔ افسوس کہ یہودیوں نے مار کھانے کے بعد خود کو سنبھال لیا مگر مسلمان کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ یہود تو جھوٹے مسیح دجّال کے ظہور کے لیے جملہ شرائط پوری کر کے اس کے ظہور کے منتظر ہیں حالانکہ وہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اس انجام کا شکار ہوں گے جو دجّال کے لیے مقدر ہے مگر مسلمان سچے مسیح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام (جن کے ہاتھ پر تمام عیسائی مسلمان ہو کر مسلمانوں کے ساتھ ہو جائیں گے بلکہ وہ یہود بھی جو دجّال کے لشکر سے نکل آئیں گے ان کے مبارک ہاتھ پر مسلمان ہو جائیں گے) کی ہمراہی کے لیے اپنے اعمال کی درستگی اور معرکۂ عظیم کی تیاری سے غافل ہیں۔ ان احوال کو دیکھ کر لگتا ہے اللہ تعالیٰ ہمارے علاوہ کسی اور کو مسلمان بنا کر کھڑا کریں گے جو اس کے نیک بندوں کی ہمراہی کا حق ادا کریں اور ہم یونہی منہ تکتے رہ جائیں۔

"اور اگر تم (اپنے عہد سے) پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لا کھڑی کرے گا جو تمہاری طرح نہ ہوں گے۔"

روم سے تل ابیب تک

بعض حضرات کو شکوہ ہے کہ امریکا کی اسلامی ممالک کے خلاف کارروائیاں مذہبی بنیاد پر نہیں، نہ اسے اسلام سے کوئی دشمنی ہے، اسے تو کرۂ ارض کے وسائل پر قبضے کا ہوکا ہے۔ یہ وسائل اگر ہندوستان یا بدھ مت یا کسی بھی دوسرے مذہب کے ماننے والوں میں سے کسی کے پاس ہوتے تو ان کے خلاف اس کی گرما گرمیاں اسی نوعیت کی ہوتیں جیسی کہ ہمارے ہاں سندھ کے پتھایداروں کی سیٹھوں اور سرمایہ داروں کے خلاف ہوتی ہیں، لہٰذا امریکی اقدامات کو مذہبی تعصب کے تناظر میں دیکھنا شدت پسندی ہے۔ ایسے حضرات کا خیال ہے کہ امریکا محض سامراجی استعمار کی بدترین صورت ہے، اسے اس سے زیادہ کچھ سمجھنا درست نہیں۔ ان حضرات کی خدمت میں ہم دس مئی کی شام کو روم میں ہونے والے ایک اجلاس کی روداد پیش کرنا چاہیں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ ازراہ کرم اب تبصروں سے آگے بڑھ کر اپنی اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کے لیے کچھ کرنا بھی شروع کر دیجیے۔ تنظیم اور طاقت کے حصول کے بغیر زبانی کلامی دانشوریاں اس قوم کو کہیں لے نہ ڈوبیں۔

ہم لوگوں میں افراط و تفریط اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ایک طرف خوش فہم دانش ور ہیں جو محض اس بات پر بھی خوش ہیں کہ امریکا کم از کم مذہبی اعتبار سے تو ان کا دشمن نہیں، دوسری طرف برادرانِ اسلام کا سب سے دلچسپ مشغلہ یہ رہ گیا ہے کہ حضرت مہدیؒ کا انتظار کریں، ان کی آمد کی علامات کو کتابوں میں تلاش کریں اور ان کے ظہور کی مدت کا تخمینہ لگا لگا کر اس کی صحت کے قرائن بیان کریں۔ یہ اشتیاق اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس مرتبہ اگر حج کے موقع پر کوئی اول

جلول مجہول سا شخص بھی کھڑا ہو کر مہدویت کا دعویٰ کر دیتا تو آدھے حاجی صاحبان نے اسے تسلیم کر ہی لینا تھا حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر حضرت مہدی ظاہر ہوتے ہیں تو کیا ان کے ساتھ مل کر جہاد کی فضیلت، کام چوروں، آرام پسندوں، گھر بیٹھ کر تماشا دیکھنے کی عادت بنانے والوں کو حاصل ہوگی یا یہ عظمت اور عزت، اجتماعی مقاصد کے لیے قربانی دینے والوں اور گناہوں سے توبہ تلافی کر کے اسلام کی سربلندی کے لیے پرعزم لوگوں کے حصے میں آئے گی، جن لوگوں کو سستی و کاہلی، بدنظمی و بدعنوانی کی عادت پڑ گئی ہے وہ حضرت کے ظہور کے بعد گھٹنوں کے بل ایسے پڑے رہ جائیں گے جیسے حضرت طالوت کے ساتھ جانے والے بنی اسرائیل کے رجائیت پسند عناصر دریائے اردن کا پانی پیٹ بھر کر پیتے ہی بدحال ہو کر جہاں تہاں گرے پڑے رہ گئے تھے۔ ہم لوگوں کے اخلاقی زوال کا یہ حال ہے کہ اعلیٰ درجہ کے دین دار سمجھے جانے والے لوگ بھی کم علمی یا تربیت کے فقدان کے سبب کسی نہ کسی حوالے سے بدعنوانی کے مرتکب ہیں اور ایسے تو بہت ہی کم ہیں جنہوں نے یہ عہد کر رکھا ہو کہ وہ اپنے علم اور ارادے سے گناہ نہیں کریں گے...... لیکن ساتھ ہی خوش کن تمناؤں اور خیالی آرزوؤں کی بلند پروازی کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص کچھ کیے بغیر حضرت مہدی کے ہاتھ چوم کر سرخ رو ہونے اور ان کے جھنڈے کے قریب سے قریب ہو کر شخصیت پرستی کے ارمان نکالنے کا شوق دل میں پالے ہوئے ہے۔ کیا قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کو کرامات کے طور پر فتوحات نصیب ہوئی تھیں؟ اگر نہیں تو آج دنیا پرستی میں لت پت ہو کر اس کی تمنا کیسے کی جا سکتی ہے؟ حضرت مہدی کی آمد اپنے وقت پر ہو کر رہے گی، ہمیں سارا کام ان پر چھوڑنے کی بجائے وہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کے ہم مکلّف و مامور ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اعلان جہاد کے وقت ہم امیر کی شرط پورے ہونے کے بعد کسی اور شرط کی تلاش شروع کر دیں جو ہماری بربادی تک پوری ہو کر نہ دے۔

۱۰ مئی ۲۰۰۳ء کی شام روم کی ایک مرکزی شاہرہ پر واقع مشنری ہال میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ آج یہاں امریکا و برطانیہ کے سرکاری پادریوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے ان صلیبی مذہبی رہنماؤں کا خصوصی اجلاس تھا جو ''پولیٹیکل پادری'' کہلاتے ہیں۔ ان کو

سرکاری طور پر مذہبی تعلیم دیکر اس غرض کے لیے تیار کیا جاتا ہے کہ یہ موقع پڑنے پر مذہب کا استعمال کر کے استعمار کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کریں گے۔ اس اجلاس میں ان پانچ ہزار عیسائی رضا کاروں کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا جو بغداد سمیت عراق کے مختلف شہروں میں سرگرم ہیں اور باہر سے آنے والی امداد کو جنگ زدہ اور تباہ حال مسلمانوں میں تقسیم کر کے ان کے دل جیتنے اور صلیب کا گرویدہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی سرتوڑ کوشش ہے کہ عراق کے مسلمانوں کو باور کرایا جائے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دل تمہاری ہمدردی سے خالی ہیں، تم بھی ان سے ناطہ توڑ کر ان انسان دوست لوگوں کے خیر سگالی کے جذبات کا خیر مقدم کرو جنہوں نے جنگ کے دوران تمہارے حق میں عظیم الشان مظاہرے کیے اور اب بھی تمہارے لیے پانی، خوراک اور دوا کا بندوبست کر رہے ہیں۔ عرب ممالک سے جانے والی امداد بھی انہی عیسائی رضا کاروں کے ذریعے تقسیم ہو رہی ہے جن کے ہونٹوں پر منافقانہ مسکراہٹ، آنکھوں میں مصنوعی محبت اور گلے میں چمکتی صلیب لٹکی ہوتی ہے۔ اجلاس میں اس بات کا جائزہ لیا جا رہا تھا کہ ان کارکنوں نے اب تک عیسائی ریاست کے لیے کس حد تک زمین ہموار کر لی ہے؟

اطلاعات کے مطابق یہ پولیٹیکل پادری جن میں پوپ پال کے خصوصی نمایندے بھی شامل تھے......جی ہاں! وہی آنجہانی پوپ پال جنہوں نے امریکی حملوں کے خلاف بیان دے کر مسلم دنیا کے دل جیت لیے تھے......امریکا و برطانیہ کی حکومتوں سے اس بات پر سخت نالاں تھے کہ انہیں مطلوبہ فنڈز فراہم نہیں کیے جا رہے۔ انہوں نے قرارداد پاس کی کہ صلیبی حکومتوں کو کسی طرح یہ باور کروایا جائے کہ امریکا و برطانیہ اور ان کے اتحادیوں کا عراق میں عیسائی ریاست قائم ہوئے بغیر ٹھہرنا بہت مشکل ہے لہٰذا اگر وہ تیل کے ان کنوؤں پر قبضہ جمائے رکھنا چاہتے ہیں جو ان کے لیے خزانہ اگلتے ہیں تو انہیں ان ہوس ناک پادریوں کی جھولی میں اتنے سکے ڈالتے رہنا چاہیے جو ان کے مشن کی ضروریات کے علاوہ مشن سے فارغ وقت کی مصروفیات کے اخراجات کا بوجھ اٹھا سکیں۔ صلیبی دارالحکومت (روم ویٹی کن سٹی) کے بعد اس اجلاس کا اگلا مرحلہ ۱۴ مئی کو صہیونی دارالحکومت میں ہوا۔ تل ابیب کے مشنری ڈنشا ہال کے

اس اجلاس میں عیسائیت کا طویل تجربہ رکھنے والے ان ۸۰۰ پادریوں کو مختلف ممالک سے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا جنہوں نے عیسائیت کو دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلانے کے لیے اہم کردار ادا کیا تھا اور سینکڑوں لوگ ان کی محنت کی وجہ سے صلیب کے سائے تلے زندگی گزارنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں سی آئی اے کے مذہبی شعبے سے تعلق رکھنے والے ماہرین بھی پوری تیاریوں سے آئے ہوئے تھے اور ''غرب عراق'' کے نام سے کرسچن اسٹیٹ کے قیام کا منصوبہ خوش اسلوبی سے مکمل کرنے کے لیے اپنا تجربہ اور مہارت پُر جوش پادریوں کے قدموں میں ڈھیر کرنے کو بے تاب تھے۔ ان سب کی مدد کے لیے صہیونیت کے چند چوٹی کے دماغ بھی موجود تھے جو اپنی تمام تر عیاری، مکاری اور سازشی ذہنیت ساتھ لیے، ہزاروں سال کی ذلت وخواری کی مہر منہ پر سجائے، شیطانی تجاویز کا پلندہ بغل میں دبائے صلیب کے پرستاروں کو ستارہ داؤدی کی حمایت کا یقین دلا رہے تھے تاکہ جب عیسائی پادری اپنے حصے کا کام پورا کرلیں تو گریٹر اسرائیل کی راہ ہموار کی جاسکے۔

قارئین کو حیرت ہوگی کہ جب عیسائیوں کے نزدیک یہودیوں کا دین باطل اور یہودی راندۂ درگاہ قوم ہیں اور یہودیوں کے نزدیک عیسائی بھٹکی ہوئی مخلوق ہے حتیٰ کہ ان کم بختوں نے ان کے پیغمبر جناب حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو معاذ اللہ قتل کی کوشش کرنے اور جناب سیدہ مریم علیہا السلام پر جھوٹا بہتان لگانے سے بھی دریغ نہ کیا تو پھر یہ ایک دوسرے کے بغل میں گھسے روم سے تل ابیب تک کیا خفیہ میٹنگیں کر رہے ہیں؟ دراصل یہ وہ بنیادی فرق ہے جو مسلمانوں اور ان حضرات میں ہے اور صرف یہی فرق اہل اسلام کے آسمانی وحی پر کاربند ہونے اور ان کم نصیبوں کے من گھڑت مذہب کے پیروکار ہونے کی علامت ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک محض مقصد کا اچھا ہونا کافی نہیں، کسی کام کے کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا ذریعہ بھی درست اور جائز ہو جبکہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ہاں اتنا کافی ہے کہ کوئی چیز ان کے مفادات سے میل کھاتی ہو۔ اب وہ درست ہے یا نہیں؟ اس کے لیے اختیار کردہ ذرائع جائز ہیں یا ناجائز؟ اس سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا چنانچہ یہودی فلسطینی

مسلمانوں پر ظلم کریں تو صلیبیوں کی حمایت سے محروم نہیں ہوتے اور آسٹریلیا مشرقی تیموری کی چوکیداری کرے تو یہودیوں کی آشیرباد اسے حاصل رہتی ہے۔ اسی طرح دونوں مذاہب والے اپنے مذہب کی تبلیغ یا مشن کی تکمیل کے لیے زر کی لالچ، زمین کی طمع یا زن کی رشوت سے نہیں ہچکچاتے، لہٰذا عراق میں یہودی مفادات کی تکمیل کے لیے عیسائی ریاست کے وجود کے قیام کے لیے مشترکہ کاوشیں بھی باعثِ حیرت نہ ہونی چاہئیں۔

اہلِ اسلام کے خلاف صلیب وستارے کی متحدہ یلغار جاری ہے لیکن اپنی تمام تر تیزی وطراری، ہوشیاری وچالبازی کے باوجود دنیائے کفر یہ بھول جاتی ہے کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے ایک حد تک ڈھیل دی ہے تو اس کے چیلوں کو کس طرح بے لگام چھوڑ دیا ہوگا؟ اللہ رب العزت کی قسم! مسلمانوں کو اس لیے زوال نے ادھ موا نہیں کر رکھا کہ ان کے دشمن بہت زیادہ چالاک ہیں بلکہ انہیں اس چیز نے کہیں کا نہیں چھوڑا کہ عقائد، احکام اور آداب کسی چیز میں وہ اپنے رب سے وفادار نہیں۔ جو لوگ اپنے وسائل کو اپنے ہاتھوں دشمنوں کے پاس گروی رکھیں، اپنی دولت سے دشمنوں کے سود گھر اور جوا خانے آباد کریں، ایجاد کی بجائے نقالی اور اجتماعی مفاد کی بجائے نفسانفسی کو فروغ دیں، اس قوم کو خدا تعالیٰ کی نظروں سے گرنے اور مخلوق کے سامنے خراب ہونے سے کون بچا سکتا ہے؟ اے اہلِ اسلام! حضرت مہدی کا انتظار کرو، مگر ''علامات قیامت'' کی کتابوں میں ان کے ساتھیوں کی صفات پڑھ کر ایک نظر خود پر بھی ڈال لیا کرو کہ مخلص مومنوں والی باتیں ہم میں زیادہ ہیں یا ریاکار منافقوں والی، کیونکہ حضرت کے زمانے میں اسلام کے نام لیوا دونوں طرح کے ہوں گے۔

آہ! القدس

☆☆ارضِ مقدس کے خلاف یہودیوں کی مرحلہ وار سازشوں کی جگر خراش داستان

کلبلاتے زہریلے کیڑے:

القدس میں صہیونی ریاست کی تشکیل کے لیے تاریخ عالم کا سب سے بڑا دجل و فریب کھیلا گیا ہے اور یہ داستان انتہائی پیچ در پیچ ہے لیکن نقشوں کی مدد سے اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اور یہ موضوع سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ فلسطینی مسلمانوں کا موقف دنیا پر اور دنیا پرست طبقوں پر واضح ہو سکے اور فدائی مجاہدین (جن کی بے مثال جدوجہد کو بے وتاثر کرنے کے لیے مذمتوں، طعنوں اور اعتراضات کا طوفان کھڑا کیا جا رہا ہے) کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا جا سکے۔

یہ ۱۹۱۸ء کی بات ہے۔ خلافت عثمانیہ صلیبی اتحادیوں کی پیہم سازشوں کی زد میں آ کر ختم ہو چکی تھی۔ عربوں میں اسلامیت کی بجائے قومیت کا بیج بو یا گیا تھا۔ دشمن ان کے خلاف زیرِ زمین اور بر سرِ زمین اتحاد کر چکا تھا لیکن وہ عثمانی خلافت سے مرکزی اتحاد سے جڑے رہنے کی بجائے اسے پارہ پارہ کر کے اپنے مستقبل کو صلیبی اتحادیوں سے رحم و کرم کے حوالے کر چکے تھے۔ برطانیہ اپنی سرپرستی میں یہودی ریاست قائم کروانے کے لیے ارضِ فلسطین کو اپنے کنٹرول میں لے چکا تھا اور وہاں ''برطانوی انتداب'' کی اصطلاح سے اپنے پاؤں جما کر دنیا بھر سے سڑے ہوئے یہودیوں کو لا لا کر آباد کر رہا تھا۔ یہ عمل تقریباً ستائیس سال جاری رہا۔ ترکوں کے خلاف زور و شور سے اٹھنے والے عرب سردار یہودیوں کی آبادی میں مسلسل اضافے

کو چپ چاپ دیکھے جا رہے تھے۔ ١٩٤٥ء میں یونا یٹڈ نیشن نامی بین الاقوامی ادارہ ختم ہو گیا تھا اور اس کی راکھ سے اقوام متحدہ اپنے خدوخال سنوار کر عالمی استعماری طاقتوں کے منشا کی تکمیل کے لیے ''غیر جانبدار'' ادارے کی صورت میں وجود میں آئی۔ اس قصاب نے پہلی چھری فلسطینیوں پر چلائی اور یہ قرارداد پاس کی (اسے قرارداد نمبر ١٨١ کا نام دیا جاتا ہے) کہ فلسطین میں یہودیوں اور عربوں دونوں کو الگ الگ مملکتیں دی جائیں۔ بظاہر یہ قرارداد بڑی منصفانہ معلوم ہوتی ہے مگر اس کے پیٹ میں مکروفریب کے جو کیڑے کلبلا رہے تھے وہ انتہائی زہریلے تھے۔

دوسروں کی جیب سے سخاوت:

اقوام متحدہ کے غیر جانبدار منصفین نے قرار دیا کہ ۵۲ فیصد علاقہ یہودیوں کو اور ۴۶ فیصد عربوں کو (کہ اس میں نہ مسلمانوں کا ذکر ہے نہ فلسطینیوں کا، عربوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے) دیا جائے اور دو فیصد علاقہ (جس میں القدس شامل تھا) کو بین الاقوامی نگرانی میں دے دیا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ یہودیوں کو فلسطین میں ریاست قائم کرنے کا حق دینے کی کیا تک تھی؟ اگر انہیں دنیا کے فرضی مظالم سے بچنے کے لیے پرامن خطۂ ارضی ہی درکار تھا تو امریکا یہ سخاوت اپنی جیب سے کر لیتا اور اسے اپنی پچاس ریاستوں میں سے ایک آدھ دے دیتا، کینیڈا اور الاسکا بھی یہ سخاوت کر سکتے تھے، ان کے پاس خالی زمین بہت تھی، اگر براعظم امریکا میں جگہ نہ بنتی تھی تو براعظم آسٹریلیا میں سینکڑوں میل خالی علاقہ یہود کی اچھی پرورش گاہ بن سکتا تھا...... مگر ان سب باتوں سے قطع نظر ہم یہاں صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ قرارداد بجائے خود کتنی منصفانہ تھی۔ فلسطین کی کل سرزمین ٢٧ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ یہودیوں کے پاس اس وقت فلسطین کا ١٤٠٠ مربع کلومیٹر علاقہ تھا۔ اب ١٤٠٠ کلومیٹر میں رہنے والی اقلیت کو تو ۵۲ فیصد دے دیا گیا، القدس پر مشتمل دو فیصد میں بھی بین الاقوامی نگرانی کا ڈھونگ رچا کر اسے اس کے لیے مخصوص رکھا گیا اور ٢٥ ہزار ٦٠٠ کلومیٹر پر آباد فلسطینی اکثریت (تقریباً ٩٠ فیصد سے زائد) کے لیے صرف ۴۶ فیصد علاقہ باقی چھوڑا گیا۔

مذاکرات کا کھیل:

لیکن یہودیوں کی خرمستی دیکھیے کہ وہ اس جانبدارانہ تقسیم پر بھی راضی نہ تھے، چنانچہ برطانوی انخلاء کے بعد فلسطین کو مذکورہ قرارداد کے مطابق دو حصوں میں تقسیم کر کے ہر فریق کو اس کا حصہ دینے کی بجائے ۱۹۴۸ء میں یہودیوں نے اس قرارداد کو اقوام متحدہ کے منہ پر مارتے ہوئے امریکی اسلحے کے بل بوتے پر فلسطین پر چڑھائی کر دی اور مسلمانوں کے دو اکثریتی علاقوں (دریائے اردن کے مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی) کو چھوڑ کر فلسطین کے ۷۸ فیصد حصہ پر قبضہ کر لیا۔ باقی ماندہ ۲۲ فیصد کے قلیل حصہ میں بھی مسلمانوں کے جو دو علاقے پڑتے تھے وہ ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اور جدا جدا تھے۔ وہ دن اور آج کا دن یہودی اس ۷۸ فیصد حصے پر اپنا دائمی اور غیر متزلزل حق سمجھتے ہیں اور مذاکرات کا کھیل صرف بقیہ ۲۲ فیصد کی حدود میں کھیلنا چاہتے ہیں۔

چھوٹے قد کی منمناتی بکری:

لیکن کیا یہودی اس ۷۸ فیصد حصہ پر قانع ہو گئے تھے؟ ایسا سمجھنا حماقت تھی۔ وہ تو نیل سے دجلہ تک کے چکر میں ہیں۔ وہ فلسطین کے اس ''چھوٹے سے'' حصے پر کیسے اکتفا کر سکتے تھے؟ چنانچہ مُسلم دنیا ابھی یہودیوں کی دست درازی کو اچھی طرح سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ۱۹۵۶ء میں ''بہادر'' یہودیوں نے اگلا داؤ کھیلا۔ اکتوبر کی ایک سیاہ رات میں یہودی افواج مسلمانوں کے پاس موجود دو علاقوں میں سے ایک ''غزہ کی پٹی'' میں داخل ہو گئی اور اس پر قابض ہونے کے بعد وہ صحراء سینا کو عبور کرتے ہوئے نہر سوئز کی طرف بڑھتی گئی۔ مصر کے جو روشن دماغ حکمران آج مجاہدین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چن چن کر پکڑ رہے اور شہید کر رہے ہیں، یہی حکمران اسرائیلی یلغار کے سامنے چھوٹے قد کی حاملہ بکری کی طرح ممیانے لگے اور دنیا کی اہم ترین بحری گزرگاہ جو امریکا و یورپ کو ایشیا و مشرق بعید سے ملاتی اور تجارتی، اقتصادی و عسکری اعتبار سے دنیا کی شہہ رگ کہلاتی ہے، اسے اسرائیل کے حوالے کر کے خود دریائے نیل کے کنارے بنی ہوئی تفریح گاہوں میں بیٹھ کر عرب قومیت کا راگ الاپنے لگے۔

۷۸ جمع ۲۲:

اب مسلمانوں کے پاس دریائے اردن کے مغربی کنارے پر صرف ایک بڑی آبادی رہ گئی تھی۔ ۱۹۶۷ء میں یہودی اس کو بھی ہڑپ کر گئے اور یہودی افواج نے مسلمانوں کی اس آخری پناہ گاہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس مرتبہ انہوں نے دوطرفہ جنگ چھیڑ کر ایک ہی ہلے میں سارا کام نمٹانا طے کرلیا تھا۔ چنانچہ شمال کی جانب لبنان کی سرحد پر واقع عسکری اعتبار سے اہم ترین پہاڑیوں (جنہیں گولان کی پہاڑیاں کہا جاتا ہے) پر بھی پیش قدمی کی اور جب اس چھ روزہ جنگ کا اختتام ہوا تو یہودی ارضِ فلسطین کو تقریباً سارا کا سارا نگل چکے تھے۔ القدس سمیت ۷۸ فیصد پر تو پہلے ہی ان کا پنجہ گڑ چکا تھا، باقی ۲۲ فیصد میں سے غزہ کی پٹی بھی جا چکی تھی اور اب مغربی کنارے کا اکثریتی مسلم علاقہ بھی مسلم حکمرانوں کی بے خبری، بے حسی، دنیا پرستی اور عیش پسندی کے سبب چھ کونوں والے مشرکانہ علامات کے حامل ستارے کے سائے میں چلا گیا۔

تجویز کی دھجیاں کیوں؟:

یہاں پہنچ کر قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ فلسطینی مجاہدین سہل پسند عرب حکمرانوں کی طرف سے پیش کی گئی ''۱۹۶۷ء والی سرحدوں پر واپس جانے'' کی تجویز کو کیوں چیتھڑوں میں بکھیر کر مسترد کرتے ہیں۔ ارضِ فلسطین کا ۷۸ فیصد حصہ ۱۹۴۷ء میں یہود کے قبضے میں تھا، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۷ء میں تو باقی ماندہ حصے کی آبادیوں پر تجاوز کیا گیا تھا۔ گویا عرب حکمران یہودیوں سے مخاصمت مول لینے کے ڈر سے فلسطین کے تین چوتھائی سے زیادہ حصے پر یہودیوں کا بلا شرکت غیرے حق تسلیم کر چکے ہیں اور بقیہ ۲۲ فیصد سے انخلاء کے عوض اسرائیل کو سندِ تسلیم لکھ کر دینے اور روز کے جھنجھٹ سے نجات پانے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ بندر بانٹ تو خود اقوامِ متحدہ کی قرارداد برائے تقسیم فلسطین کے خلاف ہے۔ تو کیا فلسطینی مجاہدین سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے اس ظلمِ عظیم پر خاموش رہیں؟ یہی وجہ ہے کہ اس تجویز کی دھجیاں وہ بمبار فدائی حملوں سے اڑا دیتے ہیں اور کسی کو یہ حق دینے پر تیار نہیں کہ وہ ان کی قسمت کا فیصلہ اپنی بزدلانہ اور احمقانہ تجاویز سے کر سکے۔

لنگڑے تخت اور لولی کرسی:

۱۹۷۳ء میں عرب خواب گراں سے ذرا نکلے اور عرب قومیت کے بدبودار نعرے سے پیچھا چھڑا کر اسلامی غیرت کا قدرے مظاہرہ کیا۔ مصر نے صحراء سینا اور شام نے گولان کی پہاڑیوں پر حملہ کیا۔ صحراء سینا سے اسرائیلیوں کا خاص مفاد وابستہ نہ تھا وہ اسے خالی کر گئے لیکن گولان کی پہاڑیاں ان کے لیے ایسی آنکھ ہیں جس سے وہ سارے عربستان پر نظر رکھتے ہیں۔ ان پہاڑیوں میں سے ایک کا نام "تلِّ ابو نُدداء" (ابونداء کا ٹیلہ) ہے اس پر برساتی کھمبیوں کی طرح اتنے انٹینا نصب ہیں کہ گویا وہاں الیکٹرونک آلات کا جنگل اگا ہوا ہے۔ اس کے ذریعے سے شام، لبنان اور اردن سے ملنے والی سرحد کے ایک ایک انچ پر نظر رکھی جاتی ہے بلکہ بعض ماہرین کے مطابق یہاں نصب دور مار آنکھیں خلیج عرب تک کی خبر لاتی ہیں، لہٰذا اسرائیل اس سے کسی حال میں دستبردار ہونے پر تیار نہیں۔ اگر یہ پہاڑی اس سے لے لی جائے تو گویا اسرائیل کی دجالی آنکھ پھوٹ جائے مگر دشمن کی آنکھ پھوڑنے کے لیے اسلامی سرحدوں کے محافظین کا بیدار ہونا ضروری ہے اور اسلامی حکمرانوں میں اپنے لنگڑے تخت اور لولی کرسی کے محافظ بہت ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے غمخوار تا حال ناپید ہیں۔ لہٰذا فلسطینی فدائین نے سوچ لیا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے انہیں خود ہی کرنا ہے چنانچہ وہ اپنا کام اپنوں کی بزدلی اور غیروں کی جفا کاری کے باوجود بہت خوبی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

(فلسطین کی یہ جگر خراش داستان ابھی جاری ہے۔ کیوں کہ ابھی بہت سے سوال تشنہ ہیں۔ مثلاً فلسطین خود مختار اتھارٹی کے قیام اور اسے خود مختار علاقہ دے دینے کے بعد مجاہدین کے حملوں کا کیا جواز ہے؟ ان حملوں کے بعد خود مسلمانوں کا نقصان زیادہ ہوتا ہے، پھر ان کی حمایت کیوں کی جاتی ہے؟ القدس شہر کی حدود پراسرار طور پر راتوں رات کیوں پھیل جاتی ہیں؟

اے، بی اور سی کیا ہیں؟

اے، بی اور سی زون کیا ہیں؟ اسرائیل القدس کے بدلے کون سا علاقہ مسلمانوں کو دینا چاہتا ہے؟ یہودی اپنے مقبوضہ علاقے سے ایک اینٹ کو ایک فٹ پیچھے سرکا کر اسے ایک مربع

کلومیٹر کیسے بنا لیتے ہیں؟ اندھے کی بانٹی ہوئی یہ ریوڑیاں ہیر پھیر کے واپس یہودیوں کی جھولیوں میں کیونکر پہنچ جاتی ہیں؟ رام اللہ اور رملہ میں کون سا لفظ درست ہے؟ تل ابیب کے قریب "بـاب الـلـد" نامی مقام کی کیا تاریخ ہے؟ اسرائیلی افواج واپسی کا ڈرامہ رچانے پر کیوں تیار رہتی ہیں؟ یاسر عرفات کی ماتحت فلسطینی پولیس کو ایک گولی چلانے کے بدلے تنخواہ سے ڈیڑھ ڈالر کیوں کٹوانا پڑتے ہیں؟ یہودی بستیوں کو قلعہ نما محفوظ کالونیوں میں تبدیل کرنے کے باوجود یہودی کیوں اسرائیل چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں؟ جب یہودیوں پر مشکل پڑنے لگے تو مذاکرات کے کھیل کی آڑ میں وہ کس طرح اپنے لیے وقت حاصل کرتے ہیں؟ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو ان شاء اللہ آگے آپ ملاحظہ فرمائیں گے)۔

اندھے کی ریوڑیاں

اندھے کی بانٹی ہوئی ریوڑیوں کے متعلق آپ نے ضرب المثل ضرور سنی ہوگی جس میں ہیر پھیر کر کے سب کچھ اس کے اپنوں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ فلسطین میں مسلمانوں کے پاس جو دو اکثریتی علاقے (دریائے اردن کا مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی) رہ گئے تھے، ان کے بارے میں یہودیوں نے یہی طریقہ اپنایا۔ انہوں نے اس میں تین حصے بنا دیے:

(۱) ایک حصے (اے زون) کو فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلسطینی خود مختار اتھارٹی کے حوالے کر دیا۔ اس اتھارٹی کی خود مختاری بڑی نازک قسم کی تھی۔ بس یوں سمجھیے جیسے ہمارے یہاں کے ''وسیع الاختیار'' ناظم ہیں بس یہ ان سے کچھ ہی زیادہ صاحب اختیار تھی۔ اس اتھارٹی کی بیرونی ممالک سے رابطے کے اعتبار سے کوئی حیثیت نہ تھی۔ داخلی معاملات میں یہ بلدیاتی سطح کا ایک محدود اختیار والا ادارہ ہے۔ اس کو پولیس رکھنے کا اختیار تو ہے لیکن یہ پولیس اپنے سامنے کسی اسرائیلی کو دیکھے کہ وہ کسی نہتے فلسطینی مسلمان کو ذبح کر رہا ہے تو وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کیونکہ اس کو ایک ایک گولی کا حساب اسرائیلی فوج کو دینا پڑتا ہے اور اگر اس فورس کا سپاہی ناگزیر وجوہات کی بنا پر کوئی فائر کر دے تو اسے ڈیڑھ ڈالر جرمانہ دینا پڑتا ہے اگرچہ وہ گولی اس نے فلسطینی مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے کیوں نہ چلائی ہو۔

(۲) دوسرا حصہ (بی زون) جو عسکری اور جغرافیائی اعتبار سے اہم ترین تھا، یہ اسرائیل نے اپنے پاس رکھا اور اس طرح اسے مسلمانوں کے اکثریتی علاقے میں بھی یہودی بستیاں آباد کر کے یہاں بھی اپنی اقلیت کو آہستہ آہستہ اکثریت میں بدلنے کا موقع مل گیا۔ اس سے قبل یہودی ان علاقوں میں غیر مسلم اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے مگر اب وہ یہاں مکمل

کنٹرول حاصل کر چکے تھے اور تیزی سے نئی کالونیاں تعمیر کر کے دنیا بھر سے پٹے ہوئے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد کر رہے تھے۔

(۳) تیسرا حصہ یہودیوں اور فلسطین کی ''خود مختار'' اتھارٹی کے مشترکہ کنٹرول میں رہنے دیا گیا۔ قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ اس مشترکہ کنٹرول میں فلسطینی اتھارٹی کا اختیار کتنے فیصد ہوگا؟ یوں یہ علاقہ بھی عملاً اسرائیل کے پاس ہے۔ اس طرح سے اولاً تو بی اور سی زون زیادہ وسیع رکھے گئے پھر اے زون میں بھی فلسطینی اتھارٹی کو برائے نام اقتدار دیا گیا اور یوں مسلمانوں کے ان اکثریتی علاقوں پر بھی صہیونی عناصر اپنی شیطانی تدبیروں کے ذریعے قابض ہو گئے۔

ان علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد یہودیوں نے پہلا کام یہ کیا کہ فلسطینی مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ فلسطینی مسلمان رات کو چین سے سوئے، صبح اٹھے تو انہیں بتایا کہ چند گلیاں پار کرنے کے بعد ان کا زیر انتظام علاقہ ختم ہو جائے گا اور آگے آنے جانے کے لیے یہودی انتظامیہ سے اجازت حاصل کرنی پڑے گی۔ صورتِ حال یہ ہوگئی کہ ایک ہی بستی میں تین تین خطے قائم ہیں اور ایک سے دوسرے میں جانے کے لیے اجازت لینا پڑتی ہے چنانچہ اس علاقے میں صدیوں سے آباد مسلمانوں کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان میں سے اگر کوئی چند فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے اپنے کسی عزیز سے ملنے اپنے ہی ملک کے ایک حصے میں جانا چاہتا ہے تو اسے کئی چیک پوسٹوں پر گذرنا پڑتا ہے اور وہاں اپنی شناخت کروانی پڑتی ہے۔ فلسطینی مسلمان گزشتہ نصف صدی اس بے بسی، بے چارگی اور جبر و ستم کے عالم میں گذار رہے ہیں۔ آپ اخبارات میں اکثر پڑھتے رہتے ہوں گے کہ اسرائیلی ٹینک فلسطینی مسلمانوں کے علاقے میں گھس گئے۔ اس سے مراد اے زون نامی وہ بچا کھچا علاقہ ہے جہاں فلسطینی محصور ہو کر اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام گن کر گذار رہے ہیں۔ اسرائیلی افواج اپنے زیر کنٹرول علاقہ بی زون سے نکل کر دندناتے ہوئے اے زون میں داخل ہو جاتے ہیں اور بے بس فلسطینی مسلمانوں کے قتل عام سے جب ان کا جی بھر جاتا ہے تو امریکا کے ''مطالبے'' پر وہ اپنے ٹینکوں کو واپس اپنے زیر انتظام علاقے میں لے جاتے ہیں۔ اس انخلاء کا ڈھنڈورا پیٹ کر وہ اپنے

خلاف غم وغصہ کی لہر کو بھی دبا لیتے ہیں اور اس ''احسان'' کے عوض اپنے مطالبات منوانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

یہود کا مسخرہ پن اور رذیل حرکتیں ایسی ہیں جنہوں نے ان کو مردود اور ملعون بنا کے چھوڑا ہے۔ مثلاً قرآن شریف میں آتا ہے کہ ان کو حکم ملا تھا کہ یہ ایک آبادی میں اس حالت میں داخل ہوں کہ استغفار کے الفاظ زبان پر جاری ہوں اور عجز وندامت سے سر جھکائے ہوئے ہوں۔ ان بدبختوں نے یہ کیا کہ استغفار کے الفاظ کو بدل کر کچھ کا کچھ بڑبڑانے لگے اور سر جھکا کر ندامت کے اظہار کی بجائے چوتڑوں کے بل گھسٹ کر شہر میں داخل ہوئے۔ ایسی کمینہ حرکات کی بنا پر ان پر عذاب نازل ہوتا رہا ہے لیکن اس سے ان کی آنکھیں نہیں کھلیں اور وہ آج بھی اس طرح کی بیچ عادتیں اپنائے ہوئے ہیں۔ مثلاً آپ نے سنا ہوگا کہ امریکا اور مغربی ممالک کے دباؤ پر اسرائیل فلسطینی مسلمانوں کا اتنے مربع کلومیٹر علاقہ خالی کرنے پر تیار ہو گیا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ یہودی گماشتے اپنے زیر قبضہ علاقوں میں رکھی گئی اینٹیں یا دیگر علامات اٹھا کر ایک فٹ پیچھے کر لیتے ہیں اس طرح ایک فٹ کی چاروں طرف پیمائش سے ''خالی کردہ علاقہ'' کئی سو گز بلکہ مربع میل بن جاتا ہے۔ اس کو وہ انخلا سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی یہ مضحکہ خیز حرکات زمین والوں سے مخفی ہیں، لیکن آسمان میں ایک ذات ایسی ہے جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اور وہ ہر چیز کا حساب جلد یا بدیر ضرور لے گا۔

دو تلکونیں ایک کہانی

زور، زن اور زر:

آج کل دو تکونوں کی کہانی ہر طرف گردش کر رہی ہے۔ امریکا، اسرائیل اور ظلم...... عراق، فلسطین اور مظلومیت...... امریکا نے عراق کو اور اسرائیل نے فلسطین کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ ہر نیا طلوع ہونے والا سورج امریکا اور اس کے اتحادیوں کے جھاگ اڑاتے بیانات کے ساتھ افق سے بلند ہوتا ہے اور اسرائیل اور اس کے سرپرستوں کے خون بہاتے اقدامات کے مناظر کے ساتھ غروب ہو جاتا ہے۔ امریکا و برطانیہ کی زیرِ سرپرستی صیہونیت روز بروز مضبوط ہوتی اور قدم آگے بڑھاتی جا رہی ہے اور عراق و فلسطین کے مسلمان اس بھری دنیا میں یکا و تنہا ہو کر مظالم سہہ رہے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ عراق ساری دنیائے اسلام کا پایۂ تخت تھا اور ہر کلمہ گو کا تحفظ کرتا تھا، آج یہ وقت ہے کہ اس پر خون کی پھوار پڑ رہی ہے، مگر ساری دنیا میں کہیں سے کسی صاحبِ ایمان کی آواز کوفہ و بغداد کے مظلوموں کے حق میں نہیں اٹھ رہی۔ وہ زمانہ بھی دور نہ تھا جب بیت المقدس مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن تھا مگر یہودیت نے کہیں اسلحہ و بارود کے زور پر اور کہیں زن و زر کے ذریعے اہلِ اسلام کے دلوں کو ایمانی جذبات کی روشن قندیل کی بجائے شہوانی رجحانات کا متعفن گڑھا بنا دیا ہے چنانچہ حال یہ ہے کہ فلسطینی فدائین کی طرف سے بے بس ہو کر آخری چارہ کار کے طور پر کیے جانے والے فدائی حملے انہیں حماقت لگتے ہیں اور یہودیوں کے وحشیانہ اور سنگ دلانہ مظالم کی خبر وہ امریکا و یورپ میں ہونے والی نورا کشتیوں کے نتائج کی طرح سن کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

کلہاڑی کا دستہ:

روپوش فلسطینی مجاہد رہنماؤں کی چن چن کر شہادت کے باوجود یاسر[1] عرفات کا اپنے دفتر میں اعلانیہ طور پر رہتے ہوئے مکمل طور پر محفوظ رہنا کچھ اور ہی کہانی سناتا ہے۔ ایسی کہانی جس میں اپنوں کی غداری اور غیروں کی عیاری کی جگر سوز داستان ہے، جس میں آنکھوں میں دھول جھونکنے اور سیاہ کو سفید بنانے کی طلسم نما عیاری ہے، جس میں ضمیر فروشی سے لے کر ملت فروشی کی بدبختی اور ذاتی مفاد کی تکمیل کی خاطر اجتماعی مفاد کے خون کی المناک سوداگری ہے۔ اسرائیلیوں نے بیروت سے عراق تک کسی فلسطینی مجاہد رہنما کو نہیں بخشا، مگر یاسر عرفات ان کے گھیرے میں یہودی اہلیہ کے ساتھ پرامن اور قائدانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے مخصوص انداز میں باندھے گئے رومال کی چمک دمک کم ہوتی ہے نہ ان کے لہجے کی گھن گرج میں فرق آتا ہے۔ عالمی طاقتوں نے فلسطین کا خون بہانے کے لیے جو کلہاڑی بنا رکھی تھی اس کے لیے ایسا مناسب دستہ چنا ہے جو دیر تک کام دیتا رہے۔ اس پر جو فرضی حملے ہوتے ہیں ان کے بارے میں دنیا والوں کو معلوم ہی نہیں کہ یہ موت سے آنکھ مچولی نہیں، سدھائے ہوئے بھالو کی نورا کشتی ہے۔

١- اب ان صاحب کا معاملہ اللہ کے پاس ہے۔

فلسطینی مجاہد کے ساتھ ایک شام

محمد بسام نجیب الطرفین فلسطینی عرب تھا۔ گورا چٹا، سرخ و سفید، صحت مند جسم، لمبا قد، زبان کا کھرا، ہاتھ کا کھلا اور دل کا کشادہ۔ اس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، عربی ادب کا دلدادہ اور جہاد سے دلی رغبت رکھنے کے سبب میری اس سے گاہے گاہے ملاقات رہتی تھی۔ وہ میری عجمی عربی سے اور میں اس کی عربین اردو سے لطف اندوز ہوتا۔ میں فلسطین کو اس کی حقیقت بیں آنکھوں کی مدد سے دیکھنا چاہتا تھا لہٰذا فلسطینی فدائین کی تحریک کے پس منظر و پیش منظر، ان کی قربانیوں کی تفصیلات، فلسطین کے مختلف شہروں اور مشہور تاریخی مقامات کے نام اور یہودیوں کی نفسیات کو جاننے کے لیے کرید کرید کر اس سے سوالات کرتا اور وہ دلجمعی اور توجہ سے اپنی پُر مغز اور ذہانت آمیز گفتگو کے ذریعے میرے شوق اور تجسس کی تسکین کرتا رہتا۔ اس گفتگو کا سب سے دلچسپ مرحلہ وہ ہوتا جب میرے کسی سوال سے اس کی آنکھوں میں چمک اُبھر آتی اور وہ کانوں کو بھانے والی آواز میں عربی سے اردو پر اُتر آتا تاکہ تفہیم میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ جب میں اس کی آنکھوں کو خاص انداز میں سکڑتے اور پھر اُبھرتی چمک کے ساتھ پھیلتے دیکھتا تو سمجھ جاتا کہ اب مجھے اس کی مخصوص تلفظ اور دلچسپ لہجے میں بولی گئی اردو سننے کو ملے گی اور میں اس وقت تک اس کے دلکش صوتی توازن سے محظوظ ہو سکوں گا۔

ایک دن میں نے اس سے ایسا ایک سوال پوچھ ہی لیا جسے عرصے سے نوک زباں پر لاتے ہوئے مجھے حجاب مانع ہو جاتا تھا۔ میں ہچکچاتا تھا کہ کہیں شہداء کی قربانیوں کی بے حرمتی نہ ہو۔ یوں تو میرے پاس اس اشکال کے کئی نظریاتی جواب تھے اور مجھے ان کے درست ہونے پر یقین تھا لیکن میں مجاہدین کے حملوں اور ان کے ردعمل کے بارے میں فلسطینی مسلمانوں کا نظریہ

خود ان کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ میری توقع کے مطابق اس کی خوبصورت گہری آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے بھنچ گئیں پھر ان میں مجھے وہ چمک طلوع ہوتی نظر آئی جو کسی اچھے سوال پر اس کی اندرونی مسرت کی علامت ہوتی تھی۔ وہ آگے جھک کر گویا ہوا:

''شہادت کا یہ راستہ ہم نے خود چنا ہے، خوب سوچ سمجھ کر اور ہر پہلو پر غور کر کے، دراصل اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اندرونی طور پر ہم میں جاسوسوں اور زرخرید ایجنٹوں کی بھرمار تھی، باہر سے کسی مدد کا پہنچنا محال تھا۔ سو ہم نے دو فیصلے کیے: ایک تو یہ کہ اصلاحِ احوال کی مہم شروع کی جائے، بے دینی اور اسباب سے تہی دامنی دونوں جمع ہو جائیں تو ذلت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور مکمل شکست جلد ہی آ مسلط ہوتی ہے، سو ہم نے نوجوانوں میں دینداری کی طرف رجوع کی مہم چلانی شروع کی۔ اس کے اچھے نتائج نکلے اور جلد ہی نمازیوں کی صفوں میں نوجوان چہرے دکھائی دینے لگے۔ نئی نسل کا زیادہ وقت فٹ پاتھوں اور قہوہ خانوں کی بجائے اصلاحی حلقوں اور مساجد کی سیڑھیوں پر گزرنے لگا۔ ان میں اپنے آپ کو پہچاننے کا شعور اور تجسس پیدا ہوا اور جب دین سے تعلق نے ان کی روحانی تسکین کا سامان کیا تو ان کی زندگیوں کا رُخ بدلنے لگا۔ ہمارا دوسرا کام اپنے محدود وسائل میں دُشمن کے مقابلے کی تدابیر سوچنا تھا۔ اصلاحی محنت کے سبب ہمارے نوجوانوں میں عقابی روح بیدار ہو گئی تھی اور ان کا جذبۂ شہادت کفر کی ناقابل شکست برتری میں دراڑیں ڈالنے کو بے چین تھا۔ اس سے قبل کم وسائل اور محدود نفری کے ذریعے دُشمن سے مقابلے کے لیے گوریلا جنگ کا تصور پایا جاتا تھا۔ ہمارے لیے وہ بھی ممکن نہ رہی تھی لیکن ہم ناممکن کو ممکن بنانے کی تدبیر سوچتے رہے یہاں تک کہ مظلوموں کے ربّ نے ہمیں جانباز حملوں کا راستہ سُجھا دیا۔ اس میں ہمارے سلگتے جذبوں کی تسکین بھی تھی اور ہمارے دُشمن کے لیے موت کا پیغام بھی۔ یہودیت نے آج تک اپنی حرام دولت اور شیطانی ذہنیت کے سبب صرف ہمیں نہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو بہت ستایا ہے لیکن فدائی کارروائیوں نے ان کی ساری ابلیسیت کا تانا بانا بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ان کے شیطانی دماغوں کو اپنی عیاری پر فخر تھا اور وہ اس کا برملا اظہار کرتے تھے اور اپنے دوزخی

ساتھیوں)، ہندوؤں کو اپنے تجربات سے مدد دیتے تھے مگر بمبار حملوں نے ان کی سٹی گم کر دی ہے۔ ان کے تھنک ٹینکس کو اس سے اتنا زبردست شاک لگا ہے کہ وہ ہکا بکا رہ گئے ہیں۔ ہمارا یہ ہتھیار ایسا ناقابل شکست ہے کہ اس کے سامنے یہودیوں کے مہلک کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار بھی ناکارہ ہیں۔ اب میں آپ کے اصل سوال کی طرف آتا ہوں۔

عام مسلمان ہمارے حملوں کی کامیابی کی خبر سن کر خوش ہوتے ہیں لیکن اس اندیشے سے دل مسوس کر رہ جاتے ہیں کہ اب وحشی اسرائیلی شہری آبادی کو نشانہ بنائیں گے اور نہتے مسلمان زخمی، معذور یا شہید ہوں گے جو زندہ بچیں گے ان کا سہارا چھن چکا ہوگا اور ان کا ٹھکانا بلڈوز کیا جا چکا ہوگا...... یہ باتیں بظاہر ایسی ہیں کہ ہر کلمہ گو مسلمان ان سے غمگین و رنجیدہ ہوتا ہے لیکن ہمارے بھائیوں کو یہ حقیقت جاننی چاہیے کہ تحریک انتفاضہ (عربی میں حرکت، بیداری اور انقلاب کو انتفاضہ کہتے ہیں) شروع ہونے سے قبل ہماری بے سروسامانی کے سبب فریقین کے جانی نقصان کا تناسب ایک یہودی کے مقابلے میں دس مسلمان کا تھا۔ اس کو یہودی میڈیا فخر سے بیان کرتا تھا۔ اس عرصے میں بے شمار مسلمانوں نے مظلومیت کی حالت میں جان دی جب سے انتفاضہ شروع ہوئی یہ تناسب کم ہو کر ایک اور تین پر آ گیا ہے۔ اب تین مسلمانوں کی جان لینے پر یہودیوں کو اپنی ایک لاش اٹھانی پڑتی ہے۔ ہر طرح کے وسائل سے مالا مال یہودیوں کے مقابلے میں یہ تناسب اتنا ناقابل رشک بھی نہیں بلکہ یہ ہماری کامیابی ہے کہ ہم اپنا نقصان ایک تہائی تک لا کر یہودیوں کے نقصان میں مسلسل اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ہم سے ہمارا وطن، گھر بار، مال و اسباب اور جان و آبرو تو چھن ہی گئی تھی اور یہودی ہمیں لاشوں کا تحفہ دے کر فلسطین ہتھیانے پر تلے ہوئے تھے، اب ہم نے فیصلہ کرنا تھا کہ یہودیت کو چرکا لگا کر اس دنیا سے جائیں یا ان کے گھاؤ سہتے سہتے جان دیں۔ سو ہم نے خوب سوچ سمجھ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس لیے...... بسام کی گہری آنکھوں کی خوبصورت چمک مزید روشن ہوگئی اور وہ اپنے مخصوص لہجے میں اپنی بات میں وزن ڈال کر بولا:...... اس واسطے آپ لوگ ہم سے آنسوؤں کے ذریعے ہمدردی نہ کیا کریں۔ ہم نے یہ

راستہ خود منتخب کیا ہے اور اس پر اس وقت تک چلتے رہیں گے جب تک یہودیت کے سر سے ناپاک منصوبوں کا خمار اتر نہیں جاتا۔"

بسام کی گفتگو نے مجھ پر سحر طاری کر دیا تھا۔ تحریک انتفاضہ کے دوسرے مرحلے کے دو سال مکمل ہونے پر میں نے فلسطینی شہداء اور اسرائیلی مرداروں کا موازنہ کیا تو مجھے اس کی دھیمے لہجے میں کی گئی وہ پُر اعتماد باتیں یاد آ گئیں جو اس نے میرے اس سوال کے جواب میں کہی تھیں جو اکثر لوگوں کے دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے کہ فلسطینی جانبازوں کے حملوں کے جواب میں بالآخر نقصان مسلمانوں کو ہی اٹھانا پڑتا ہے پھر ان سے فائدہ کیا؟ دراصل یہ یہودیت کے تسلط کو چیلنج کرنے کا آخری حربہ ہے جو بے بسی کی موت سے بدرجہا بہتر ہے۔ عزت کی زندگی ممکن نہ ہو تو شہادت والی موت سے بڑھ کر سعادت والی کوئی چیز نہیں پھر اس سے یہودی معیشت کو زبردست نقصان پہنچتا ہے اور یہودیوں کی جان ان کے مال میں اٹکی ہوتی ہے نیز تحریک انتفاضہ سے قبل دنیا بھر کے یہودیوں کی مقبوضہ فلسطین کی طرف نقل مکانی میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا تھا اور ہر چھ مہینے بعد نئی یہودی بستیوں کی تعمیر کا اعلان ہو جاتا تھا، اب نہ صرف یہ کہ یہ سلسلہ رک گیا ہے اور موت کے خوف سے ادھ موے یہودی سابقہ آبادیوں کے گرد حفاظتی دیواریں تعمیر کر رہے ہیں بلکہ ارضِ موعود میں سکونت ان کے لیے ایسا ڈراؤنا خواب بن گیا ہے جس کی دہشت سے وہ اسرائیلی حکومت کی ترغیبات کے باوجود ترک سکونت کر کے اپنے سابقہ ممالک کو واپس جا رہے ہیں اور اس بات پر شکر ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ارضِ فلسطین پر آباد ہونے کے بعد جذبات میں آ کر اپنے سابقہ ملکوں کے پاسپورٹ پھاڑے نہ تھے۔ سچ یہ ہے کہ بسام جیسے نوجوانوں نے امریکا و اسرائیل جیسی خونخوار طاقتوں کو نتھ ڈال رکھی ہے اور اُمت مسلمہ اگر ان بے وسائل مسلمانوں کی طرف سے غفلت چھوڑ دے تو وہ اس نتھ کو ناک کی رسی بنا کر یہودیت کی کالی بھینس کو بہت دور تک ہانک کر لے جا سکتے ہیں۔

عجمی نسل کا عرب حکمران

جنگ کے دوران مخالفین کی صفوں میں اپنے آدمی داخل کر دینا جو ان کے ارادوں اور اقدامات کے بارے میں پل پل کی خبریں پہنچاتے رہیں، عسکری نقطۂ نظر سے بڑی کامیابی سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی منصوبہ ساز اس امر میں کامیابی حاصل کر لے کہ اپنے کسی مہرے کو دشمن کے اختیارِ اعلیٰ کے مرکز تک پہنچا کر اسے مقتدر ترین منصب پر فائز کروا دے اور اس کے ذریعے دشمن کا دماغ، کان اور آنکھ اپنے قبضے میں لے لے تو بلاشبہ اسے مثالی اور بہت بڑی کامیابی کہا جائے گا۔ ''ابو مازن'' اس کی سب سے نمایاں مثال ہے۔ اس کے آباء واجداد ایران کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۶۰ ہجری مطابق ۱۸۴۴ء میں ایران میں باطنی فرقوں کی ایک نئی شاخ نے جنم لیا۔ باطنی فرقے سے مراد مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے وہ فرقے ہیں جو آیات، احادیث اور احکامِ شرعیہ کی من مانی تاویلات کے ذریعے ان کا وہ مطلب گھڑ لیتے ہیں جس میں انہیں آسانی محسوس ہو۔ وہ اسلام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس میں دل کو بھانے والی کوئی ممنوع چیز حرام نہ رہے اور نفس کو مشقت میں ڈالنے والی کوئی عبادت ایسی شکل میں باقی نہ رہے جس پر عمل میں مشقت برداشت کرنی پڑے۔ پھر خواہش پرستی کے اس مجموعے کو اپنا دین و مذہب بنا کر زیرِ زمین اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ ایسے فرقے مسلم دشمن قوتوں کے لیے نہایت کارآمد ہوتے ہیں، لہٰذا وہ ان کی سرپرستی کر کے مسلمانوں کے لیے فتنہ وفساد اور اپنے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایسے فرقے زیادہ تر نفس پرست اور نام نہاد روحانی پیشواؤں کی ان گمراہ کن کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو سیاسی یا

اقتصادی مفادات کے حصول کی خاطر اپنی دنیا بنانے کے لیے لوگوں کا دین خراب کرتے ہیں۔ قدیم زمانے میں قلعۃ الموت سے اٹھنے والے قرامطہ اور آج کے دور میں بلوچستان کے پہاڑوں کو مسکن بنانے والے ''ذکری'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔

ہاں تو آج سے تقریباً ایک سو ٦٠ سال پہلے ایران میں قلعۃ الموت کے کھنڈروں سے ایک نئے باطنی فرقے نے جنم لیا۔ اس کا بانی ایک خواہش پرست روحانی معالج مرزا علی محمد باب شیرازی (١٢٣٥ھ/١٢٦٦ھ بمطابق ١٨١٩ء/١٨٥٠ء) تھا۔ اس نے اپنے پیروکاروں میں اس عقیدے کا پرچار شروع کیا کہ نعوذ باللہ خدا انسان میں حلول کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اس ''انسان'' کا مصداق خود اس کی اپنی ذات نے ہو جانا تھا۔ یہ اپنے ماننے والوں میں یوگی رجنیش کی طرح آزادانہ جنسی اختلاط کو رواج دینے کی کوشش کرتا تھا تاکہ خود اسے جنسی تسکین کے ذرائع میسر آسکیں۔ نماز زکوٰۃ کا انکار اور روزہ اور حج کو ساقط قرار دینے کے علاوہ جہاد کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ باطل فرقوں میں یہ چیز قدرِ مشترک رہی ہے کہ وہ جنسی آزادی کے گرم جوش حمایتی اور جہاد فی سبیل اللہ کے سب سے بڑے مخالف ہوتے ہیں۔ اس شخص کے شاگردوں میں ''بہاء اللہ'' نام کا ایک شخص دوسرے مفاد پرست خوشامدیوں پر بازی لے گیا اور اس نے اپنے فرقے کے خفیہ پیغام کو دور دور تک پہنچانے کے ساتھ کسی ایسی غیر مسلم طاقت کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش شروع کی جو اس کی لذت پرستی کے جذبے کی تسکین کے لیے سرمایہ اور مسلمانوں میں گمراہ کن نظریات کے پرچار کے لیے وسائل فراہم کر سکے۔ بالآخر ابلیس کے اس نمایندے کو ایک ابلیسی گروہ مل گیا جو خود تو خدا پرستی کا دعویدار ہے لیکن بقیہ دنیا کو شیطانی کاموں میں ملوث دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

ہوا یوں کہ اس زمانے میں سوئٹزرلینڈ کے شہر باسل میں یہود کے چوٹی کے رہنماؤں کا خفیہ عالمی اجلاس ہو رہا تھا۔ بہاء اللہ سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا اور یہودیوں کو قائل کر لیا کہ وہ اگر اس کی سرپرستی کریں تو وہ ان کے لیے نرم لکڑی کا ایسا کارآمد دستہ ثابت ہو سکتا ہے جس کو وہ خنجر، کلہاڑی، تیشہ جس چیز میں چاہیں فٹ کر کے مسلم کش ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

یہودیوں کو ارضِ موعود میں واپسی کی مہم کامیاب بنانے کے لیے ''مسلم صہیونی'' درکار تھے، اس شخص میں انہیں وافر مقدار میں ایسے جراثیم نظر آئے جو اِن کی منشا کے مطابق رینگ سکتے تھے، لہٰذا انہوں نے اسے اپنی سرپرستی میں قبول کرلیا۔ بہائیوں اور یہودیوں کا یہ گٹھ جوڑ اتنا بڑھا کہ جب ایران کی قاچار حکومت نے بہاء اللہ کے پیروکاروں کو اپنی حدودِ مملکت سے بے دخل کیا تو یہ ایران سے سیدھا مقبوضہ فلسطین جا پہنچے جہاں صہیونیت نواز برطانوی حکومت کے نمایندہ جنرل ایلن بی (جس نے القدس پر یہودی تسلط قائم کروا کر صلیبی جنگوں کے عیسائی ہیرو شاہ فرانس لوئس دوم کا کردار ادا کیا تھا) نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور اسرائیل کے شہر حیفہ میں ان کو اپنا مرکز بنانے کے لیے وسیع وعریض قطعہ زمین الاٹ کیا۔ ابو مازن کا خاندان ان بھگوڑوں میں شامل تھا۔ ابو مازن جب بڑا ہوا تو بہائی فرقے کا ذہین ترین نوجوان سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اس کی تربیت میں صہیونی دماغوں نے خاص توجہ سے حصہ لیا اور کچھ عرصہ قبل صہیونیت کے منصوبہ سازوں کا تربیت یافتہ یہ شخص فلسطین کا وزیر اعظم رہا ہے جسے دنیا محمود عباس مرزا کے نام سے جانتی ہے۔

کراچی میں پٹیل پاڑہ کے قریب بہائی فرقے کا مرکز ''بہائی ہال'' کے نام سے موجود ہے اور یہ مسلمان سمجھا جانے والا دنیا کا دوسرا فرقہ ہے جسے اسرائیل کی حدود میں اپنا مرکز بنانے اور تربیت گاہیں قائم کرنے کی کھلی آزادی ہے۔ بہائی فرقے کا مرکز اسرائیل میں دو جگہ ہے۔ ایک حیفہ میں جہاں ان کا بہت بڑا عبادت خانہ تمام تر متعلقہ لوازمات کے ساتھ قائم ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے اسرائیلی حکومت نے اپنی خفیہ ایجنسی ''شین بیت'' کو مامور کر رکھا ہے۔ دوسرا ساحلی شہر عکّا میں ہے۔ یہاں کسی زمانے میں شیرِ اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے صلیبیوں کو عبرتناک شکست دی تھی۔ آج وہاں مسلمان ہونے کے دعویدار فرقے کے مورث اعلیٰ بہاء اللہ کی قبر ہے۔ جب اس فرقے کے پیروکار صہیونیت کی خدمت سے فارغ ہو جائیں تو اس قبر پر حج کے لیے جاتے ہیں۔ اس فرقے نے ماضی قریب میں ارضِ فلسطین میں اپنے سرپرست یہودیوں کے پاؤں جمانے کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ مسلمانوں کو ان کی

زمینوں اور جائیدادوں سے بے دخل کر کے ان کی جگہ یہودیوں کو بسانے میں اس خبیث الباطن فرقے کے افراد کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں میں گھل مل کر زمین بیچنے کی صورت میں بہت سے فوائد کا لالچ دیتے اور نہ بیچنے کی صورت میں نقصانات کے اندیشے سے ''خیر خواہانہ'' طریقے سے آگاہ کرتے۔ آج بھی ان کی ڈیوٹی اسی طرح کے ایک کام پر لگائی گئی ہے۔

صہیونیت کی چھتری تلے پرورش پانے والے عجمی النسل سابق فلسطینی وزیر اعظم کو یک نکاتی ایجنڈا سونپا گیا ہے یعنی فلسطین کی اسلامی جہادی تحریکوں حماس، الجہاد الاسلامی اور الفتح کے خلاف ہر سطح پر ایسے اقدام کرنا کہ یہ عوام کی اخلاقی حمایت سے محروم ہو جائیں، ان کا زور ٹوٹ جائے اور ان کی عسکری کارروائیوں سے اسرائیل کو پہنچنے والے نقصانات سے بچایا جا سکے۔ اپنے دورِ اقتدار میں محمود عباس کا سب سے زیادہ زور فدائی حملوں کی حوصلہ شکنی پر رہا ہے۔ یہود و ہنود کو دنیا کی زندگی سے حریصانہ محبت ہے اس لیے وہ مسلمانوں کے جذبۂ شہادت سے از حد خائف رہتے ہیں کیونکہ تمام تر بدنظمی، بے سروسامانی اور پسماندگی کے باوجود یہی ایک چیز ہے جس نے مسلمانوں کو سر اٹھا کر زندہ رہنے کا بہانہ فراہم کر رکھا ہے۔ اگر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چونڈہ کے محاذ پر پاکستانی افواج کے جوان جسم پر بم باندھ کر بھارت کے اسلحہ اور نفری کی برتری کے جواب میں ''فی ٹینک ایک جوان'' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے فدائی حملوں کے ذریعے بھارتی ٹینکوں کی پیش قدمی نہ روکتے تو آج بنئے کی دھوتی نہ جانے پاکستان میں کہاں کہاں پھڑ پھڑا رہی ہوتی۔ بالکل اسی طرح اگر فلسطینی جانباز صہیونی منصوبوں کو اپنے جسموں کی قربانی سے سبوتاژ نہ کرتے تو آج بیت المقدس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی بنیادیں رکھی جا چکی ہوتیں۔

جس طرح کوئی پاکستانی شاعر، دانشور، اداکار یا فنکار پاکستانی عوام کو بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھانے اور جغرافیائی سرحدوں کو کاغذی لکیریں قرار دے کر دونوں ملکوں کے عوام کو باہم قریب آنے اور تمام فاصلے مٹا کر ایک ہو جانے کا مشورہ دے تو سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ بھارتی لابی نے ایک اور بٹیر پال لیا ہے، اسی طرح فلسطینی مسلمان کسی شخص کے مخلص یا ساتھی ہونے کا اندازہ اس امر سے لگاتے ہیں کہ وہ صہیونیت کے خلاف جہاد میں کتنا سرگرم ہے؟ لیکن

مرزا صاحب کے بارے میں فلسطینی مسلمانوں کو کسی کسوٹی سے کام لینے کی ضرورت نہیں، سب جانتے ہیں کہ اسرائیلی ایجنٹوں نے پچھلے سالوں میں چُن چُن کر یاسر عرفات کی جانشینی کی ممکنہ حق دار شخصیتوں کو ٹھکانے لگایا ہے تاکہ صہیونیت نواز فرقے کے اس ذہین اور کارآمد مہرے کو آگے بڑھا کر فلسطین کے اعلیٰ ترین مقتدر منصب پر فائز کروایا جاسکے۔ فلسطینی مسلمانوں کی صف میں نقب لگانے کے لیے جن بہائیوں کو ۷۰ء کی دہائی میں فلسطینیوں کی صف میں داخل کردیا گیا تھا، انہوں نے اپنے آقاؤں سے حق وفاداری خوب نبھایا چنانچہ ان میں سے ایک صہیونی ایجنٹ کو وزارتِ عظمیٰ پر فائز کردیا گیا۔ عین ان دنوں جب ابو جہاد اور ابو عیاد جیسی نابغۂ روزگار فلسطینی جہادی قیادت کو اسرائیلی ایجنٹ چُن چُن کر شہید کر رہے تھے، محمود عباس پیرس اور روم کے شاندار محل نما بنگلوں میں دادِ عیش دے رہا تھا۔ یورپ کے شہروں کو چھوڑیئے رام اللہ اور غزہ میں ان کے ایک ایک گھر کی قیمت ۱۰ ملین ڈالر بنتی ہے۔ یہودی سرمائے سے حاصل ہونے والی ان عیاشیوں کا حق اس نے جہادی تحریکوں کی حوصلہ شکنی اور مجاہدین کا مورال گرانے کی ہر ممکن کوشش کے ذریعے ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے اس کی سیاست انگریز والی سیاست رہی ہے کہ مظلوم مسلمانوں نے احتجاج کرنا ہے تو صرف نعرے لگائیں، جلسے کریں اور دل کا غبار فضا میں اڑا کر ٹھنڈے ٹھار ہو کر گھروں کو جائیں۔ ہتھیار اٹھانا یا خودکش حملے کرنا ان کے مفادات کے خلاف ہے۔ اس سے امن کی کوششیں متاثر اور مطالبات منوائے جانے کے امکانات سبوتاژ ہوتے ہیں۔

محمود عباس بڑے خیر خواہانہ انداز میں دلسوزی کے ساتھ فلسطینیوں کو سمجھاتے ہیں: ''جب فلسطینی اسرائیلیوں پر حملے کرتے ہیں تو اسرائیلی ان حملوں کو جواز بنا کر فلسطینیوں کو مارتے ہیں اس لیے اسرائیلیوں کے جواز کو ختم کیا جائے۔'' یہ کہنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے: ''پاکستان جب میزائل تیار کرتا ہے تو بھارت بھی دور مار میزائل کے تجربات کرتا ہے اگر علاقے میں کشیدگی کو روکنا ہے تو جدید اسلحہ کے حصول کی کوشش ختم کردینی چاہیے۔'' فلسطینی مسلمان ان کے جھانسے میں آجاتے، اگر مرزا صاحب چند خطرناک غلطیاں نہ کرچکے ہوتے۔ یہ غلطیاں بالکل ایسی ہی تھیں جیسی ہمارے ہاں کے بعض دانشور دِلّی اور بمبئی کی یاترا کے بعد کر بیٹھتے ہیں اور پھر

باشعور پاکستانیوں کی نظر میں ہمیشہ کے لیے داغدار ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے فلسطینی ہوتے ہوئے بھی یہودیوں کی سب سے بڑی بستی ابوغنیم کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا۔ دوسرے یہ کہ وہ صہیونیت نوازی میں اتنا آگے چلے گئے کہ کھلم کھلا کہنے لگے اب مسلمانوں کو عالمِ اسلام کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ وہ تمام امیدیں مغرب سے رکھیں، اہلِ مغرب ہی ان کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ترنگ میں آ کر اپنی اہمیت جتانے کے لیے یہ کہہ بیٹھے کہ وہ اسرائیلی خفیہ تنظیموں کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں، لہٰذا ان کے مشوروں کو زیادہ غور کیے بغیر قبول کر لینا چاہیے۔ ایک پہاڑ جیسی غلطی مرزا جی نے یہ کی کہ فلسطینی مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوششوں میں لگے رہے کہ امریکا اور اس کے حلیف اسرائیل کے خلاف جنگ کے نتائج بھیانک ہو سکتے ہیں، چنانچہ وہ بیچ میں پڑ کر ''اوسلو معاہدہ'' کروانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اس معاہدے سے فلسطینی مسلمان ''بھیانک نتائج''، سے محفوظ ہوئے یا نہ، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انہیں فلسطین کی ۸۰ فیصد زمین سے دستبردار کروا دیا گیا۔ اس طرح کی حرکتیں ہمارے ملک کے کچھ رہنما بھی بھارت کے حوالے سے کرتے رہتے ہیں۔ ان کے بیانات ایک ہی طرح کے ریموٹ کنٹرول سے منسلک ہوتے ہیں۔

''اوسلو معاہدے کے معمار'' کا خطاب پانے والا یہ عجمی النسل شخص کسی عرب ریاست کا پہلا غیر عربی سربراہ رہا ہے۔ حیرت ہے جب مسلمان اس قدر غفلت میں ہیں کہ اپنے باصلاحیت لوگوں کی خدمات سے فائدہ نہیں اٹھا رہے اس وقت یہود و ہنود طویل المیعاد منصوبہ بندی کے ذریعے ان کی آستین میں اپنے سانپ پال رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے ان سانپوں کا رنگ و روپ، ان کے ڈسنے کا انداز اور ان کے گندے زہر کی تباہ کاریاں ایک جیسی ہیں مگر ہم اپنی آستینوں میں جھانک کر نہیں دیکھتے کہ کیا چیز کلبلا رہی ہے؟ یہود و ہنود کا طریقۂ واردات ایک جیسا ہے، فلسطین اور پاکستان میں سرگرم بیرونی ایجنٹوں کی کارستانیاں، کام کرنے کا انداز اور انہیں پڑھائے گئے بول ایک جیسے ہیں مگر ہم پھر بھی انہیں پہچان نہیں سکتے۔ جب چوکیدار ہی اندھاپے کے مرض میں مبتلا ہو تو چور کو کس چیز کا ڈر ہو سکتا ہے......؟

اے میری قوم کے لوگو!

ایک ابلیسی جواب:

باطل کی عادت رہی ہے کہ وہ اپنی ترویج کے لیے حق کی طرف نسبت کا سہارا لیتا ہے اور اس نسبت کی سند ایسی بیان کرتا ہے جس کو تحقیق کے معیار پر پرکھا ہی نہ جا سکے۔ اپنے گندے نسب کو چھپانے کی اور حق کے سرچشموں میں سے کسی سے اپنا سلسلہ جوڑنے کی جھوٹی کوشش، باطل کا وہ شیطانی ہتھکنڈہ ہے جسے طاغوت کے چیلے صدیوں سے آزماتے چلے آرہے ہیں۔ مثلاً: جب آپ کسی جوتشی، ماہرِ علمِ نجوم، ماہر عملیات و مستقبلیات کو دیکھیں کہ وہ کسی کو سعد و نحس اوقات کی تفصیل بتلا رہا ہے یا ''یہ ہفتہ کیسا گزرے گا؟'' یا ''آج کا دن کیسا رہے گا؟'' کے متعلق پیش گوئی کر رہا ہے اور اس کذاب سے پوچھیں کہ یہ کون سا علم ہے جس سے تمہیں مالدار لوگوں کے مستقبل کی خبر تو ہو جاتی ہے لیکن اپنی خوار حالت کی ہوا نہیں لگتی؟ تو وہ کہے گا کہ یہ باطنی علم ہے جو فلاں مقدس پیغمبر یا بزرگ شخصیت سے منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ اور اگر آپ اس سے پوچھ لیں کہ ان پیغمبر یا بزرگ کی زندگی میں کہیں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اس طرح کا شغل رکھتے تھے بلکہ ان کی ساری زندگی ایسی چیزوں کو شیطانی کام کہتے اور ان سے روکتے گذری۔ آخر تمہارے پاس ان علوم کی ان تک نسبت کی سند کیا ہے؟ تو اس کے پاس ایک ہی جواب ہوگا اور یہ وہ ابلیسی جواب ہے جو تمام باطل گروہ، فرقے، افراد اور ادارے استعمال کرتے ہیں یعنی: ''یہ علوم ہم تک ''سینہ بہ سینہ'' منتقل ہوئے ہیں۔ کن بزرگوں سے سینہ بہ سینہ؟ سلسلۂ روایت بیان کرو؟ تو کذاب مبہوت رہ جائے گا۔

شرک کی ایک سائنٹیفک شکل:

دراصل شریعت میں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں جسے عام انسانیت سے پوشیدہ رکھا گیا ہو۔ ہدایت اور علومِ ہدایت تو ہر شخص کے لیے ہیں۔ انہیں بعض لوگوں کے ساتھ مخصوص کرنا اور بقیہ مخلوق کو ان سے محروم رکھنا ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ، مقرب فرشتے، برگزیدہ بندے، ان کے شاگرد اور بزرگانِ دین سب اس ظلم سے بری اور پاک ہیں۔ مستقبل کے احوال کسی کو بتلانا، علم غیب کے دعویٰ کے مترادف ہے اور ایسا دعویٰ کھلا شرک ہے اور کسی شخص سے ہاتھ دکھا کر، یا اپنا برج بتا کر ستاروں کی گردش کے حساب سے خیر وشر کی معلومات حاصل کر کے ان پر اعتماد کرنا، اس دعوے کی تصدیق ہے۔ شرک کی تصدیق نہ یہ کہ خالص شرک ہے بلکہ اس کی ترویج اور بدترین گناہ ہے۔ آج کل یہ شرک ہمارے ہاں بڑے سائنٹیفک انداز میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ اخباروں اور سائن بورڈز پر فون نمبر لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور دعوت دی جاتی ہے کہ ایک کال ملا کر آپ خفیہ علوم کے خزانوں سے وہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں جن تک عام لوگوں کی رسائی نہیں۔ مختلف اثرات والے پتھروں کے اشتہارات بھی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ یہ سب شرک فی الصفات اور شرک فی التصرف کی بدترین قسمیں ہیں جو یہود نے بابل کی جادونگری میں واقع طلسم کدوں میں ایجاد کی تھیں اور جن کے پھندے میں پھنسنے والا اپنی دنیا وآخرت تباہ کر بیٹھتا ہے۔

ستّر بڑوں کی روایات:

جب یہودیت کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے سیدنا حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل شدہ دینِ موسوی مراد نہیں ہوتا بلکہ اس سے وہ محرّف شدہ اور بنی اسرائیل کے دنیا پرست مذہبی پیشواؤں کی خودساختہ موسوی شریعت مراد ہوتی ہے جو اللہ اور اس کے سچے انبیاء سے بغاوت پر مبنی ہے۔ حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال کے مارے ہوئے یہودی پیشواؤں نے شیطان کی پیروی کرتے ہوئے جو من چاہی شریعت وضع کی، اس کے مجموعے کا نام ''تلمود'' رکھا اور پھر مذکورہ بالا مشہور زمانہ ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہوئے اسے ان ستّر بزرگوں کی طرف منسوب کر دیا جو سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر احکام الٰہی لینے گئے

تھے۔ حسبِ دستور یہود کے پاس ''ستر بڑوں'' سے منقول ان روایات کی کوئی سند نہیں، ان کے روحانی پیشوا (جن سے علوم اسلامیہ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کرنے کے لیے ہمارے ملک کا ذہین افرادی سرمایہ یورپ اور امریکا کی یونیورسٹیوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے) انہیں ''رازداری'' کا وعدہ لے کر سمجھاتے ہیں کہ یہ احکام تحریری نہ تھے، زبانی تھے اور ''سینہ بہ سینہ'' منتقل ہوتے چلے آتے ہیں۔ ان خفیہ رازوں کو انہوں نے ''سبعین'' (SEPTUAGINTA) کا نام دیا اور اسے یہودیت کی بنیاد قرار دے دیا گیا۔ یہودیوں کا یہ مجموعہ دراصل ان کے شکم پرست اور دنیا کے پجاری مذہبی رہنماؤں کی تالیف تھی اور بنی اسرائیل کے ان علمائے سوء نے جھوٹ اور افتراء کے اس پلندے کو باضابطہ قانون کی شکل دے دی اور طے کرلیا کہ ان کی مخالفت کرنے والے تمام انبیاء بنی اسرائیل، ان کی وحی اور تعلیمات غیرقانونی اور گمراہی ہیں اور ان کی تبلیغ کرنے والا قابلِ گردن زدنی ہے۔ یہ وہ دور ہے جو سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد سے ۴۰۰ برس پیشتر کے عرصے پر پھیلا ہوا ہے اور ان چار صدیوں میں یہودی رؤسا، امراء اور زعماء نے جاہل روحانی پیشواؤں کے کہنے پر اپنے انبیاء کا بے دریغ خون بہایا۔

تاریخی دشمنی کا نقطۂ عروج:

اس دور میں یہود کی بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ انبیائے کرام اور حق کے داعی انہیں ان حرکتوں سے باز آنے کی تلقین کررہے تھے، ان گناہوں پر سخت مصائب کی وعید سنا رہے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بشارتیں دے رہے تھے اور ساتھ ہی حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد اور دجالِ اکبر کے خروج کی خبر دے رہے تھے .... لیکن وہ قوم جسے اتنی فضیلت عطا کی گئی تھی کہ امتِ محمدیہ سے قبل کسی کو عطا نہ ہوئی تھی، وہ پے در پے انبیائے کرام علیہم السلام کے بھیجے جانے اور وقتی مصیبتوں اور عذابوں میں مبتلا ہونے کے باوجود شیطان کی پیروی سے باز آنے کو تیار نہ تھی، لہٰذا ان کو آخری موقع دینے کے لیے ایک بہت ہی صاحبِ فضائل ومناقب اور عجیب وغریب معجزات کے حامل پیغمبر (جناب عیسیٰ مسیح علیہ السلام) بھیجے گئے تاکہ یہود اپنی روش سے

باز آ جائیں ورنہ ان کو ان کے مقام سے معزول کر کے ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی جائے گی اور وہ ابدی اور دائمی ذلت وخواری کا نمونہ بنا دیے جائیں گے۔ مذکورہ مقدس نبی آئے لیکن یہ نامراد قوم اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر مزید پختہ ہوگئی۔ اس نے اس مقدس پیغمبر کو بزعم خود سولی دینے کی کوشش کی اور پھر باضابطہ اور پکے ٹھکے باغی بن کر حق اور اہل حق کی دشمن ہوگئی۔ اس نے اس نظریے کو فروغ دیا کہ ہم آنے والے دجالِ اکبر یعنی المسیح الدّجال کے منتظر ہیں اور اس کے علاوہ کسی مسیح یا نبی کو اپنا دشمن تصور کرتے ہیں۔ اس موقع پر اس نے تحریف وتبدیل کی بدنام زمانہ عادت سے کام لیتے ہوئے مسیح صادق کی آمد سے متعلق بشارتوں کو دجالِ اکبر سے اور دجال ملعون پر آنے والے ابتلاء وآزمائش کو سچے مسیح پر منطبق کرنا شروع کر دیا۔ اس تاریخی دشمنی (میں دہراتا ہوں: تاریخی دشمنی............اے وہ لوگو جن کے دل میں ایمان کی ایک رمق اور دماغ میں عقل کا ذرہ باقی ہے سمجھ لو کہ اسرائیل کی طرف سے حال ہی میں مسلمان ممالک کے لیے ویزا کھولنا اور یہ کہنا کہ ہماری کسی مسلم ملک سے کوئی دشمنی نہیں، روئے زمین پر بولا گیا بدترین جھوٹ ہے) کا نکتۂ عروج وہ زمانہ تھا جب یہود کے تین قبیلے فلسطین سے نقل مکانی کر کے کھجوروں والی سرزمین ''یثرب'' میں آ کر آباد ہوگئے۔

۱۴۹۴ء کا سال:

عام طور پر مشہور ہے کہ یثرب میں مقیم یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اور بعثت کے منتظر تھے اور ان پر ایمان لانے کے لیے مدینہ منورہ آئے تھے۔ یہ بات ان چند خوش نصیب ہستیوں کی حد تک تو درست ہے جنہیں دونوں انبیاء اور دونوں کتابوں پر ایمان لانے اور دہرا اجر حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی لیکن یہود کی فطرت اور مزاج کو سامنے رکھ کر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہود کی اکثریت کے بارے میں یہ بات درست دکھائی نہیں دیتی۔ یہود دراصل اپنی معلومات کی حد تک اللہ کے مسیح کا کام (نعوذ باللہ) تمام کر چکے تھے اور اب انہیں صرف ایک خطرہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ خطرہ نہ تھا بلکہ دراصل تمام جہانوں کے لیے رحمت تھا لیکن طاغوت کے پجاری یہود، حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہما السلام سے آخری

نبی کے بارے میں بشارتیں سن کر بھی اس مجسم خیر و برکت کو اپنے دجالی منصوبوں کے لیے معاذ اللہ خطرہ سمجھتے تھے۔ یہود اس آخری خطرے سے نمٹنے کے لیے جزیرۃ العرب روانہ ہونے لگے اور ان کی ایک بڑی تعداد یثرب میں جمع ہوگئی۔ جن لوگوں نے خود اپنی قوم بنی اسرائیل میں آنے والے انبیاء بالخصوص حضرت یحییٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو...... اپنے علم اور دعووں کی حد تک...... قتل کر ڈالا تھا، ان کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ ایک دوسری قوم بنی اسماعیل میں آنے والے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کے انتظار میں یثرب آ بسے تھے، قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ درحقیقت وہ اپنے ناپاک مشن کی تکمیل کے لیے جتھے بنا کر تیاریوں کے ساتھ آئے تھے اور ''یثرب سے مدینۃ النبی تک'' کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی کارروائیوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ لوگ آپ پر ایمان لانے کے لیے جمع ہوئے ہوتے تو خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام نشانیاں ان کی کتابوں میں موجود تھیں، سب سے پہلے وہ ایمان لے آتے لیکن وہ تو عام یہود کو بھی ایمان نہیں لانے دیتے تھے اور ایمان لانے والوں کو قتل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چراغِ مصطفوی کو بجھانے کے لیے ان بدبختوں نے سفلی علوم کا سہارا لینے سے لے کر جنگجو مخالفین کو ورغلا کر مدینۃ الرسول پر چڑھا لانے تک ہر طرح کی اور ہر ممکن کوشش کی لیکن اسلام اور مسلمانوں پر اللہ کا فضل اور جہاد کی برکت تھی کہ ان کے یہ جانی دشمن ناکام و نامراد اور ذلیل و رسوا ہوئے۔ یہ ذلت و رسوائی ان پر مسلسل مسلط رہی اور وہ جزیرۃ العرب سے جلاوطن ہو جانے کے بعد ساری دنیا میں دربدر خاک بسر بھٹکتے رہے تا آنکہ ۱۴۹۲ء کا سال آ گیا۔

پانچ کونوں والی پُراسرار عمارت:

یہ وہ سال ہے جس میں کولمبس ہندوستان کی تلاش میں نکلا اور جزائر غرب الہند سے ہوتا ہوا امریکا دریافت کر گیا۔ اگر ابوعبداللہ نامی کم بخت اور والد کے نافرمان حکمران کی نااہلی سے اسپین سے مسلمانوں کی خلافت ختم نہ ہوئی ہوتی تو آج براعظم امریکا و آسٹریلیا کی دریافت کا سہرا مسلمانوں کے سر ہوتا اور وہاں عیسائیت اور یہودیت کی بجائے اسلام کا ڈنکا بج رہا ہوتا۔

غرناطہ کا سقوط ۱۴۹۲ء میں ہوا جبکہ مسلمان جہاز رانوں اور جغرافیہ دانوں کی بحری مہمات اور اکتشافی جدوجہد عروج پر تھی۔ اس کے صرف دو سال بعد ۱۴۹۴ء میں مسلمان ملاّحوں اور نقشہ دانوں کی مدد سے کولمبس امریکا دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اسپین کے یہودی مسلمانوں کے دورِ حکومت میں امن وامان سے رہتے تھے کیونکہ مسلمان وسیع الظرف تھے اور عفوو درگزر سے کام لیتے تھے جبکہ ان کی جگہ لینے والے عیسائی متعصب اور تنگ دل تھے انہوں نے یہودیوں کا جینا دوبھر کردیا تھا، چنانچہ یہودی جوق در جوق اپنا سودی سرمایہ ساتھ لے کر بحرِ ظلمات کے پار نئی دریافت شدہ دنیا میں پہنچنے لگے۔ (یہودی اس نقل مکانی کو فرعون کی غلامی سے بھاگ کر ملک کنعان...... فلسطین...... میں بس جانے سے تشبیہ دیتے ہیں) اور یوں دنیا میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کے نام سے وہ سلطنت وجود میں آئی جو "عظیم تر اسرائیل" کی تشکیل اور دجّال کی عالمی حکومت کے باضابطہ قیام سے قبل ایک عبوری حکومت ہے۔ امریکا اگر عیسائی ریاست ہوتا تو اس کا سب سے بڑا تہوار کرسمس ہوتا جبکہ اس کا سب سے بڑا سرکاری تہوار THANKSGIVING ہے جو دراصل یہود کے مذہبی تہوار Jewish festival of Havrcest of Succoth کا دوسرا نام ہے۔ اس کے صدر کی رہائش گاہ جسے عرف عام میں وہائٹ ہاؤس کہتے ہیں دراصل یہودیوں کی اصطلاح میں وہ عبوری مرکزِ حکومت ہے جو اسرائیل سے باہر ہو اور "ہیکل سلیمانی" (جو ان کے خیال میں دجّال کا مرکزِ حکومت ہوگا) سے قبل اس کا قائم مقام ہو۔ امریکی وزارتِ دفاع کا مرکز اور سپریم کمانڈر ہیڈ کوارٹر کو مخمس یعنی پانچ کونوں پر مشتمل عمارت کی شکل میں بنایا جانا اتفاق نہیں، دراصل یہ "پنج گوشہ" عمارت حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر یا ڈھال (مہرِ سلیمانی یا سپر سلیمانی) کے نقش کے مطابق قائم کی گئی ہے اور یہودی معتقدات کے مطابق دجالِ اکبر کے ظہور سے قبل دجالِ اصغر کی فوج کا عالمی صدر دفتر ہے۔ یہاں ۲۷ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ جن میں سات ہزار ماہرینِ نفسیات ہیں۔ ان کے پاس ہر ملک کے ہر لیڈر کی فائل موجود ہے۔ عالم اسلام کے تمام رہنماؤں کے علاوہ جتنی اہم جماعتیں اور جتنی اہم سرکردہ شخصیات ہیں ان کا ریکارڈ اس ادارہ میں اکٹھا کیا

جاتا ہے اور یہ ماہرین نفسیات ان شخصیات کا مکمل تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں پالیسیاں تشکیل دیتے، ان سے نمٹنے اور اپنے اہداف متعین کرتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا یہودیوں کے طویل سیاسی و روحانی سفر کی درمیانی منزل ہے جس کی سرکاری مہر اور نشان...... مشہور فری میسن مہر اور نشان ہے۔ اس کا پہلا صدر اور بانی جارج واشنگٹن نہ صرف یہ کہ کٹر فری میسن تھا بلکہ اس کا شمار یہود کے نامور روحانی پیشواؤں میں ہوتا ہے۔ اس نے امریکا کی جنگِ آزادی کو فری میسن کے سیاسی وعسکری ماہرین کے ترتیب دیے گئے انقلاب فرانس کی طرز پر آگے چلایا اور یہود کے ماسٹر پلانرز کی بہترین منصوبہ بندی سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ستّر بزرگوں کی مجلس:

غور کرنے والوں کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ نہ صرف یہ کہ امریکا کے ریاستی اداروں کی تعمیر یہود کی فلاسفی کی آئینہ دار ہے بلکہ اقوامِ متحدہ اور اس کے ذیلی ادارے بھی ان مخصوص علامات سے خالی نہیں جو یہود کے شیطانی دماغ کی تخلیق ہیں۔ مثلاً: سلامتی کونسل کی نشستوں کے انداز ترتیب کو لے لیجیے۔ یہ نصف دائروی نشست گاہ اس قدیم مجلس کی یادگار ہے جو کسی زمانے میں ہیکل سلیمانی کے احاطے میں یہود کے ''ستر بزرگوں'' کے لیے ترتیب دی جاتی تھی اور وہ CATENARIANARCH کے طرز پر بنی اس مجلس میں بیٹھ کر فیصلے جاری کیا کرتے تھے۔ گویا کہ موجودہ سلامتی کونسل ایک عبوری سلامتی کونسل ہے۔ جب (خدانخواستہ) مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر ہو کر عظیم ریاست اسرائیل قائم ہو جائے گی (عراق پر قبضہ اس کا ایک حصہ ہے جس میں حصہ لینے والی ابلیسی فوج کی مدد کے لیے خیر امت کے خیر العسا کر حصہ لینے کے لیے کمربستہ ہو چکے ہیں) تو قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی یہ موجودہ سلامتی کونسل ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ''ستر بزرگوں'' پر مشتمل وہ سلامتی کونسل بن جائے گی جو ہیکل سلیمانی کے اندر اجلاس منعقد کرے گی اور دجّال کی عالمی حکومت کا نظام چلائے گی۔

کوئی تو بتائے!:

تو اے میری قوم کے لوگو! یہ ہے وہ داستانِ دل خراش جس کو سن کر تم میں کی اکثریت اسے

مولویوں کا پاگل پن قرار دے کر ہنسے گی .... لیکن قسم بخدا یہ ہنسنے کا موقع نہیں، رونے کا مقام ہے کہ ہمیں یعنی اہلِ پاکستان کو اللہ ربّ العزت نے اسرائیل کی ابلیسی ریاست کے مقابلے میں پاکستان کی شکل میں رحمانی سلطنت کے قیام اور تعمیر و ترقی کے لیے منتخب فرمایا لیکن ہم اپنا مقام و مرتبہ پہچاننے، اسلام اور اہلِ اسلام کی خدمت کرنے اور اپنی بنیادوں کی طرف پلٹ کر انہیں مستحکم کرنے کی بجائے نصف صدی سے بنی اسرائیل کی مانند ''وادی تیہ'' میں بھٹک رہے ہیں۔ قرآنی نظامِ حکومت اور مدنی معاشرے کی تشکیل کی بجائے مغربی نظامِ حکومت کے دلدادہ اور ابلیسی معاشرت پر فریفتہ ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے استقبال کی تیاری اور ان کے دشمن دجّالِ اکبر کی سلطنت کے خلاف اعلانِ جہاد کی بجائے دجّال کے استقبال پر آمادہ اور اس کے پایۂ تخت کو تسلیم کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ہمارا پیارا وطن اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل فوج ہمیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے دی گئی تھی، ہم نے اس وطن کو عالمی حکومت الٰہیہ کا پایۂ تخت اور اس کی فوج کو اسلام کے عالمی خادم بنانا تھا، مگر ہم اسے دجّال کی عبوری حکومت کا حلیف اور پاک فوج کو یہودیت کے معاونین بنانے کے ''عظیم اور تاریخ ساز'' فیصلے کر رہے ہیں۔ کسی قوم نے اپنے ساتھ وہ کچھ نہ کیا ہوگا جو ہم نے کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آخر کوئی تو بتائے کہ ہم کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ اور کس منزل کی طرف جا رہے ہیں؟

دو انوکھی مثالیں

اللہ تعالیٰ کی عادت مبارکہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی نیکی کا بدلہ اس کی قربانی کے مطابق اور بدی کی سزا اس کے گناہ سے ملتی جلتی دیتے ہیں۔ اس کی دو مثالیں بہت ہی سبق آموز اور انوکھی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرنے والوں کو اس بات کی خوشخبری دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کیا گیا سودا بہر حال نفع کا سودا ہوتا ہے اس میں خسارے کا کوئی امکان نہیں اور اس کے دشمنوں کو اس چیز سے ڈراتی ہیں کہ ان کی مہلت جتنی لمبی ہو لیکن ایک دن وہ ضرور گرفت میں آئیں گے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ دو مثالیں صرف اسلام کی ہی نہیں اس کائنات کی تاریخ کی منفرد مثالیں ہیں۔ اس اعتبار سے بھی کہ ان دونوں کا تعلق اس کائنات کے اختتامی دور سے ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ دنیا کے تین بڑے آسمانی مذاہب اسلام، عیسائیت اور یہودیت میں ہونے والی پیش گوئیوں سے تعلق رکھتی ہیں اور ان تینوں مذاہب کے ماننے والے اپنے اپنے مذہب اور نظریے کے سارے عالم پر غلبے کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں، ان دونوں مثالوں کا تعلق ان کے فیصلہ کن نتائج سے ہے۔

پہلی مثال خلیفہ آخر الزماں، مہدی منتظر، محمد بن عبداللہ (جو کہ حضرت حسن بن فاطمہ بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہوں گے) کی ہے۔ حدیث شریف میں قیامت کی جو علامات صغریٰ وکبریٰ بیان ہوئی ہیں ان میں حضرت مہدی (ان کے نام کے شروع میں امام اور آخر میں علیہ السلام کا لفظ نہ لگانا چاہیے۔ دیگر محترم ہستیوں کی طرح حضرت کا لفظ لکھنا چاہیے) کے بارے میں اس کثرت سے احادیث وارد ہوئی ہیں کہ معنوی اعتبار سے وہ حد تواتر تک پہنچ گئی ہیں۔ ''متواتر'' اس حدیث کو کہتے ہیں جو صحیح ہو اور جسے ایسے ثقہ راویوں نے بیان کیا ہو جن کا کذب پر

اتفاق محال ہو۔ اگر لفظ ایک جیسے ہوں تو یہ تواتر لفظی ہے اور جب یہ روایات معنوی طور پر بعینہ ملتی ہوں، الفاظ میں تھوڑا بہت اختلاف ہو تو ایسی حدیث کو ''متواتر معنوی'' کہتے ہیں اور جمہور علما کے نزدیک اس سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے۔ امام شوکانی (المتوفی ۱۲۵۰ھ) اپنی مشہور کتاب ''نیل الاوطار'' اور ''التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر والدجّال والمسیح'' میں حضرت مہدی کے بارے میں وارد تمام احادیث کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں: ''حضرت مہدی کے سلسلہ میں وارد ہونے والی قابلِ اعتماد احادیث کی تعداد ۵۰ ہے۔ ان میں صحیح بھی ہیں، حسن بھی۔ یہ سب احادیث بلاشک وشبہ متواتر ہیں۔'' نواب صدیق حسن خان قنوجی (متوفی ۱۳۰۷ھ) نے اپنی کتاب ''الإزاعة لما كان ومايكون بين يدى الساعة'' میں کہا ہے کہ مہدی کے بارے میں مختلف سندوں سے اس کثرت سے احادیث آئی ہیں کہ وہ حدِ تواتر تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر اکابرِ علماء اسلام نے ان احادیث کے جمع اور تشریح وتوضیح پر خاص توجہ دی ہے اور اس بارے میں ۳۰ سے زائد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بندہ ان میں سے ایک درجن سے زائد کتابوں کو براہِ راست اور نصف درجن کے قریب کتب کے اقتباسات کو بالواسطہ بحوالہ دیگر کتب مطالعہ کر چکا ہے۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ آخر زمانہ میں اللہ تعالیٰ اُمّتِ محمدیہ میں اہل بیت میں سے ایک سیدزادہ تیار کرے گا جو مہلک فتنوں اور خونریز جنگوں میں مسلمانوں کی قیادت کرے گا۔ وہ سامرا کے تہہ خانے سے نمودار نہیں ہوگا بلکہ حسن بن فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے سادات خاندان کا ایک نوجوان ہوگا جس کا نام محمد بن عبداللہ ہوگا۔ یعنی اس کا نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام جیسا اور اس کے والد کا نام آپ کے والد کے نام جیسا ہوگا۔ وہ خلیفہ راشد اور قائد مہدی یعنی ہدایت یافتہ رہنما ہوگا۔ وہ اول تا آخر سراپا جہاد اور مجاہدِ اعظم ہوگا۔ جہاد اس کا اوڑھنا بچھونا ہوگا۔ جہاد کی برکت سے وہ ظلم وفتنہ سے بھرے ہوئے خطۂ ارض کو عدل وانصاف سے بھر دے گا۔ سات آٹھ یا نو برس تک حکومت کرے گا اس کے دورِ حکومت میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد لوگ اس طرح ناز ونعمت سے زندگی بسر کریں گے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ رات بھر میں مہدی کو تیار کر کے اس کی اصلاح کرے گا اور اس کی پشت پناہی کرے گا۔

''اللہ اس کی اصلاح کرے گا'' یہ حدیث شریف کا جملہ ہے۔ اس تعبیر کے کیا معنی ہیں......؟
اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ا۔ اس میں کچھ چھوٹے چھوٹے نقص (صغیرہ گناہ) ہوں گے۔ اللہ اس کی توبہ قبول کر کے اس کو توفیق بخشے گا اور رشد و ہدایت اس کے دل میں ڈال دے گا۔ پہلے سے اس کی یہ کیفیت نہ ہوگی۔ ۲۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ اسے خلافت اور آخری زمانے کے فتنوں اور جنگوں کے درمیان مسلمانوں کی قیادت کے لیے تیار کرے گا۔ دونوں معانی مراد ہو سکتے ہیں۔

آج کل پیر نما گمراہ لوگوں اور سستی اور جھوٹی شہرت و مقبولیت حاصل کرنے کے خواہش مند کذابوں نے مہدی ہونے کے دعویٰ کو فیشن بنالیا ہے۔ اگر عوام الناس کو حضرت مہدی کے بارے میں صحیح احادیث میں وارد شدہ علامات معلوم ہوں تو وہ کبھی ان دجالوں کے ورغلانے میں نہ آئیں گے۔ پہلی بات یہ یاد رہنی چاہیے کہ حضرت مہدی کسی غار کے دہانے یا کسی ملنگ کے آستانے پر کھڑے ہو کر دعویٰ نہ کریں گے۔ ان میں ایسی قائدانہ صفات ہوں گی کہ وہ گمنام رہنا چاہیں گے لیکن لوگ انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ دعویٰ تو کجا لوگوں سے چھپیں گے کہ کہیں ان کو امیر نہ بنالیا جائے۔ لوگ ان میں قیادت کی صفات دیکھ کر ان کی بیعت پر اصرار کریں گے اور انہیں قیادت قبول کرنے پر مجبور کریں گے، لہٰذا جھوٹے مہدی کی پہلی علامت یہی ہے کہ مہدی ہونے کا دعویٰ کرے۔ ایسا شخص بلاشبہ کذّاب اور شیطان ہے۔ پھر حضرت مہدی عربستان میں ظاہر ہوں گے۔ ان کے ہاتھ پر امارت اور جہاد پر بیعت بیت اللہ اور مقامِ ابراہیم کے درمیان ہوگی۔ لہٰذا جو مہدی کہیں اور ظاہر ہوتا ہے یا جس مہدی کا جہاد سے تعلق نہیں اس کا دعویٰ مہدویت لپیٹ کر اسی کے منہ پر مار دینا چاہیے۔ حضرت مہدی کے ہاتھ پر بیعت وہ لوگ کریں گے جن کے پاس کوئی قوت ہوگی نہ تعداد اور نہ ہی ساز و سامان۔ ان کو اپنوں پرایوں سب کی مخالفت کا سامنا ہوگا، حتیٰ کہ کچھ کم بخت مسلمان ان کو گرفتار کرنے کے لیے آئیں گے۔ حضرت مہدی اور ان کے ساتھی خانۂ کعبہ میں پناہ لیے ہوں گے۔ اس وقت سچے مہدی کی سب سے بڑی علامت ظاہر ہوگی جو یقینی علامت ہے اور جس میں نہ پائی جائے وہ مہدی (ہدایت یافتہ) نہیں، ضال و مضل (گمراہ اور گمراہ کنندہ) ہے۔ وہ یہ کہ یہ مخالف لشکر

مدینہ منورہ سے تھوڑی دور ذوالحلیفہ کے مقام پر سارا کا سارا زمین میں دھنس جائے گا۔ زمین پھٹے گی اور انہیں نگل کر دوبارہ پہلے جیسی ہو جائے گی۔ ایک دو آدمی بچ جائیں گے جو لوگوں کو اس عظیم حادثے کی خبر دیں گے۔ یہ خبر سن کر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ بیت اللہ کے یہ پناہ گزین ہی خلیفہ آخرالزماں ہیں جو مسلمانوں کے لیے جہاد کے قائد ہوں گے اور پھر جن لوگوں کی قسمت میں سعادت اور نیک بختی لکھی ہے اور جو گناہوں کے دور میں دین پر استقامت کے ساتھ جمے رہیں گے، اپنی زبانوں اور شرم گاہوں کو حرام سے آلودہ نہیں ہونے دیں گے، وہ جوق در جوق جماعتوں کی شکل میں آکر ان کی بیعت کریں گے، یعنی ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر انکی اطاعت اور دین کی سربلندی کے لیے جان و مال سے جہاد کا وعدہ کریں گے۔ ان کا ایک ہی نعرہ ہوگا ''فتح یا شہادت'' سچے مہدی اپنے ان جانثاروں سے اپنے لیے کوئی مالی مفاد حاصل نہ کریں گے بلکہ انہیں ان چیزوں کی فرصت ہی نہ ہوگی۔ وہ تو فوراً ہی ایسے معرکوں میں کود پڑیں گے جو انتہائی خونریز اور مردانگی کا امتحان ہوں گے۔ سارا عالم ان سے جنگ پر کمربستہ ہوگا اور وہ اپنے مجاہد ساتھیوں کے ساتھ پورے عالم پر غلبۂ اسلام کے لیے میدان میں نکل آئیں گے۔ مختصر سے عرصے میں وہ جزیرۃ العرب کے ''کچھ'' عرب مسلمانوں سے، فارس کے ''کچھ'' فارسی مسلمانوں سے، لادین ترکوں سے، یورپ کے عیسائیوں سے، خوزستان اور کرمان (موجودہ روس) کے کمیونسٹوں سے اور آخر میں یہودیوں (امریکا اور اسرائیل) سے جہاد کریں گے اور ان سب جنگوں میں اللہ رب العالمین کے حکم سے ان کے مجاہدین کو فتح ہوگی۔ اللہ کے دین کا ہر سُو بول بالا ہوگا اور اسلام کو پورے کرۂ ارض پر وہ عروج نصیب ہوگا جس کی عرصہ سے مسلمان تمنا کرتے چلے آئے ہوں گے۔ جو مسلمان اس نیک بختی میں سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے گناہوں سے توبہ کرے، حُبِ جاہ وحُبِ مال سے پیچھا چھڑائے اور خود کو اور اپنی اولاد و متعلقین کو خونریز معرکوں میں مسلمانوں کی حمایت کے لیے جہاد کی بہترین تربیت دے کر تیار کرے۔

حضرت مہدی کے بارے میں یہ چند باتیں ۵۰ سے زائد ان احادیث اور ڈیڑھ درجن

سے زائد ان کُتب کا خلاصہ اور مصداق ہیں جو ان کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ انہیں نقل کرنے کی غرض یہ ہے کہ حضرت مہدی کا مقصدِ ظہور جہاد کے ذریعے اسلام کا غلبہ ہوگا۔ جو شخص مہدی ہونے کا دعویٰ کرے اور شعبدوں کے ذریعے جہاد کے علاوہ کسی اور بات پر لوگوں کو جمع کرے یا اپنی کرشماتی شخصیت جتا کر لوگوں کی عقیدت کا رخ دین کی بجائے اپنی ذات کی طرف موڑے، وہ کذّابِ اکبر ہے اور جو شخص عالمِ اسلام کے رہنماؤں سے بیزار ہو کر اسلام کے غلبے کے لیے کسی قائد کی خواہش رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کرے، جہاد سے وابستہ رہے، اپنی نسلوں میں اس مبارک فریضے کو زندہ کرے، ان شاء اللہ ان فضائل سے کسی نہ کسی حد تک حصہ پالے گا جو حضرت مہدی کے ساتھ مل کر دجالِ اکبر سے لڑنے والے مجاہدین کو حاصل ہوں گے۔ مہدی منتظر کے ظہور کی بحث، قوتِ عمل اور جدوجہد کو معطل چھوڑ کر آسمان کی سمت نظریں لگانے اور کسی خودرو انقلاب کے انتظار میں دنیا پرستی میں لگے رہنے کا بہانہ نہیں، یہ تو جدوجہد پر استقامت اور آخرت کی تیاری کی ترغیب ہے۔

اب ہم اس بات کی طرف لوٹ چلتے ہیں جس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ اللہ رب العزت کی عادتِ مبارکہ ہے کہ نیکی یا بدی کے اَجر یا سزا کو اس کے مشابہ بناتے ہیں تاکہ ان کا انعام بندے کی قربانی اور ایثار کے مطابق ہو جائے۔ نواسۂ رسول حضرت حسن رضی اللہ عنہ وارضاہ نے امت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے بے مثال تواضع و ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ ان کا یہ عمل اُمّت کی وحدت کے لیے انجام دیا گیا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کے نتیجے میں بہت سی قیمتی جانیں، اَموال، اوقات اور وسائل بچ گئے اور اسلام اور مسلمانوں کے فائدے میں استعمال ہوئے۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا یہ صلہ دیا کہ ان کی اولاد میں ایسے شخص کو پیدا کریں گے جس کی قیادت میں اُمّت ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائے گی، اس کے ذریعے پورے کرۂ ارض پر نظامِ خلافت قائم ہوگا اور اُمت میں ایسا اتحاد و اتفاق دیکھنے میں آئے گا جو بے مثال اور عدیم النظیر ہوگا۔

دوسری مثال حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کی ہے۔ ان کے خلاف یہود نے جو حاملینِ کتاب اللہ تھے، بغاوت پر کمر باندھ لی۔ ان کی والدہ پر عظیم بُہتان باندھا اور ان پر جھوٹے الزامات لگا کر اور جھوٹی گواہیاں دلوا کر انہیں قتل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دور میں یہودیوں کے تین طبقات ہوگئے تھے۔ (ہم میں سے ہر ایک اپنے گریبان میں جھانکے کہیں وہ اس طرح کے کسی ایک طبقے میں سے تو نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے تم لوگ پچھلوں کی ہو بہو پیروی کروگے) ایک طبقہ دین میں تحریف کررہا تھا (جیسے آج کل کے مغرب زدہ اسکالروں کی اسلامائزیشن کی تحریک) انہیں فریسی کہتے تھے۔ دوسرا خود کو دین سے آزاد کرچکا تھا (جیسے آج کل کا خوش حال طبقہ، ہائی سوسائٹی کے افراد) یہ سن ہیدرن کہلاتے تھے۔ تیسرا طبقہ اسین (ESSENES) نامی تھا جو انتہائی متشدد اور شدت پرست تھا، یہ جاہل اور متشدد رہبان پر مشتمل تھا جیسے آج کل کے علمائے سوء ہوتے ہیں۔ ان تینوں طبقوں نے سیدنا حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ علیہ السلام کی دعوت کو دبانے اور ان کے مشن کو ناکام بنانے کے لیے ایسا فساد برپا کیا کہ ان کی جان لینے کے درپے ہوگئے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو محفوظ و مامون بچا کر زندہ آسمانوں پر اٹھالیا اور آخرت کے قریب جب ان کے یہی دُشمن اپنے عالمی لیڈر دجّالِ اکبر کی قیادت میں فلسطین میں جمع ہوں گے تو انہیں آسمان سے واپس اتار دیا جائے گا تاکہ دجّال ان کے ہاتھ سے اور اس کے چیلے چانٹے اسلامی لشکر میں شامل مجاہدین کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد چونکہ جہاد کے مکلف نہ تھے، ان میں سے ایک نے غدّاری بھی کی اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں (صحابہ کرام) کے نام لیواؤں (مجاہدین) کو یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ وہ جناب مسیح بن مریم علیہ السلام کے ساتھ مل کر ان کے دشمنوں سے انتقام لیں اور جس طرح ان کے بڑوں نے اپنی جان پر کھیل کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور ان کے دشمنوں کو تہہ تیغ کیا، اس طرح ان کے آخری لوگ حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کے گرد جمع ہوکر جانثاری کا مظاہرہ کریں گے اور مغفرت و جنت کی ایسی بشارت پائیں گے جیسی ان کے بڑوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) کو ملی تھی۔

بہت سے انبیائے کرام دینِ حق کی دعوت کی پاداش میں قتل ہوئے مگر دشمنوں کے حملے سے بچ کر صحیح سالم آسمانوں پر جانا اور پھر واپس آ کر انہیں تہہ تیغ کرنا صرف اللہ کے پیارے بندے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انوکھی خصوصیت ہے۔ یہود عالمی اقتدار کو اپنی وراثت گردانتے ہوئے مسیحا (دجّال اکبران کا مسیحا ہے) کے ظہور کے لیے کتنی بھی سرگرمی دکھائیں لیکن درحقیقت وہ اپنے حتمی انجامِ کار کے لیے اسرائیل میں جمع ہوئے ہیں اور ان کا انجامِ کار وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ انبیاء میں بیان کیا ہے: ''اور جس بستی کو ہم برباد کر دیں تو ممکن نہیں کہ وہ دنیا میں پھر پلٹ سکے۔'' (الانبیاء:۹۵) اسرائیل اور اُمّت مسلمہ کے مابین کشمکش دراصل عہدِ حاضر کی امّت مسلمہ اور سابقہ اُمّتِ مسلمہ جو اپنے منصب سے معزول ہو چکی ہے، کے درمیان وہ معرکہ ہے جس میں استقامت دکھانے والے ہی سرخ رُو ہوں گے۔

صدرِ پاکستان نے پچھلے ہفتے لاہور کے گورنر ہاؤس میں ایڈیٹروں اور کالم نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا ایشو امریکی خوشنودی کے لیے نہیں اٹھایا گیا بلکہ اس کا مقصد اسرائیل اور بھارت کے درمیان بڑھتے ہوئے فوجی تعلقات کو حد میں رکھنے کے لیے قومی ذہن کو تحریک دینا تھا۔ یہ ''تحریک'' انتہائی عجیب و غریب ہے۔ جب یہود نے ''میثاقِ مدینہ'' کے عنوان سے عہد و پیمان کر لینے کے باوجود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی ریاست سے غداری کی، ان کے دشمنوں کو اکٹھا کر کے ان پر چڑھا لایا، تو وہ آج ہماری طرف سے اسے یکطرفہ تسلیم کر لینے سے کس طرح ہمیں بخشنے اور ہمارے دشمنوں سے تعلقات کم کرنے پر راضی ہو جائیں گے؟؟؟ ہم نے خود کو امریکا کا بااعتماد حلیف ثابت کرنے کے لیے کیا نہیں کیا؟ کیا اس نے بھارت سے فوجی تعلقات کم کر دیے ہیں؟ اگر ہم بیرونی خطرات کے تحت اپنے اس تاریخی دشمن کی ریاست کو سندِ تسلیم عطا کر دیں تو کیا وہ ان قادیانی، بہائی اور آغا خانی ایجنٹوں کو واپس بُلا لے گا جو اس نے اپنے ہاں پال کر ہمارے یہاں چھوڑ رکھے ہیں؟ خدارا! اے اہلِ فکر و نظر! اے اہلِ حل و عقد! اس بات کو سمجھیے کہ یہود کا علاج بالمثل نہیں، بالضد ہوتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ یہودی باقی تمام انسانیت کو گویم اور جنٹائل کا نام دیتے ہیں یعنی انسان نما جانور۔ وہ پوری دنیا پر براہِ راست اقتدار چاہتے ہیں۔ ان کے اس عالمی حکمرانی کے منصوبے کے خدوخال دیکھنا چاہیں تو اسرائیل کی سرکاری ویب سائٹ TEMPLE MOUNT FAITHFUL.ORG ملاحظہ کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان سے خود کو تسلیم کروانا، ان کے مرحلہ وار منصوبے کا حصہ ہے۔ مختصراً ان کے Steps یہ ہیں: ریاستِ اسرائیل کا قیام اور عرب حریفوں پر کنٹرول، ارضِ موعود پر تمام دنیا سے یہود کو اکٹھا کر کے آباد کرنا، مسجدِ اقصیٰ کی بازیابی اور (نعوذ باللہ) انہدام، ہیکل سلیمانی کی تیسری مرتبہ تعمیر [پہلی دو مرتبہ اسے یہود کے دشمنوں نے ڈھا دیا تھا] آخری مرحلہ اسرائیل کے مسیحا اور عالمی بادشاہ مسیح ابن داؤد کی آمد اور اس کی عالمی سلطنت کا قیام۔ اسرائیلی قوم درحقیقت خدا کی واحد موعود قوم ہونے کی دعویدار ہے جبکہ پاکستانی قوم کو اللہ ربّ العزت نے قیامِ پاکستان سے لے کر خونریز جنگوں اور ایٹمی دھماکوں تک خصوصی تائید سے نوازا ہے۔ اور یہ اس وقت روئے زمین پر اسرائیل کا واحد مدِ مقابل ہے گویا کہ یہ قدرت کا انتخاب ہے۔ اسے قدرت نے روزِ اول سے دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جینے کا موقع دے کر جذبۂ جہاد کی حرارت عطا فرمائی ہے جو مسلمان کی آبرو اور تکریم کی ضامن ہے۔ ہمیں اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرنی چاہیے اور اپنی کم نگاہی اور کوتاہ بینی سے اس کی ناشکری نہ کرنی چاہیے کہ قانونِ ربانی ہے کہ نیکی کا اجر اور بدی کی سزا اس سے ملتی جلتی ملتی ہے۔

اے میرے معزز ہم وطنو! آؤ اس یومِ آزادی پر عہد کریں کہ اس وطن کی تعمیر کریں گے اور اپنی اور سارے دنیا کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے۔ ان پر غلامی مسلط کرنے والوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے کی بجائے انہیں اس انجام تک پہنچائیں گے جس تک انہیں پہنچانے کے لیے خدا نے ہمیں منتخب کیا ہے۔

تلاش کا سفر

شہرت کی خواہش انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے، یہ درحقیقت انسان کے لیے آزمائش ہے کہ وہ دوسری فطری خواہشات کی طرح اس پر قابو پاتا اور اسے مناسب حد میں رکھتا ہے یا نہیں؟ حضرات صوفیاء کرام جو انسان کے باطن کو لگنے والے امراض کی پہچان اور علاج کے ماہر ہوتے ہیں ان کی اصطلاح میں اس کو ''حُبِّ جاہ'' کہتے ہیں۔ کتبِ تصوف میں دیگر روحانی امراض کی طرح اس مرض کی علامت، اسباب، نقصانات اور علاج تفصیل سے تحریر ہے۔ تصوف دراصل نام اس علم کا ہے کہ جو گناہ انسان کا باطن یعنی دل، نفس اور ضمیر کرتا ہے ان کی صحیح صحیح تشخیص اور علاج کیا جائے اور جو جو نیکیاں اور اچھے اوصاف انسان کے اندر کی دنیا میں پائے جانے چاہییں ان کو حاصل کیا جائے۔ اہلِ تصوف کے یہاں مروّج تمام اذکار، افکار اور اشغال کا مقصد یہی ہے۔ جو محترم حضرات تصوف کے مخالف ہیں انہوں نے تصوف کو اہل تصوف سے سمجھا ہی نہیں یا پھر یار لوگوں کی گھڑی ہوئی جاہلی حرکتوں پر تصوف کا لیبل دیکھ کر گھبرا گئے ہیں۔ الغرض اس فن کے ماہرین کا اتفاق ہے کہ حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال دو ایسی جراثیم افزا بیماریاں ہیں جو کئی دوسری روحانی بیماریوں کو جنم دیتی ہیں۔

حُبِّ جاہ کا مرض یوں تو کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس مرض کی سب سے خطرناک صورت یہ ہے کہ انسان غیروں (یعنی غیر مسلموں) کی نظر میں مقبولیت یا پسندیدگی کا خواہش مند بن جائے یا ان سے حسنِ کارکردگی کی سند یا صلہ پانے کی امید اس کے دل میں جگہ بنا لے۔ اس وقت مسلم دنیا کے حکمران یا بااثر طبقے کی اکثریت اس مرض کے خطرناک مرحلے کا شکار ہے۔ اسی طرح جدید تعلیم یافتہ طبقے میں سے وہ لوگ جو مشرقی روایات سے دستبرداری کی

حد تک مغرب کے پیروکار بن چلے ہیں وہ بھی احساسِ کمتری، مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی کے سبب شعوری یا لاشعوری طور پر اس مرض کا شکار ہیں۔ ان کی ہر حرکت، ہر ادا، ہر فیشن اسی ذہنیت کا غماز ہوتا ہے۔ مسلم حکمرانوں کے ایامِ اقتدار کا ہر لمحہ اس کوشش میں گزرتا ہے کہ انہیں بہرصورت ان نادیدہ طاقتوں کی خوشنودی حاصل رہے جو ان کے خیال میں ''بادشاہ گر و بادشاہ ساز'' ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ طاقتیں جب ان سے پوری طرح خوش ہوں تب بھی ان کی نظر میں اس شخص سے کم ظرف کوئی نہیں ہوتا جو ان کے اشاروں پر اس لیے چلتا ہے کہ اسے فانی دنیا کے فانی مزے چند دنوں تک وافر مقدار میں ملتے رہیں۔ مراعات یافتہ اور مغرب سے مرعوب طبقے کی زندگی کا پہیہ بھی اس محور کے گرد گھومتا ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق نظر آئیں اور کسی لمحے بھی آؤٹ آف ڈیٹ دکھائی نہ دیں حالانکہ مغرب کے منصوبہ سازوں کی نظر میں ان کی حیثیت چابی کے بھالو یا ٹین کے بندر سے زیادہ نہیں ہوتی اور وہ ان کی ''پروقار شخصیت'' کو مضحکہ خیزی کا بدنما نمونہ سمجھتے ہیں اور مسلمانوں ہی پر کیا موقوف، مغربی ممالک جن کی روایات و ثقافت اور سیاست و معیشت یہود کے ابلیسی پنجے میں ہے خود ان کی قوم کا آدمی اس وقت تک ان کی نظر میں پسندیدہ نہیں جب تک وہ ان کی مرضی کا ساز بجانے والا طنبورہ نہ بن جائے، گویا کہ ان کی خودغرض نظر میں اہمیت صرف اور صرف ان کے مفاد اور منشا کی ہے چاہے اسے کوئی ان کا اپنا پورا کرے یا غیر۔ یہ ایک غیر مبہم حقیقت ہے لیکن چونکہ ہم میں وہ قوتِ ایمانی نہیں جو خاکی کو نوری سے بلند کرتی ہے نہ وہ قوتِ عشق ہے جو پست کو بالا کرتی ہے، لہٰذا ہم اس بات کو سمجھ کر بھی نہیں سمجھ پاتے۔ آج کے رعب زدہ مسلمان کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کی ازحد ضرورت ہے کہ مسلمان کی عزت غیروں سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی بجائے اس انفرادیت میں ہے جو خوداعتمادی سے پیدا ہوتی ہے اور اس خوداعتمادی کو حاصل کرنے کا آسان نسخہ سنتِ نبوی کی پیروی ہے، مغرب کی اتاری ہوئی پینٹیں اور گھسے ہوئے جوتے پہننے سے یہ گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔

آپ فوک برناڈاٹ کی کہانی کو لے لیجیے۔ یہ یورپی شخص زمانہ طالب علمی میں اسکاؤٹس کا

گروپ لیڈر تھا۔ اپنے شوق اور لگن کے سبب ترقی کرتے کرتے سویڈن کی ''صلیب احمر'' (ریڈ کراس) کا سربراہ بن گیا۔ جنگِ عظیم دوم میں اس نے یہودیت کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ جب جرمنی میں یہودیوں پر نازی ازم کا کوڑا برس رہا تھا تو اس شخص نے عقوبتی کیمپوں سے یہودیوں کو بچا بچا کر نکالنے میں اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی۔ وہ چونکہ یہودیوں کو مظلوم سمجھتا تھا اس لیے اپنی جان پر کھیل کر سینکڑوں یہودیوں کو موت کے منہ سے نکال کر محفوظ مقامات تک پہنچاتا رہا۔ اس طرح اسے یہودیوں نے اپنا محسن قرار دیا اور یہ غیر یہودی شخص یہودیوں کے ہاں بہت معتبر بن گیا مگر اسے خبر نہ تھی کہ اس کے سامنے معصومیت، معقولیت پسندی اور شرافت کا روپ دھارنے والے یہودی ایک دن پاگل عفریت بن کر اس سے چمٹ جائیں گے اور اس کی جان لے کر چھوڑیں گے۔ ۲۰ مئی ۱۹۹۷ء کو اسے اقوامِ متحدہ کی طرف سے اسرائیل اور عربوں کے درمیان ثالث بنا کر بھیجا گیا، یہودیوں نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا اور ان کی طرف سے اس تقرری پر نہایت خوشی کا اظہار کیا گیا۔ برناڈاٹ نے اپنی صلح جو اور امن پسند طبیعت کے پیشِ نظر آتے ہی صہیونی جنونیوں اور نہتے فلسطینیوں کے درمیان لڑائی روکنے کے لیے اپنے پورے اختیارات استعمال کیے اور شر پسندی کو محدود سے محدود تر کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ اس نے فلسطین کے حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا اور ۱۵ ستمبر کو ''برناڈاٹ پلان'' پیش کیا۔ یہ پلان بھی اس کی منصف مزاجی اور صلح پسندی کا آئینہ دار تھا لیکن ''ویقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس'' (اور جو انصاف کا فیصلہ دینے والوں کو قتل کرتے ہیں) کے مصداق اس کے قتل کا پروانہ ثابت ہوا۔ اس نے تجویز دی کہ:

''اگر صیہونیوں کو انسانیت کے نام پر فلسطین کا کوئی حصہ دیا جائے تو ناگزیر ہے کہ ساتھ ساتھ فلسطینیوں کو بھی دو پیشکشیں کی جائیں۔ اولاً: یہ کہ وہ مستقبل میں جب جی چاہے فلسطین میں اپنے گھروں کو لوٹ سکتے ہیں۔ دوم: یہ کہ اگر وہ فلسطین میں دوبارہ واپس آنا چاہیں تو ان کی جائیدادوں پر قبضے کے عوض اسرائیل انہیں معقول معاوضہ ادا کرے گا۔''

خلاصہ اس پلان کا یہ تھا کہ کوئی فلسطینی مسلمان کسی بھی وقت یہ حق رکھتا ہے کہ یا تو فلسطین

میں واقع اپنے گھر میں لوٹ آئے یا اسے کوئی معقول معاوضہ دیا جائے۔ اب قطع نظر اس بات سے کہ اس تجویز میں بھی مسلمانوں سے زیادتی تھی یا نہیں؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس شخص کے ماضی کے ریکارڈ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سوچنا بھی احمقانہ بات تھی کہ وہ کوئی ''یہود مخالف'' منصوبہ بنا رہا تھا...... لیکن یہود کی محسن کشی کی عادت کی انتہا دیکھیے کہ وہ شخص جس نے تن تنہا اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تقریباً ۲۰ ہزار یہودیوں کو ہٹلر جیسے یہود دشمن سے نجات دلائی تھی اسے دوسرے ہی دن قتل کر دیا گیا اور اس کے قتل کا فیصلہ یہودیت کے اعلیٰ ترین دماغوں کے متفقہ فیصلے کے تحت ہوا اور اسے عام جاہل اور متشدد یہودیوں نے نہیں بلکہ اسحاق شمیر جیسے چوٹی کے رہنما کے حکم پر قتل کیا گیا اور یوں بوائے اسکاؤٹس کے سربراہ سے صلیب احمر (ریڈ کراس) کے اعلیٰ عہدے تک انسانی خدمت کی نیت سے پہنچنے والا شخص ان یہودیوں کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھا جن کو وہ مظلوم اور ہمدردی کے قابل سمجھتا چلا آیا تھا۔

تو میرے دوستو! یہ ہے کفر کی تاریخ اور یہ ہے اس کی ذہنیت، یہ ہم لوگوں کی بھول ہے کہ ہم ان کی نظر میں قابل اعتراض امور سے بچنا شروع کر دیں تو عزت وتکریم کے مستحق ہو جائیں گے۔ ان کی نظر میں سرخروئی حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادیت پر پوری خود اعتمادی کے ساتھ قائم رہیں۔ وہ لوگ بظاہر ایسے شخص کا جتنا بھی مذاق اڑائیں مگر اندر سے وہ اس سے مرعوب اور متاثر بلکہ خائف ہوتے ہیں۔ عزت، اللہ اور اس کے رسول کے لیے مقدر ہے جو مسلمان عزت کے ان دو سرچشموں سے ہٹ کر معزز بننا چاہے گا اس کا حشر ان کم ظرفوں جیسا ہوگا جو سقوطِ غرناطہ کے بعد جان و مال بچانے کے لیے مرتد ہو کر عیسائی بن گئے تھے۔ کوئی مسلمان اس سے زیادہ کسی غیر مسلم کی کیا اطاعت کر سکتا ہے کہ نعوذ باللہ اپنا مذہب ہی سرے سے چھوڑ دے مگر مقامِ عبرت ہے کہ ان کو تب بھی امان نہ ملی۔ عیسائی حکمران فرڈیننڈ اور اس کی متعصب ملکہ ازابیلا نے ان کے لیے انکویزیشن (INQUISTION) کا قانون بنایا۔ ان ''نومسیحیوں'' کی Door to Door رجسٹریشن کروائی گئی۔ اس قانون کی رو سے نئے عیسائیوں کو اذیت دینے کا یہ حربہ اختیار کیا گیا کہ انہیں مذہبی عدالتوں میں پیش کر کے ان پر

منافقت کا الزام لگایا جاتا اور سرِ عام اذیتیں دے دے کر آخر میں زندہ جلا دیا جاتا۔

اس موقع پر عیسائیوں نے ایسے مظالم ڈھائے کہ آج ان کی ایک جھلک پاکستان میں عیسائیت پھیلانے کے لیے سرگرم عیسائی مشنریوں کو دکھا دی جائے تو انہیں منہ چھپانے کی جگہ نہ ملے۔ ایسے بدنصیب مسلمانوں کا گھر بار اور مال و جائیداد چونکہ گرجاؤں کو مل جاتا تھا اس لیے پادری نامی مخلوق جو دنیا پرستی میں بدنامی کی حد تک شہرت رکھتی ہے، بے دریغ ان مسلمان مسیحیوں کو زندہ نذرِ آتش کرنے کی سزا دیتے جو اپنا مذہب چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہسپانیہ کے مذہبی ادارے دنیا کے امیر ترین مذہبی ادارے ہیں کیونکہ ہسپانیہ کے ہر بڑے شہر میں ان کو ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کے مکانات مفت مل گئے۔ آج اسپین اور پرتگال کی وسیع و عریض حدود میں ایک مسلمان کی قبر کا نشان نہیں ملتا البتہ قرطبہ اور غرناطہ میں مسلمانوں کے ۵۰۰ سالہ قدیم ہزاروں مکانات اور سینکڑوں مساجد ایسی ہیں جو آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں اور عیسائیوں کے زیرِ استعمال ہیں۔ مساجد کو گرجا گھر بنایا گیا اور مکانات کو لالچی پادریوں نے باہم تقسیم کر لیا۔ آج مراکش کے شمالی ساحل پر رہنے والے مسلمانوں کے پاس ان کے آبائی گھروں کی چابیاں موجود ہیں جو وہ اسپین میں چھوڑ کر آئے تھے اور وہ انہیں عیسائیوں کے تسلط سے آزاد کروانے کے لیے کسی نجات دہندہ کے منتظر ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ نجات دہندہ تو نجات کے طلب گاروں میں پیدا ہوگا ہم میں اس کی طلب کہاں؟ ہم تو ''جیو اور جینے دو'' کے فلسفے پر عمل پیرا ہیں۔

ایسے مکانات پر انکویزیشن کی ثبت کردہ مہریں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور ان حضرات کو تو ضرور دیکھنی چاہییں جو مسلمانوں کو تنگ نظر اور عیسائیت و یہودیت کو فراخ دل اور وسیع النظر سمجھتے ہیں۔ یہ مہریں دو قسم کی ہوتی تھیں: ایک کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس گھر کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ دوسری کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کا ''فیصلہ'' ہو چکا ہے۔ اب اسے کوئی نہ خریدے نہ اس میں رہنے کی جرأت کرے۔ ان مکانات پر موجود اعلیٰ عیسائی عدالتوں کی لگائی ہوئی یہ مہریں اپنے اندر کئی سبق رکھتی ہیں لیکن مقامِ عبرت ہے کہ ان کی خونی تاریخ سے سبق حاصل کرنے والے مسلمان کم ہیں اور بھیگے رہنے کے شوقین کلمہ گو نسبتاً زیادہ ہیں۔ دو ماہ قبل ۱۰ جولائی

۲۰۰۳ء کو جب غرناطہ میں الحمراء محل سے متصل البائسن (اصل عربی نام البیاضین) پہاڑی کی چوٹی پر ۵۰۰ سال بعد قائم ہونے والی پہلی مسجد کے افتتاح کے موقع پر اذان دی گئی تو اس کی وجد آفرین صدا نے مسلمانوں کو پیغام دیا ہے کہ اللہ کی نظر میں مقبولیت کی فکر کی بجائے بندہ جب اپنے جیسے گندے بندوں کی نظر میں پسندیدگی کی جستجو کرنے لگتا ہے تو قدرت اسے بھٹکنے کے لیے اس وقت تک چھوڑ دیتی ہے جب تک وہ خود واپسی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اسپین کے مسلمانوں نے اپنی اصل کی طرف واپسی کے سفر کا آغاز کر دیا ہے نجانے بقیہ مسلم دنیا کب تلاش کے اس سفر کے لیے سنجیدگی سے آمادہ ہوگی۔

بچھوؤں کا ایکا

بچھو کے متعلق ماہرینِ حیوانات نے لکھا ہے کہ اس کی پیدائش اس کی فطرت کے مطابق ہوتی ہے یعنی یہ جس طرح ساری عمر اپنے پرائے، دوست دشمن کی تمیز کے بغیر خلقِ خدا کو ڈستا رہتا ہے اسی طرح بوقتِ پیدائش مادہ بچھو کے پیٹ میں موجود بچے عام جانوروں کی طرح جنم لینے کی بجائے اس کا پیٹ چیر کر دنیا میں آتے ہیں۔ چنانچہ پھر وہ ساری عمر اس حرکت کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں جو دنیا میں آتے ہی محسن کُشی کی بدترین شکل میں ان سے سرزد ہوئی تھی۔ انسانوں کی عادات پر اس حوالے سے غور کیا جائے تو نسلِ انسانی کے دو گروہ، یہود و ہنود، سیاہ اور سرخ بچھوؤں کی جوڑی دکھائی دیتے ہیں۔ امریکا نے یہودیوں کی اس قدر حمایت کی اور اس کی خاطر ایسے ایسے انسانیت کش اقدامات کیے کہ آج وہ کرۂ ارض پر سب سے زیادہ نفرت کیے جانے والا ملک ہے لیکن اس کے عوض یہودیت اس کے ساتھ کیا کرتی رہی؟ یہ بڑی دلچسپ داستان ہے جس کا تذکرہ ہم ''آپریشن سوزنا'' اور ''لبرٹی'' پر حملے کے حوالے سے کریں گے۔

پچھلی صدی کی چھٹی دہائی میں جب اسرائیل تازہ تازہ صفحۂ ہستی پر نمودار ہوا تھا، مصر میں جہاد اور رجوع الی الدین کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ اسرائیل اس سے حد درجہ خائف تھا اور اس کی خواہش تھی کہ مصر سے خود ٹکرانے کی بجائے امریکا کو اس سے بھڑا دیا جائے۔ اس کے لیے اس نے وقفے وقفے سے دو انتہائی عیارانہ اور انسانیت و اخلاق سے گری ہوئی حرکتیں کیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دونوں بری طرح ناکام ہوگئیں اور اسرائیل بہت ہی شرمناک انداز میں بے نقاب ہوا۔

ان میں سے پہلا منصوبہ ''آپریشن سوزنا'' کا تھا جو ۱۹۵۴ء میں ترتیب دیا گیا۔ یہ اسرائیلی حکومت کی طرف سے امریکا کے خلاف خفیہ دہشت گردی کا منصوبہ تھا جس کے مطابق مصر میں

قیام پذیر امریکیوں کو قتل اور امریکی تنصیبات کو دھماکے سے اڑایا جانا تھا اور پھر مستند "قرائن و شواہد" سے یہ ثابت کیا جاتا کہ یہ کارروائی مصریوں نے کی ہے۔ اس طرح امریکا کا مصر سے براہِ راست تصادم شروع ہو جاتا اور اسرائیل نہرِ سوئز کے کنارے کھڑے ہو کر تفریحی تماشا دیکھتا جیسے کہ اس نے سقوطِ کابل اور قندہار کے وقت کیا۔ یہودی ایجنٹ حکم ملتے ہی سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے قاہرہ اور اسکندریہ میں کچھ عمارتیں اور امریکی لائبریری دھماکے سے اڑانے کی کامیاب کارروائی کی (قارئین اس موقع پر وطنِ عزیز اور دنیا بھر میں مغربی باشندوں اور املاک کے خلاف ہونے والی دہشت گردانہ کارروائیوں کو ذہن میں رکھیں) لیکن جب وہ ایک امریکی سینما گھر میٹرو گولڈ وائن میئر تھیٹر کو دھماکے سے اڑا رہے تھے تو اسرائیلی ایجنٹ کے ہاتھ میں وہ بم پھٹ گیا جس کے بارود سے تلف ہونے والی جانوں کو وہ مصر کے بے خبر مسلمانوں کے کھاتے میں ڈالنا چاہتا تھا۔ اسرائیلی ایجنٹ کے رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے سے طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ دنیا کو علم ہو گیا کہ اسرائیلی اس قدر پست اخلاق اور کمینگی کے مارے ہوئے دہشت گرد ہیں کہ اپنے محسن کو اپنے دشمن سے بھڑانے کے لیے اس کی جان لینے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ بلاشبہ بدترین قسم کی جنونیت تھی اور اس سے اس قدر گرد و غبار اٹھا کہ اسرائیلی وزیر دفاع پنہاس لیون کو مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا۔ (یاد رہے کہ یہ اتنا اہم شخص تھا کہ اس کی جگہ لینے کے لیے ڈیوڈ بن گوریان جیسے صہیونی لیڈر کو سیاست میں داخل ہونا پڑا) بعد میں یہ کہانی "لیون کے معاملات" کے نام سے شائع ہوئی اور اس کا ذکر معروف انسائیکلوپیڈیا انکارٹا میں بھی پایا جاتا ہے...... لیکن یہ یہودیت کے اثر سے خالی نہیں۔ اس کے الفاظ اس موقع پر یہ ہیں:

"بن گوریان وزیر دفاع پنہاس لیون کی جگہ لینے کے لیے ۱۹۵۵ء میں سیاست میں داخل ہوا۔ پنہاس لیون نے مصر کے مغرب کے ساتھ تعلقات کو سبوتاژ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد استعفیٰ دے دیا تھا۔" (انکارٹا انسائیکلوپیڈیا ۲۰۰۱ء، مضمون: بن گوریان)

آپ دیکھیں کہ یہودی مصنف ذرائع ابلاغ میں کس طرح بین الاقوامی غلط بیانیاں کرتے اور مطلب کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں، یہ مضمون اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ اینکارٹا کا

دوسرا جملہ کچھ اس طرح ہونا چاہیے:

''پنہاس لیون جسے زبردستی استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا کیونکہ اس کو امریکا کے خلاف دہشت گردانہ کارروائیوں کی کھلم کھلا سرپرستی کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ امریکا کو اسرائیل کے دشمن پر حملے کرنے کے لیے اکسایا جائے۔''

اس ناکام سازش میں اسرائیلی وزیرِ دفاع کو امریکا کے خلاف دہشت گردانہ کارروائیوں کی سرپرستی کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود امریکی حکومت نے جوابی ردعمل کے طور پر تل ابیب کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی حتیٰ کہ اس سے سفارتی تعلقات بھی نہ توڑے بلکہ اس کی اربوں ڈالر کی مالی وفوجی امداد میں کمی تک کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔

سیاہ بچھو کے اپنی فطرت بد سے باز نہ آنے کی دوسری مثال ''لبرٹی'' پر دہشت گردانہ حملہ ہے۔ یو ایس لبرٹی امریکا کا عظیم الجثہ بحری جہاز تھا جو ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل کے تحفظ کے لیے بحرِ احمر میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ۸ جون ۱۹۶۷ء کو چند اسرائیلی لڑاکا طیارے جن پر سے شناختی نشان مٹا کر ان کا رنگ تبدیل کر دیا گیا تھا، یو ایس لبرٹی پر حملہ آور ہو گئے، ان کا ساتھ دینے کے لیے چند غیر نشان شدہ تارپیڈو کشتیاں بھی اپنے اس محافظ پر جھپٹیں اور دم بھر میں ۳۴ ''قیمتی'' امریکی جانیں تلف ہونے کے ساتھ ۱۷۴ امریکی زخمی ہو گئے۔ یہودی ہوا بازوں نے سب سے پہلے لبرٹی کے ریڈیو ٹاور پر حملہ کیا تا کہ امریکا کے چھٹے بحری بیڑے کو علم نہ ہو سکے کہ یہ کارستانی ان کا پروردہ کلوٹا بچھو کر رہا ہے۔ نشانات سے خالی لڑاکا طیارے اس وقت تک خوفناک انداز میں اپنی مدد کو آئے ہوئے امریکیوں پر بمباری کرتے رہے جب تک انہیں اطمینان نہ ہو گیا۔ بقیہ کسر تارپیڈو کشتیوں نے پوری کی اور ان امریکی سپاہیوں کو بھی نہ بخشا جو حفاظتی کشتیوں کے ذریعے جان بچا کر فرار ہو رہے تھے۔ اسرائیلی کشتیوں پر نصب مشین گنوں سے نکلنے والی گولیاں ان امریکی فوجیوں کو چاٹتی رہیں تا کہ دنیا کو باخبر کرنے کے لیے کوئی ذی روح زندہ نہ بچے اور ''مصر'' کی یہ دہشت گردی امریکا کو غضبناک کرنے کے لیے کافی ہو جائے۔ اسرائیلی حملہ آور اپنا کام مکمل سمجھ کر واپس چلے گئے لیکن اس موقع پر جہاز کے کپتان اور اس کے معاون عملے

نے ایسی غیر معمولی حاضر دماغی اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا کہ اسرائیل اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ سب مل کر جہاز کو کسی نہ کسی انداز میں اس وقت تک چلاتے اور ڈوبنے سے بچاتے رہے جب تک ان کا رابطہ اپنے بحری بیڑے سے نہ ہو گیا۔ انہوں نے اپنی ہائی کمان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا کہ یہ حملہ مصر کی نہیں، ان کے اپنے ''بچوت'' اسرائیل کی کارروائی تھی۔ لبرٹی کے کپتان کی جرأت اور فرض شناسی نے اسرائیل کے اس منصوبے کو طشت از بام کر دیا اور اسرائیلیوں کو موقع نہ دیا کہ وہ دو دھوکے بازیاں ایک ساتھ کریں۔ اسرائیلی جیٹ طیارے امریکی عملے کے سروں پر بہت قریب سے گزر کر حملہ آور ہوئے تھے اور ان کے پائلٹوں نے امریکیوں کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے دوستانہ انداز میں ہاتھ بھی ہلائے تھے جس کی وجہ سے جہاز کے کپتان اور عملے کو حملہ آوروں کی شناخت میں کوئی غلطی نہ لگ سکتی تھی۔ جب یہ سازش بے نقاب ہو گئی تو قوم یہود نے اپنی روایتی کذب بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ گھڑا گھڑایا عذر پیش کر کے معذرت کر لی کہ یہ حملہ شناخت کی غلطی کے باعث ہوا تھا۔ اس وقت کے امریکی وزیر مملکت ڈین رسک اور چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف ایڈمرل تھامس موورر نے واضح بیان دیا کہ یہ حملہ ہرگز اتفاقی نہ تھا بلکہ یہ عمداً کی گئی کارروائی تھی۔ اس لیے کہ حملے کے وقت دن بہت روشن تھا، لبرٹی پر امریکی پرچم لہرا رہا تھا اور جہاز پر بین الاقوامی شناخت کے مقرر شدہ نشانات اور اعداد واضح طور پر لکھے ہوئے تھے۔ مگر امریکا کے یہودی میڈیا نے مذکورہ حملے کے خلاف کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ اسرائیل کی ''قریب از حقیقت'' معذرت کو آسانی سے قبول کر لیا گیا اور امریکا کے اعلیٰ سرکاری و فوجی عہدیداروں کے واضح الزامات کے باوجود یہودی لابی نے اس معاملے کی رسمی تحقیقات بھی نہ ہونے دی۔ اس کے مقابلے میں اب تک ایسا کوئی ثبوت بالکل نہیں پایا جاتا کہ افغانستان کی حکومت ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بارے میں کچھ جانتی تھی یا اس نے اس حملے کی منظوری دی تھی لیکن ان جڑواں ٹاوروں پر حملے کے آدھے گھنٹے کے اندر ایک سابقہ یہودی وزیر خارجہ نے افغانستان کو نامزد ملزم ٹھہرا کر اس پر حملوں کے لیے

فضا کو آتش بار بنا دیا تھا۔ کہاں آدھا گھنٹہ اور کہاں ۳۵ سال کا طویل عرصہ؟ لبرٹی پر حملے کو آج ۳۵ سال ہونے کو آئے ہیں لیکن اس کی تحقیقات کا آغاز بھی نہیں ہو سکا۔

امریکی نظامِ حکومت پر یہودیت کے غلبے کا یہ عالم ہے کہ یو ایس لبرٹی کے کمانڈنگ آفیسر کیپٹن ولیم میک کو اسرائیلی حملے کے دوران جرأت و ہمت کا شاندار مظاہرہ کرنے پر امریکا کا سب سے بڑا اعزازی ایوارڈ ''کانگریس میڈل آف آنر'' دیا گیا لیکن اس کی تقریب امریکی نیول یارڈ میں نہایت خاموشی سے منعقد کی گئی حالانکہ قواعد اور روایات کے مطابق یہ کارروائی وہائٹ ہاؤس میں انجام دی جانی چاہیے تھی۔ یہ صرف اس لیے کہ ۳۴ امریکی فوجیوں کو ہلاک اور ۱۷۴ سے زائد کو زخمی کرنے والے ''معصوم دشمن'' کے نازک جذبات کو ٹھیس نہ پہنچ جائے۔

یہ ہے وہ انصاف جسے امریکا دنیا پر مسلط کرنے چلا ہے۔ امریکا میں مقیم عربوں، پاکستانیوں اور دیگر مسلمانوں پر ناطقہ بند کرنے والے امریکی حکام اور باشعور امریکی عوام کو سوچنا چاہیے کہ وہ یہودی امریکی جو اسرائیلی دہشت گردی کے ان سنگین واقعات کے بعد بھی اسرائیل سے تعاون جاری رکھے ہوئے ہیں، کیا وہ امریکا سے غداری کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ کیا اسرائیل کو امداد دلوانے والے یہودی امریکا کے قانون سے باغی نہیں؟ ان خونیں واقعات کے بعد بھی اگر امریکی حکام اور عوام مسلمانوں کو دہشت گرد تارکین وطن اور یہودی شہریوں کو پرامن باشندے سمجھتے ہیں تو انہیں سیاہ بچھو کے زہرناک ڈنک سے کون بچا سکتا ہے؟ اور یہود کی اس فطرت کو جان لینے اور ہمارے تاریخی دشمنوں سے ان کے حالیہ گرم جوش گٹھ جوڑ کے بعد بھی اگر ہم ان سے ''بوجوہ'' تعلقات قائم کرنے پر مُصر ہیں تو خدا کی اس وسیع و عریض خدائی میں ہمارا امدد گار اور حمایتی کون ہو سکتا ہے؟؟؟

ہزار چہروں والا آدمی

یحییٰ عباس فلسطین کے ان بیٹوں میں سے تھا جن پر فلسطین کی مائیں ہمیشہ فخر کرتی رہیں گی، اس کے کارنامے فلسطینی نوجوانوں کے دل میں کفر سے ٹکرانے کا عزم جواں رکھیں گے اور فلسطین کے بچے اس کی نقل اتارتے اتارتے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے رہیں گے۔ یحییٰ عباس نے صیہونیت کے خلاف جہاد کو کئی ایسے رخ دیے جس سے کوئی آشنا نہ تھا۔ اس کی انقلابی سوچ اور عبقری ذہانت نے کئی ایسی چیزیں متعارف کروائیں جس نے فلسطین کی تحریکِ جہاد کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا حالانکہ وہ عام سا نوجوان تھا اور اس کے بچپن، لڑکپن اور آغازِ جوانی کے دنوں کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اپنے اندر اتنی زبردست عبقری صلاحیت چھپائے ہوئے ہے، مگر ایک واقعے نے اس کی زندگی بدل دی اور وہ گلیوں میں کھیلنے والے لڑکے سے اعلیٰ اخلاق و کردار کا مالک مجاہد اور فدائی مجاہدین کا استاذ بن گیا جس پر دوست رشک کرتے اور دشمن خوف کھاتے تھے۔

یہ آج سے تقریباً ۱۵ سال قبل رمضان المبارک کا ایک دن تھا جب یحییٰ عباس کی زندگی بدلنے والا واقعہ پیش آیا۔ مسلمان آدھے روزے رکھ چکے تھے اور مقدس مہینے کا آدھا دورانیہ باقی تھا۔ فلسطین کی مساجد میں نمازیوں کی حاضری عام دنوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ فلسطین کی مشہور تاریخی مسجد ''مسجدِ ابراہیم'' میں تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی چونکہ مسلمانوں نے آج تک یہودیوں کی کسی عبادت گاہ پر حملہ نہ کیا تھا اس لیے وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کوئی بدبخت یہودی، روزہ دار عبادت گزاروں پر حملہ کر سکتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں نے یہودیوں پر موثر حملوں کا آغاز ہی نہ کیا تھا۔ یہ سعادت قدرت نے یحییٰ عباس کی قسمت میں لکھی

تھی کہ وہ خالی ہاتھ فلسطینی نوجوانوں کو دیو ہیکل ٹینکوں کے سامنے کھڑا کرے اور انہیں جنگ کے ایسے گُر سکھائے جو اس سے قبل فنون حرب کی کسی کتاب میں تھے نہ سینہ بسینہ منتقل ہونے والے رازوں میں ان کا شمار تھا اور نہ کسی ماہر عسکریات کی قوت خیالیہ نے ان کا خاکہ تشکیل دیا تھا۔

ہوا یوں کہ نمازیوں سے بھری مسجد میں ایک انتہا پسند اور کٹر متعصب یہودی گھس آیا۔ یہ یہودیوں کے اس فرقے سے تعلق رکھتا تھا جو تین رات پرانی سڑی ہوئی مچھلی سے زیادہ بدبودار اور جنگلی گدھے سے زیادہ موٹی عقل کے ہوتے ہیں۔ ان سے عام یہودی بھی تنگ رہتے ہیں۔ اس یہودی کے دماغ میں اپنی حکومت کی پشت پناہی اور فلسطینی مسلمانوں کی بے بسی کے سبب کچھ زیادہ ہی ہوا چڑھ گئی تھی۔ اس نے مسجد میں گھستے ہی فائر کھول دیا اور پلک جھپکتے میں کئی نمازی اپنے رب سے جا ملے، متعدد شدید زخمی ہوگئے، مسجد کا فرش خون سے بھر گیا، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اچانک یہ کیا آفت ٹوٹ پڑی اور اس شیطان صفت یہودی کو آخر کیا ہوا؟ جب مسجد کا فرش خون سے دھویا جا رہا تھا تو کسی مذبح خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سب کی آنکھیں تاسف سے نم تھیں مگر ایک نوجوان ایسا بھی تھا جس کے چہرے پر رنج و غم کی بجائے سنجیدگی آمیز فکر اور غصہ آمیز کرب کے آثار تھے۔ یہ نوجوان یحییٰ عباس تھا۔ بے بسی کا احساس اسے بری طرح ستا رہا تھا۔ اس نے اسی لمحے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی قوم کو یہودیوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑے گا اور ایسا کچھ کر دکھائے گا کہ آئندہ کوئی یہودی مسلمانوں کی عبادت گاہ میں گھسنے سے پہلے اپنے انجام کو سو مرتبہ سوچے گا۔

وہ تنہا ہی عزم و ہمت کے بل بوتے پر انجانے راستے پر نکل کھڑا ہوا۔ قدرت نے اس کے جذبے کی لاج رکھی اور ایک وقت ایسا آیا کہ اسرائیلی وزیراعظم سے لے کر اسرائیلی انٹیلی جنس کے چیف تک اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ اس کے کارنامے اتنے خفیہ، حیرت انگیز اور غیر متوقع ہوتے تھے کہ یہودی ادیبوں نے اس کے متعلق داستانیں گھڑ گھڑ کے اسے یہودی ادب کا دیومالائی کردار بنا دیا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ ''ہزار چہروں والا آدمی'' ہے جو بیک وقت کئی جگہ موجود ہوتا ہے۔ کیسے اور کہاں؟ اس کے متعلق کسی کو کچھ پتہ نہ چلنے پاتا تھا۔

اس میں ایک بڑی صفت یہ بھی تھی کہ شاگردوں تک اپنا فن منتقل کرنے کی امتیازی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کے تربیت یافتہ نوجوانوں نے اسرائیل کے طول وعرض میں ایسی کارروائیاں کیں جنہوں نے یہودی ریاست کو جڑوں سے ہلا دیا اور ایک وقت ایسا آیا جب اسرائیلی ہر اس شخص کو گرفتار کر لیتے تھے جس نے یحییٰ کو دیکھا ہو، سنا ہو یا اس کے بارے میں کچھ جانتا یا کسی طرح کی معلومات رکھتا ہو۔ اسرائیلی حکام اس کی گرفتاری میں ناکامی کو اپنے لیے کتنی بڑی شکست سمجھتے تھے اس کا اندازہ اسرائیلی انٹیلی جنس کے سربراہ یعقوب بیرس کے اس بیان سے ہوتا ہے جو اس نے ایک مرتبہ یحییٰ عباس کی گرفتاری میں ناکامی پر جھلا کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ یحییٰ بیرزیت کی الیکٹریکل انجینئرنگ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اُردن جانا چاہتا تھا۔ اس نے جب اس غرض کے لیے ویزے کی درخواست دی تو صہیونی انتظامیہ نے اسے رد کر دیا۔ اس پر انجینئر یحییٰ عباس نے تعلیم کو خیر باد کہہ کر عملی زندگی میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا اور پھر وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ اسرائیلی انٹیلی جنس کے سربراہ کو کہنا پڑا:

''اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ نوجوان ہمارا یہ حشر کرے گا تو ہم اسے ویزے کے ساتھ ساتھ جانے کے لیے ایک ملین ڈالر بھی دیتے''۔

یحییٰ عباس نے جس وقت میدانِ عمل میں قدم رکھا اس وقت جنگ میں صہیونیت کا پلّہ خطرناک حد تک بھاری تھا۔ وسائل، اسلحے اور عالمی استعمار کی پشت پناہی سے قطع نظر سب سے بڑی برتری انہیں یہ حاصل تھی کہ ان کے عوام محفوظ تھے جبکہ فلسطینی عوام کو کسی طرح کی ڈھال میسر نہ تھی۔ اسرائیلی حکومت نے یہودی قابضین کو ایسی بستیوں میں بسا رکھا تھا جن کے بارے میں اسرائیلی انٹیلی جنس کا دعویٰ تھا کہ وہ مکمل طور پر محفوظ ہیں۔ وہاں بسنے والے یہودی بھی اپنے آپ کو ہر طرف سے محفوظ سمجھتے تھے اور ان کی بجائی ہوئی چین کی بانسری سن کر دنیا بھر کے یہودی آ آ کر یہودیوں کی آبادی میں اضافہ کر رہے تھے اور فلسطینی مسلمان سمٹ کر مہاجر کیمپوں کی عسرت زدہ اور بے یارومددگار زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے جا رہے تھے۔

اگر کچھ عرصہ اور یہ صورتحال جاری رہتی تو مجاہدین کے حوصلے پست ہو جاتے اور مسلمان

یہودیوں کی برتری کے سامنے لاچار ومجبور ہوجاتے۔اس موقع پر یحییٰ عباس آگے آیا اور اس نے فدائی حملوں کی نت نئی ترکیبوں کے ذریعے صہیونیت کے خلاف جنگ کو ایسا رخ دیا جس نے آج تحریکِ جہاد کو بے مثال جوش اور ولولہ عطا کر رکھا ہے اور صہیونیت اس وقت کو روتی ہے جب اس کا سامنا یحییٰ عباس جیسے باصلاحیت مجاہد سے ہوا تھا۔صہیونیت کے بڑے دماغ آج بھی جب جمع ہوتے ہیں تو اس بات کا اقرار کیے بغیر ان کے پاس چارہ نہیں ہوتا کہ یحییٰ نے صہیونیت کے خطرناک منصوبوں کو بے جان کر دیا ہے اور ان کو ایسی زک پہنچائی ہے جس کی تلافی دجّال کی آمد تک ان سے نہ ہو سکے گی۔

یحییٰ کا کمال یہ تھا کہ اس نے جنگ کو صہیونیت کی چوکھٹ تک پہنچا دیا اور یہودیوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر کے دنیا بھر سے یہودیوں کی اسرائیل آمد پر روک لگا دی۔اس کا جو طریقہ اس نے سوچا وہ عسکری تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔اس نے دنیا کو گوریلا جنگ کی ایک نئی قسم ''فدائی جنگ'' سے متعارف کروایا اور اس کے ذریعے ایسے حیرت انگیز نتائج حاصل کیے کہ مشہور یہودی ایجنٹ کرنل لارنس کے'' کامیابی کے سات ستون'' فرسودہ اصول بن کر رہ گئے۔اس کی کامیاب فدائی کارروائیوں نے تحریکِ جہاد کو ایسا حوصلہ اور عزم بخشا کہ حضرت مہدی کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے والے افراد بھی ایک نئے عزم کے ساتھ میدان میں آگئے اور فدائی حملے یحییٰ عباس اور اس کے شاگردوں کا ایسا صدقہ جاریہ بن گئے جو دجّال کی آمد تک یہودیوں کو زوردار کچوکے لگاتے رہیں گے۔

یحییٰ عباس حد درجے کا بہادر، نڈر اور بیباک ہونے کے ساتھ انتہائی محتاط بھی تھا۔حزم و احتیاط اس کی وہ صفت تھی جو آج کل خفیہ کارروائیوں پر متعین مجاہدین میں بھی معدوم ہوتی جا رہی ہے۔وہ اپنی جہادی سرگرمیوں کو حد درجہ راز میں رکھتا تھا اور اس بارے میں کسی کوتاہی کو برداشت نہ کرتا تھا۔رازداری اور ہر قیمت پر رازداری کی وہ اس شدت سے پابندی کرتا تھا کہ یہ اس کی شخصیت کا جزو لاینفک بن چکا تھا۔اس نے رازداری کو اس کامیابی اور خوبی سے نبھایا کہ اس کے متعلق کوئی یقین سے نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کس وقت، کہاں اور کس حلیے میں موجود ہوگا؟

حتیٰ کہ وہ سنسنی خیز موضوعات پر لکھنے والے یہودی مصنفین کا مرغوب موضوع بن گیا تھا۔ انہوں نے اس کو یہودی ادب کی دیومالائی کہانیوں کا حصہ بنا ڈالا اور اس کے بارے میں سُنے گئے واقعات میں زیبِ داستان کے لیے عجیب وغریب باتوں کا اضافہ کر کے اسے ماورائی مخلوق کا درجہ دیدیا۔ یہودی مصنفین نے یحییٰ کے متعلق سنسنی خیز کہانیاں لکھ کر خوب شہرت اور دولت کمائی۔

یحییٰ روپ بدلنے کا بھی بہت ماہر تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے کئی شناختی کارڈ اور متعدد پاسپورٹ ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی جگہ موجود ہوتا ہے۔ یہ ان قلم کاروں کا مبالغہ تھا ورنہ ایک انسان ایک وقت میں ایک سے زیادہ جگہ کیسے موجود ہو سکتا ہے؟ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس کی شکل کے آدمی بیک وقت متعدد جگہوں پر موجود ہوتے تھے اور دیکھنے والے یا مخبروں اور جاسوسوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اصل یحییٰ کون ہے اور نقلی کون سا؟

اگر اس کے متعلق کوئی جاسوس خبر دیتا کہ وہ دریائے نیل کے کنارے ریسٹورنٹ میں کسی کا انتظار کر رہا ہے تو تھوڑی دیر بعد دوسرے مخبر کی طرف سے خبر آتی کہ وہ تھوڑی دیر پہلے طرابلس کے ایئرپورٹ پر سوڈان جانے والی پرواز کے لیے بورڈنگ کارڈ حاصل کر چکا ہے۔ اس صورت حال نے اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ پھر ایک کمال اس میں یہ تھا کہ بھیس غضب کے بدلتا تھا، جب وہ یہودی آبادیوں میں آوارہ گردی کر رہا ہوتا تو کوئی نہ پہچان سکتا تھا کہ کٹر مذہبی یہودی شخص کے تمام لوازمات سے آراستہ یہ شخص ''حماس'' کا عظیم مجاہد ہے جو ان بستیوں میں نقب لگانے کی جگہ تلاش کر رہا ہے اور جب وہ کسی یہودی نو آباد کار سیٹھ کا روپ دھار کر حیفا کے پوش علاقوں میں آمد و رفت رکھتا تو کوئی نہ جان سکتا تھا کہ یہ سرمایہ کار یہاں کس غرض سے آوت جاوت لگائے ہوئے ہے۔ اسرائیل کا وزیر اعظم اسحاق رابن، یحییٰ شہید کے اس کمالِ فن سے اس قدر مرعوب تھا کہ ایک دن کہہ اٹھا: ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں انجینئر یہیں پارلیمنٹ ہی میں نہ پہنچا ہوا ہو۔'' اس نے ان اطلاعات کے بعد یہ کہا تھا جن کے مطابق یحییٰ شہید اسرائیلی سفارت کاروں کے روپ میں تل ابیب کے اندر دیکھا گیا تھا اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہر غیر ملکی سفارت کار کو روک کر پوچھیں کہ کہیں آپ

انجینئر یحییٰ کے ہمزاد تو نہیں ہیں؟

اللہ تعالیٰ یحییٰ شہید کو اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اس نے مجاہدین کے لیے جو انوکھی تدبیریں وضع کیں، مجاہدین کو ان میں اضافے اور جدت کی توفیق دے اور شہید کی عبقری جہادی کارروائیوں کو اس کے لیے بہترین صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

فلیش پوائنٹ

''آپ وہ ہیں جو بولتے نقشے لکھتے ہیں۔''

''معاف کیجیے! میں نے آپ کو پہچانا نہیں، ویسے بھی نقشے بنائے جاتے ہیں لکھے نہیں جاتے۔''

''مجھے معلوم ہے آپ ایسے ہی چکر دیتے ہیں۔ اصل بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا ایک ہی موضوع رہ گیا ہے، ہمیشہ فلسطین پر لکھتے رہتے ہیں؟''

''ہاں! میرے خیال میں بیت المقدس وہ فلیش پوائنٹ ہے جہاں بھڑکنے والی جنگ کے شعلے تیسری اور عظیم ترین عالمی جنگ (الملحمۃ الکبریٰ، آرمیگاڈون) کی شکل اختیار کرلیں گے۔ القدس اس جنگ کا اگلا محاذ ہوگا جس کے بارود میں یہودی اب آگ ڈالنے والے ہیں۔''

کیا مطلب؟

''مطلب یہ کہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک زبردست قسم کا ہمہ گیر اور کلی انفجار ہوگا جس کے نتیجے میں عالمگیر جنگ ہوگی اور اسرائیل سارے عرب ملکوں اور پھر سارے مسلمان ملکوں پر قابو پانے کی کوشش کرے گا تاکہ ستارۂ داؤدی والا جھنڈا صہیون کے پہاڑ پر گاڑ کر ہیکل سلیمانی میں بچھائے گئے تختِ داؤدی پر مسیح دجال اکبر کو بٹھا سکے۔ مسیح دجال کی عالمی پریس کانفرنس کی تیاریاں بھی مکمل ہیں جسے سیٹلائٹ کے ذریعے دنیا بھر کے ٹیلی ویژنوں پر دکھایا جائے گا بس صرف ایک عالمی واقعہ ہونا باقی ہے اور اسرائیل کی آخری ''عظیم تاریخی تمثیل'' کے لیے اسٹیج کی مکمل تیاری کے لیے بس ایک واقعہ رونما ہونا باقی ہے اور وہ ہے ایک قدیمی زمین پر دجال کی عبادت کے لیے ایک عبادت گاہ کی تعمیر۔ یہ عبادت گاہ ایک مخصوص جگہ تعمیر ہوگی یعنی ماؤنٹ

موریا (Mount Moriah) پر، یہ وہ جگہ ہے جہاں یہود کے دعویٰ کے مطابق یہ عبادت گاہ کئی مرتبہ پہلے بھی تعمیر ہو چکی ہے۔ یعنی عین وہ جگہ جہاں مسجدِ اقصیٰ کی چار دیواری ہے جس کے اندر مختلف اسلامی یادگاریں ہیں جن میں سے اہم ترین مسجد کا ہال اور صحن میں واقع ایک خوبصورت گنبد ہے جو فنِ تعمیر کی عمدگی کے لحاظ سے دنیا کے سات عجوبوں میں شامل کیے جانے کے لائق تھا مگر اسے آٹھویں عجوبے کے طور پر بھی تسلیم نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی .... بلکہ مسلمانوں کی اکثریت سے اگر پوچھا جائے کہ مسجدِ اقصیٰ سے کیا مراد ہے؟ تو وہ ان یہودیت زدہ نام نہاد محققین کی باتیں دہرانا شروع کر دیں گے جو یہود کے مقاصد کی تکمیل کے لیے طرح طرح کی الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔''

''لیکن ان الجھنوں کے علاوہ بھی تو بہت سے ایسے مسائل ہیں جو سلجھن چاہتے ہیں؟''

''بالکل! کیوں نہیں؟ لیکن یہ مسئلہ ایسا ہے جس کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کو ان تمام مقاصدِ عالیہ کی دعوت دی جاسکتی ہے جو دعوت الی الخیر کا حصہ ہیں اور ان مہلک چیزوں سے ڈرا وا سنا کر مستقبل کی فکر کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے جن سے وہ بے خبر ہیں۔ پھر ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ خود مسلمانوں میں ایسے گل کھلنا شروع ہو گئے ہیں جو مسجدِ اقصیٰ پر یہود کے حق تولیت کے دعویدار ہیں۔ ان کی نرالی منطق یہ ہے کہ ''مسجدِ اقصیٰ پر قانونی حق تو مسلمانوں کا ہے لیکن اخلاقی حق یہود کا ہے۔ا یہود اور اخلاقی حق...... سبحان اللہ! ا نیز یہ کہ القدس کے حصول کے لیے بنی اسرائیل کی جنگ قتال فی سبیل اللہ ہے کیونکہ یہ ان کو عطا کی گئی میراث ہے۔'' اب ایسی صورت حال میں اس موضوع پر جان نہ کھپائیں تو کیا کریں۔''

''اچھا یہ بتائیے! فلسطینی مجاہدین جو خودکش حملے کرتے ہیں کیا یہ جائز ہیں؟''

''آپ کو ان کے شرعی جواز میں شبہہ ہے یا عملی افادیت میں؟''

''اتنی مشکل باتیں تو میں نہیں جانتا لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ اسلام میں خودکشی جائز نہیں ہے۔''

''یہ خودکشی نہیں، کفرکشی ہے۔ بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ حملے خود اپنی جان لینے کے لیے نہیں، دشمن کا نقصان کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔''

''میرے ایک دوست جو عرب ممالک میں رہ کر آئے ہیں، کہتے تھے کہ قتلِ نفس کی حرمت معلوم من الدین بالضرورۃ ہے۔''

''انہوں نے اس کا نام لینے میں غلطی کی اس لیے ان سے قیاس کرنے میں بھی غلطی ہوئی۔ یہ قتلِ نفس نہیں، فداءِ نفس ہے۔ اس کو قتلِ نفس قرار دینا فدائی جانبازوں کی قربانیوں کی توہین اور یہود و ہنود کو اس آخری کاری وار سے تحفظ فراہم کرنے کے مترادف ہے جس کا کوئی توڑ یا جواب ان کے پاس نہیں۔''

''ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ جس طرح جہاد کے لیے زنا یا شراب خوری جائز نہیں ہو سکتی اسی طرح خودکشی بھی جائز نہیں۔''

''انہوں نے اس دلیل میں دو غلطیاں کی ہیں: ایک تو وہی کہ اسے خودکشی کہا جبکہ خودکشی اور فدائی حملہ میں وہی فرق ہے جو مردار کے عفونت زدہ جسم میں اور شہید کے پاک وجود میں ہے۔ خودکشی کر کے اپنی جان دینے والا اپنی زندگی سے تنگ، اپنے خدا سے ناراض اور اس کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے۔ کفر کش حملہ کر کے اپنی جان فدا کرنے والا شہادت کا متمنی، اپنے خدا کے دیدار کے شوق میں بیتاب اور اس کی رحمت کا طالب ہوتا ہے۔ دوسری غلطی یہ کی کہ انہوں نے زنا کو قتل پر قیاس کیا جبکہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ قتل تو دو قسم کا ہے: ایک جائز اور ایک ناجائز یعنی اپنے آپ کو قتل کرنا ناجائز اور دشمنِ دین کو قتل کرنا جائز بلکہ کارِ ثواب ہے جبکہ زنا اور شراب خوری میں ایسی کوئی تقسیم نہیں کہ دشمن کی عورتوں کے ساتھ زنا یا دشمن سے چھینی گئی شراب پینا جائز ہو۔''

''عرب کے بعض علما اسے ناجائز کہتے ہیں۔''

''ان محترم ہستیوں کو حق گوئی کا یہی ایک موقع ملا؟ پورا جزیرۃ العرب اس وقت کفر کے نرغے میں ہے۔ اس کے متعلق ایک جملہ کہتے ہوئے ہکلا جانے والوں کو فدائی حملوں کے خلاف کھل کر کہنے کی جرأت کیسے ہو جاتی ہے؟ کوئی تو معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔''

''لیکن اس سے نقصان تو مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے۔''

''یہ یہود کا ''دجالی'' پروپیگنڈہ ہے۔ آپ جانبین کے نقصان کے اعداد و شمار دیکھیں تو ایسا کبھی نہ کہیں گے۔ فدائی حملوں سے پہلے روایتی حملوں میں فریقین کے جانی نقصان کا تناسب ایک اور دس تھا۔ اب یہ گھٹ کر ایک اور تین رہ گیا ہے اور جس دن فدائی مجاہدین ان حملوں کی تکنیک کو جدید سے جدید تر کرنے میں کامیاب ہوگئے اس دن یہ تناسب تین اور ایک اور پھر دس اور ایک بھی ہوسکتا ہے۔ مالی نقصان میں کنجوس یہودیوں کا جو حال ہے اس کا تو تصور بھی مشکل ہے۔ مسلمان کا ایک گھر گرتا ہے لیکن یہودی بستیوں کی پوری کی پوری تعمیر کا خرچ باہر سے آنا رک جاتا ہے۔ بس بات یہ ہے کہ جب یہودی ''دیریاسین'' جیسے واقعات میں مسلمانوں کا اجتماعی قتلِ عام کرتے تھے تو اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے۔ اب جب وہ مسلمان آبادیوں کے خلاف انتقامی کارروائی کرتے ہیں تو اسے حقیقت سے بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمان دانشور مسلمان نوجوانوں کو سمجھائیں کہ تم یہودیوں کو چھیڑ کر اپنی مصیبت (جو کہ درحقیقت یہودیوں کی شامت ہوتی ہے) کو آواز مت دو۔''

آپ خواہ مخواہ وکالت کرتے ہیں، اس کو نہیں دیکھتے کہ اس میں بے گناہ مارے جاتے ہیں۔''

''دیکھیے! اس موضوع کو خواہ مخواہ نہ کہیے۔ یہ وہ ٹیکنالوجی ہے جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کا دفاع کیا ورنہ آج جہاں میں اور آپ کھڑے ہیں یہاں ہر طرف مسلی ہوئی دھوتیاں اور منڈھی ہوئی چوٹیاں نظر آ رہی ہوتیں۔ آئے دن خبریں آتی ہیں کہ بھارت میں فلاں جگہ پاکستان کے جاسوس پکڑے گئے۔ کسی ایک آدمی کے پکڑے جانے سے کتنا زبردست نقصان ہوتا ہے جبکہ فدائی حملوں میں ایسا کوئی نقصان نہیں۔ پھر آپ بے گناہ کس کو کہتے ہیں؟ ان یہودیوں کو جو دنیا بھر سے دجّال کے استقبال کے لیے ارضِ موعود میں ایک ایک اینٹ رکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے من حیث القوم جرائم اتنے ہیں کہ اب ان کا کوئی فرد بے گناہ نہیں۔ کوئی اصل مجرم ہے کوئی اس کا معاون۔ پھر یہ اصول یاد رہنا چاہیے کہ اعتبار اصل مقصود کا ہوتا ہے ضمنی اور تبعی چیزوں کا نہیں۔ اصل حملہ دشمن پر ہوتا ہے ضمن میں کوئی بے گناہ زد میں آجائے تو اس کی ذمہ داری جانباز جوان پر نہیں۔''

''ہمارے اپنے مسائل بہت ہیں، ان پر لکھنا چاہیے۔ فلسطین ہم سے بہت دور ہے۔''

''اپنے ملک وقوم کی خدمت سے کسے انکار ہے؟ یہ ہے تو ہم ہیں، لیکن یاد رکھیے! سارے اسلامی خطے مسلمان کا ملک ہیں، سارے کلمہ گو ایک قوم ہیں، حرمین کی طرح بیت المقدس ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہیے خصوصاً جبکہ اسلامی اخوت کے جذبات پیدا ہونے سے حب الوطنی اور تعمیرِ ملت کی تحریک پیدا ہوتی ہے تو فلسطین پر لکھنا اپنے ہی وطن پر لکھنا ہے۔ اجتماعی امور کے حوالے سے ملت کو بیداری کا پیغام درحقیقت تعمیر وطن کے لیے ذہن سازی ہے۔ اگر کوئی شخص بیت المقدس پر یہود کے قبضے سے اپنے دل میں کسک محسوس نہیں کرتا تو اپنے وطن کا درد کیسے محسوس کرے گا؟ آج نصف صدی سے زائد تقریباً ۵۸ برس (۱۹۴۸ء میں قیام اسرائیل سے تاحال) ہونے کو آئے ہیں بیت المقدس کی تعمیر ودرستگی نہیں ہوسکی۔ مسلمانوں کا عظیم ترین ورثہ ان کی آنکھوں کے سامنے ضائع ہو رہا ہے۔ میں یہاں ''آنکھوں کے سامنے'' کا لفظ محاورۃً کہہ گیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دو نسلیں گزر چکی ہیں (پچیس سال میں ایک نسل اوسطاً گزر جاتی ہے۔ امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق اقل مدت بلوغ ۱۲ سال اور اقل مدت حمل چھ ماہ ہے۔ اس طرح ۲۵ سال میں انسان دادا بن سکتا ہے) انہوں نے مسجدِ اقصیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تک نہیں۔ باہر کی بات چھوڑیے اگر کسی فلسطینی مسلمان سے پوچھیے کہ آپ خود بیت المقدس کبھی گئے ہیں؟ آپ نے وہاں جمعہ کی کتنی نمازیں پڑھی ہیں؟ تو وہ آپ کو جواب اثبات میں نہ دے سکے گا۔ فلسطین یا اردن کے مہاجر کیمپوں میں پل بڑھ کر جوان ہونے والے مسجدِ اقصیٰ کی جزوی تفصیلات سے کیسے واقف ہوسکتے ہیں؟ اگر آج خدانخواستہ مسجدِ اقصیٰ کے انہدام کی کوئی شیطانی کوشش ہوتی ہے (۲۰۰۶ء سے ۲۰۱۲ء کے درمیان اس سے بھی بڑے واقعات ہوکر رہیں گے) تو کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی مسلمانوں کی موجودہ نسل کو خبر ہی نہ ہوگی کہ ان کے ساتھ کیا ہوا لہٰذا ہم مسجدِ اقصیٰ کو ہر زاویے سے مسلم نوجوان کے ذہن میں ثبت کرنا چاہتے ہیں۔ اس ورثے کی عظمت اور اس کا سوگوار حسن اسے آتش بہ جگر بنا کر چھوڑے گا اور اگر ایک کُرد نوجوان سلطان ایوبی بن سکتا ہے تو مسلمان مائیں

بانجھ نہیں ہوئیں، اقصیٰ کے فاتح نہ سہی، محافظ تو جنم دے سکتی ہیں۔''

''اچھا ایک بات تو بتایئے! القدس کی تصویریں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔''

''یہ سب ''ضربِ مؤمن'' والوں کے تقویٰ کی برکت ہے۔ لوگ سمجھتے تھے جاندار کی تصویر کے بغیر اخبار نہیں چل سکتا۔ ''ضربِ مؤمن'' میں جاندار کی ایک بھی تصویر نہیں ہوتی لیکن یہ اپنی تصاویر کی وجہ سے مشہور ہے۔''

''پھر بھی بتائیں تو سہی؟''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں، دیکھیں وہ رہی سامنے مسجدِ اقصیٰ! آئی نظر! وہ غیرت کے افق اور حمیت کی حدِ نظر کے پار! ہماری میراث! ہماری غیرت کا امتحان! ہماری سربلندی اور دشمنوں کی رسوائی اور ذلت کا نشان! آپ دل میں اسلاف کی سی غیرت اور مسلمان ماؤں، بہنوں کی حرمت کی حفاظت کا جذبہ پیدا تو کیجیے! یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں۔''

داؤ دی پتھر کی مار

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیر، لومڑی اور گیڈر اکٹھے مل کر شکار کو گئے، شام کو جب دن بھر کی کمائی تقسیم کرنے کا وقت آیا تو شیر نے ان دونوں سے کہا تم اسے تقسیم کرو۔ ان دونوں نے عرض کیا: ''نہیں بادشاہ سلامت! آپ تقسیم فرمائیے۔'' ''اچھا تو پھر میں ہی اسے تقسیم کیے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شیر آگے بڑھا، شکار کی تین ڈھیریاں بنائیں اور پہلی ڈھیری کو گھسیٹ کر اپنی طرف کرتے ہوئے کہا: ''یہ میری ہوئی اس واسطے کہ میں شکار میں شریک تھا۔'' پھر اس نے دوسری ڈھیری کو بھی گھسیٹ کر پہلی سے ملا دیا اور اس کی وجہ یوں بیان کی: ''یہ بھی ہماری ہی ہے اس لیے کہ ما بدولت جنگل کے بادشاہ ہیں۔'' بعد ازاں وہ تیسری ڈھیری کی طرف بڑھا اور اس پر اپنا پنجہ رکھ کر گویا ہوا: ''رہ گئی یہ، تو جس کی ہمت ہو وہ اسے لے لے۔'' لومڑی اور گیڈر میں ہمت تو کیا ہوتی لیکن رذالت ان میں اتنی تھی کہ اپنے قبیلے میں پہنچنے کے بعد اس بات پر ڈینگیں مارتے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ انہوں نے بادشاہ سلامت کے ساتھ شکار پر جانے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

ہم جب بھی یاسر عرفات کی شکل دیکھتے یا بیان پڑھتے ہیں تو یہ لطیفہ یاد آتا ہے اور آج کل جب سے صہیونی استعمار کو ان کی زندگی میں ان کا متبادل دریافت کرنے کی کوشش میں مگن دیکھتے ہیں تو لومڑی کے بعد گیڈر کی جوڑی بھی پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ یاسر عرفات صاحب یوں تو فلسطین کے ''اقتدار چوک'' کے گھنٹہ گھر ہیں کہ گزشتہ پانچ دہائیوں میں فلسطین کی تاریخ کے جس جھروکے سے جھانکیں، موصوف بارہ کی سوئی پیشانی پر سجائے چوک کے وسط

میں خوشامدانہ مسکراہٹ کی نحوست چہرے پر جمائے نظر آئیں گے۔ فلسطین پر غاصبانہ قبضے سے آج تک کے پچاس سال سے زائد عرصہ میں یہودی دہشت گردوں نے لاتعداد مسلمانوں کی جان لی، بے شمار مسلم قائدین کو شہید کیا لیکن معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ وہ اس ''عظیم مجاہد'' کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے اور یہ ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ''شہادت پروف'' قسم کی چادر اوڑھے ان کے قلب میں موجود رہے اور ایسی ریاست کی کامیاب حکمرانی کرتا رہا ہے جس کا تخت کامیابی کے ساتھ ہوا میں معلق ہے۔ اس کی زندگی کا حاصل یہ تھا کہ یہ ہر موقع پر یہودیوں کے ساتھ سمجھوتے کر کے اپنی فالج زدہ اور نیم زندہ نیم مردہ قسم کی حکومت کے لیے مہلت کی چند مزید ساعتیں حاصل کرتا رہا اور اس کی واحد کامیابی یہی تھی کہ یہ ''القدس فروشی'' کے عوض چند رعایتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں ہم ایسی ہی ایک رعایت کا ذکر کرتے ہیں جو اوپر ذکر کیے گئے لطیفے کے تذکرے کا سبب بنی۔

آج سے تقریباً دو دہائیاں قبل اسرائیلی وزیر اعظم ایہود ابارک (جسے اس زمانے کے اخبار نویس احد بارک لکھتے تھے) نے طویل مذاکرات اور پر جوش مصالحتی مشنوں کے بعد یاسر عرفات کی فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ ایک منصوبے پر اتفاق کیا جس کے تحت ''الاقصیٰ مسجد کمپلیکس'' کو تین حصوں (تین سطحیں کہنا زیادہ مناسب ہے) میں تقسیم کیا جانا تھا۔

(۱) زمین پر موجود مسجدِ اقصیٰ، ملحقہ صحن اور جو کچھ چہار دیواری میں ہے۔

(۲) جو کچھ کہ مسجد کے نیچے زمین میں ہے۔

(۳) جو کچھ کہ مسجد کے اوپر فضا میں ہے۔

اس میں سے پہلا حصہ یاسر عرفات کو مرحمت فرمایا گیا تھا اور ایہود ابارک اور ان کی ٹیم نے اسرائیل کے لیے ''صرف'' زمین کے نیچے والے حصے پر ''اکتفا'' کیا کیونکہ یہودیوں کے خیال میں مسجدِ اقصیٰ کے نیچے ان کی عبادت گاہ مدفون ہے۔ اس ''مصالحانہ اور قطعی طور پر منصفانہ اور غیر جانبدارانہ'' منصوبے کے مطابق تیسرے حصے کو آزاد چھوڑ دیا گیا لیکن دنیا بھر کو اس آزادی کا مطلب معلوم تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ فلسطینی اتھارٹی اور حکومت اسرائیل میں سے صرف

اسرائیل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ٹرانسپورٹر یا جنگی طیارے رکھ سکے۔ گویا کہ یاسر عرفات جو اس معاہدے کو اپنی عظیم فتح بتاتے ہوئے خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا، اس کا اقتدار اسرائیلی اقتدار کی دو سطحوں کے بیچ میں بھنچا ہوا تھا۔ درمیان کی سطح پر اسے جو ''خود مختارانہ'' اقتدار دیا گیا تھا اس کی علامت کے طور پر اس کو اجازت عطا کی گئی کہ وہ القدس کے مقدس شہر پر اپنا پرچم لہرا سکے۔ یہ وہ ''فراخدلانہ'' رعایت تھی جو مجاہدِ اعظم صاحب حاصل کر سکے لیکن اس معمولی رعایت پر بھی شدت پسند اسرائیلی گروپوں نے اپنے وزیر اعظم پر سخت تنقید کی، اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں اور ایک یہودی ''ربی'' (مذہبی رہنما) نے یہاں تک کہا: ''ہم اس وقت اپنی عبادت گاہ کی دو ہزار سال قبل کی تباہی کا ماتم نہیں کر رہے بلکہ آج کی تباہی کا ماتم کر رہے ہیں۔'' یہ بات اس مناسبت سے کہی گئی کہ جس دن یہ اعلان ہوا اس روز یہودی عوام رومی بادشاہ ٹائٹس کے ہاتھوں اپنے ہیکل کی تباہی کے دن کی یاد منا رہے تھے۔ ٹائٹس ۷۰ء میں گزرا ہے، اس نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ایہود ابارک نے اس دن کو مذکورہ بالا اعلان کے لیے اس خاطر چنا تھا کہ اسرائیلی قوم اس منصوبے میں مضمر عیارانہ تقسیم سے خوش ہو گی مگر متعصب اور جنونی یہودیوں نے اس کے اس دجل کو بھی رومی بادشاہ کے جرم سے ملا دیا۔

یہ اس وجہ سے ہوا کہ اسرائیل میں درجنوں ایسے جنونی گروپ کام کر رہے ہیں جن کی زندگی اور جدوجہد کا واحد مقصد ''مسجدِ اقصیٰ'' کا انہدام اور اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہے۔ (یاد رہے کہ الاقصیٰ یا بیت المقدس کا اطلاق اس پوری چار دیواری اور اس کے اندر موجود ہر چیز پر ہوتا ہے جسے قارئین بارہا مختلف زاویوں سے دیکھنے کی سعادت ''ضربِ مؤمن'' کی وساطت سے حاصل کر چکے ہیں اور جس میں مسجد کا ہال اور گنبدِ صخرہ دونوں شامل ہیں۔ اب اس بارے میں ابہام ختم ہو جانا چاہیے اور اس بحث میں نہ پڑنا چاہیے کہ مسجدِ اقصیٰ سے سبز گنبد والا مسجد کا ہال مراد ہے یا زرد گنبد والا قبۃ الصخرۃ؟ یہودیوں کے تیار کردہ ہیکل کے ماڈل بھی آپ کئی مرتبہ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یاد رکھیے کہ اب بات دہائیوں کی نہیں، مہینوں یا چند ایک سالوں کی رہ گئی ہے) ان گروپوں نے امریکا اور یورپ میں کئی تنظیمیں بنا رکھی ہیں جو مسلمانوں

کی اس عظیم عبادت گاہ کو تباہ کرنے کے لیے چندہ جمع کر کر کے بھیجتی ہیں۔ یہ چندہ ٹیکس فری ہوتا ہے اور محض یہودیوں سے نہیں بلکہ اس کا زیادہ تر حصہ عیسائیوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ عیسائیوں کو رام کرنے کے لیے انہوں نے جیوش کرسچن کوآپریشن (JEWISH CHRISTIAN CO-OPERATION) ٹائپ کے فورم اور انٹرنیشنل کرسچین ایمبیسی (International Christian Embassy) قسم کی تنظیمیں بنا رکھی ہیں۔ ان تنظیموں نے مسیحیوں کو یہود سے قریب تر لانے کا انقلابی کام اس شاطرانہ طریقے سے انجام دیا ہے کہ کبھی سارا مغرب یہودیوں کا جانی دشمن ہوتا تھا لیکن آج کے اہل مغرب یہود کی بجائے مسلمانوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ کبھی یہود کا لفظ نفرت کی علامت ہوتا تھا مگر آج کے مسیحی، یہود کی محبت میں گرفتار ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہودیوں سے شدید نفرت کے اظہار کے طور پر ہر بری چیز کی نسبت ان کی طرف کرنا ایک روایت بن گیا تھا اور کئی تنظیمیں معاشرے کو محض یہودیوں کے وجود سے پاک کرنے کے لیے وجود میں آئی تھیں۔ ان کی سرپرستی پاپائے روم کیا کرتا تھا اور اسی بنا پر برطانیہ اور جرمنی سے یہودی نکالے گئے۔ جلاوطنی کی یہ رسم تیرہویں صدی سے شروع ہو کر پندرہویں صدی تک رہی۔ یہودیوں کی بابت عیسائی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات میں خبیث ترین اور شریر ترین مخلوق یہودی ہیں مگر آج کے مسیحی اسرائیل کی توسیع اور استحکام کے لیے یہودیوں سے بھی زیادہ پیسہ خرچ کر رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ہم پر اس لیے مہربان ہے کہ ہم یہودیوں پر مہربان ہیں۔

دوسری طرف اس سے بھی بڑا غضب یہ ہے کہ اُمت محمدیہ کی تاریخ میں پہلی بار مسلمان اپنے ازلی دشمن کی پہچان سے محروم ہو گئے ہیں جبکہ اہلِ کتاب کرۂ ارض کے ہر پست و بالا مقام پر باہم متحد ہو کر ان کا گھیراؤ کر رہے ہیں۔ یہ دشمن کی فکری یلغار کی کامیابی نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان ممالک اس کی زہریلی دشمنی بھول کر اسے تسلیم کرنے کی باتیں کر رہے ہیں، مسلمان اہل علم القدس کو یہود کی وراثت اور الاقصیٰ پر یہود کا حق تولیت تسلیم کرنے پر بحث مباحثے کا آغاز کر چکے ہیں، مسلم دانشوروں کی اکثریت مسئلہ فلسطین کو سیاسی یا نسلی رنگ دینے کی کوشش

کرتی ہے جس کی بنا پر مسلم عوام کے ذہن میں ''قبلۂ اول'' کی بجائے ''مسئلہ فلسطین'' کا لفظ راسخ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے سمجھ دار لوگ بھی اسے عربوں کا سیاسی مسئلہ سمجھنے لگے ہیں جبکہ خدائے وحدہ لاشریک کی قسم فلسطین کا قضیہ سیاسی نہیں، ایمان کا مسئلہ ہے۔ اس ذات کی قسم جس نے حرمین اور القدس کو تقدس بخشا یہ صرف قبلۂ اول کا نہیں، قبلتین کا مسئلہ ہے۔ یہ محض حرم قدسی پر قبضے کی جنگ نہیں، حرمین پر تسلط کا معرکہ ہے۔ یہ وقت بحث مباحثے کا نہیں، توبہ، رجوع الی اللہ اور مؤمنانہ عزم کو زندہ کرنے کا ہے۔ آج فتنۂ دجال ٹی وی، ڈش انٹینا اور کیبل کے ذریعے گھروں میں گھس چکا ہے، یہ وقت بے حیائی کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے اور ''معرکۃ المعارک'' (عظیم ترین جنگ) کی تیاری کا ہے جو ہم سے نفاق کے ہر شعبے سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کی علانیہ بغاوتوں کو یکسر چھوڑ دینے کا تقاضا کرتی ہے۔ فلسطین کے بچوں نے اپنے ہاتھوں میں ویسا ہی پتھر تھام رکھا ہے جیسا حضرت طالوت کے لشکر کے بہادر نوجوان جناب سیدنا داؤد علیہ السلام نے جالوت کی پیشانی پر مارا تھا۔ عراقی مجاہدین ٹینکوں کا مقابلہ گدھا گاڑیوں سے کر رہے ہیں۔ ان پتھروں اور گدھا گاڑیوں نے جالوت کے لشکر پر دہشت طاری کر رکھی ہے۔ مشاہدات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اب یہودی ہلاک شدگان اور مسلمان شہداء کا تناسب گھٹ کر تین اور ایک رہ گیا ہے جبکہ کسی وقت یہ ایک اور دس ہوتا تھا۔ نیز اسرائیل سے واپس جانے والوں میں ۶۰ فیصد اضافہ اور آنے والوں میں ۷۰ فیصد کمی ہوگئی ہے اور اس طرح نہتے فلسطینی جانبازوں نے تن تنہا وہ کام کر دکھایا ہے جو مالدار عرب ریاستوں سے نہ ہو سکا۔ وہ حواس باختہ ہو کر مسلم تہذیب و روایات اور تشخص و ثقافت، کو مٹانے اور دینی اداروں کے بابرکت نظام کو سبوتاژ کرنے پر تل گیا ہے۔ اب یا تو کامل ایمان ہوگا یا کامل نفاق، بیچ کا ڈھل مل کرتا درجہ ختم ہونے والا ہے۔ اب یہ فیصلہ صاحبِ ایمان لوگوں نے کرنا ہے کہ وہ کس لشکر، کون سے گروہ اور کس جماعت میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟؟؟

ہیکل سلیمانی: فسانہ یا حقیقت

افواہیں اور حقیقت:

گزشتہ ہفتے کے دن جب یہودیوں کے ایک متعصب ترین گروہ ۔نے قبلہ اول، ثالث الحرمین الشریفین، مسجد اقصیٰ کے قریب ''ہیکل سلیمانی'' کی علامتی بنیاد کے طور پر تقریباً پانچ ٹن وزنی سنگ مرمر کا ایک پتھر رکھنے کی کوشش کی تو وہ افواہیں حقیقت میں بدل گئیں جو صہیونی عزائم کے حوالے سے سننے میں آتی رہی تھیں۔ باخبر مسلم زعماء اور فلسطینی مجاہدین کے رہنما بے خبر اور اپنے حال میں مست مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے کہ یہودی ہیکل سلیمانی کا نقشہ تیار کیے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اس کا قیمتی ترین ماڈل بھی بنا رکھا ہے اور اپنی مذہبی روایات (جن میں سے اکثر ایسی عجیب وغریب رسومات اور قصے کہانیوں پر مشتمل ہیں جو بلاشبہ من گھڑت اور یہودی پادریوں کی خود ساختہ ہیں) کی روشنی میں اس کی تعمیر کا خاکہ اور مطلوبہ دیگر اشیاء مہیا کی ہوئی ہیں۔ بس وہ ایسے مناسب موقع کی تلاش میں ہیں جب ہزاروں سال بعد وہ اپنی قوم کو یہ خوش خبری سنا سکیں ہم نے ''ہیکل سلیمانی'' کی تیسری مرتبہ تعمیر کا کارنامہ انجام دے لیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جب ''معماران ہیکل'' کے نام سے موسوم متشدد اور جنونی قسم کے یہودیوں کی ایک جماعت مسجد اقصیٰ کے ''باب المغاربہ'' کے قریب دیوار براق (جسے یہودی دیوار گریہ کہتے ہیں) کی سیدھ میں یہ پتھر رکھنے کے لیے جمع ہوئی (جس کی خریداری کے لیے امریکی یہودیوں نے بطور خاص چندہ دیا تھا) تو فلسطینی مسلمانوں نے نہتے ہونے کے باوجود شدید مزاحمت کی اور ان ''دلاور'' یہودیوں کو چند سیکنڈ میں مار بھگایا جو اپنی قوم سے ہیکل کا معمار ثالث

ہونے کا اعزاز حاصل کرنا اور یہودیت کی تاریخ میں نام لکھوانا چاہتے تھے۔ اطلاعات کے مطابق موقع پر موجود مسلمانوں کو اور کچھ نہ ملا تو انہوں نے پاس پڑے پتھروں اور اپنے جوتوں سے یہودیوں کی خبر لی اور ان کی ساری شیخی کو گندے پانی کی جھاگ کی طرح اڑا دیا۔ ان انتہا پسند یہودیوں کی رسوا کن اور ذلت آمیز پسپائی پر قریب کھڑے یہودی سپاہی اور فوجی سیخ پا ہو کر فلسطینی مسلمانوں پر چڑھ دوڑے اور متعدد کو زخمی کر دیا، لیکن فلسطینی مسلمانوں نے یہ زخم ہنسی خوشی سہہ کر ثابت کر دیا کہ وہ جیتے جی مکار یہودیوں کا منصوبہ کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ اس موقع پر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "ہیکل سلیمانی" کیا ہے؟ یہودی اس کے متعلق کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ مسجد اقصیٰ پر ان کے دعوے کے دلائل میں کتنا وزن ہے؟ خدا اور رسول کی نافرمان اور انبیاء علیہم السلام کی گستاخ یہ مردود و مبغوض قوم مستقبل میں کیا ارادے رکھتی ہے؟ ان کی کھوپڑی میں جمع شدہ یہ گندے بخارات کس طرح نکالے جا سکتے ہیں اور ان کے اس دماغی فتور کا علاج کیا ہے؟ ذیل کی سطروں میں آپ انہی چند سوالوں کا جواب ملاحظہ فرمائیں گے۔

ہیکل کیا ہے؟

ہیکل کے معنی معبد کے ہیں یعنی عبادت گاہ۔ یہودیوں کا عقیدہ اور دعویٰ ہے (اور انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ بودا دعویٰ نہ ہوگا) کہ جہاں آج مسجد اقصیٰ کی چار دیواری ہے وہاں کسی زمانے میں حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ السلام کی تعمیر کردہ عبادت گاہ تھی جو بعد میں منہدم ہوگئی۔ معراج کی رات جب سید الاولین والآخرین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو (بشمول حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ السلام) یہاں نماز پڑھائی اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس فتح کر کے یہاں مسجد اقصیٰ کی جدید تعمیر کی بنیاد رکھی تو اس وقت یہودی در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اب جبکہ صدیوں کی ذلت سہنے کے بعد دوبارہ القدس پر قابض ہوگئے ہیں، اس لیے وہ یہاں ہیکل تعمیر کر کے اپنی اس مذہبی یادگار کو زندہ کرنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھٹکار کے سبب زمانے کے بھول بھلیوں میں ان سے گم ہوگئی تھی...... لیکن کیا واقعی یہودیوں کا یہ نظریہ اور دعویٰ درست ہے؟ مسلمانوں،

عیسائیوں اور خود یہودیوں کے مستند مذہبی مآخذ اور تاریخی حقائق اس کی تردید کرتے ہیں۔
آسمانی کتب، مذہبی صحائف اور تاریخی مآخذ کی روشنی میں یہ بات ناقابل تردید حقیقت کے طور پر ثابت ہے کہ جہاں آج مسجد اقصیٰ موجود ہے، اس جگہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور سے ہزاروں سال قبل ابتدائے آفرینش میں ہی عبادت گاہ موجود تھی اور یہودیوں کے دنیا میں وجود سے قبل اللہ کے نیک بندے اس جگہ کو اپنی پیشانیوں کے لمس سے آباد کرتے چلے آئے تھے۔ بعض مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ سب سے پہلے حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما الصلوٰۃ والسلام نے تعمیر کی اور اس میں جنات سے کام لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جگہ ابوالانبیاء والبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے عبادت گاہ کے طور پر معروف تھی۔ صحیح بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر میں چالیس سال کا فاصلہ ہے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی تھی۔ اس حساب سے بیت المقدس کی اولین تعمیر دور سلیمانی سے بہت عرصہ قبل ہو چکی تھی۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی مقدس کتابوں کی رُو سے بھی یہ امر ثابت ہے اور کوئی یہودی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

استحقاق کا دعویٰ کیسے؟

پھر دوسری بات یہ ہے کہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر کے بعد بھی یہاں کئی مرتبہ تعمیرات ہوئی ہیں۔ بعض مرتبہ زلزلہ کی وجہ سے اور بعض مرتبہ بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار کی وجہ سے مکمل انہدام کے بعد نئی تعمیر ہوئی ہے۔ چھٹی صدی قبل از مسیح کے اوائل میں بابل (عراق میں پروان چڑھنے والی ایک قدیم تہذیب کا مرکز) کے حکمران بخت نصر کو جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر مسلط کیا تو اس نے یروشلم کو فتح کر کے یہاں کے یہودیوں کو پیوند زمین کر دیا۔ بقیہ کو غلام بنا کر لے گیا، اس زمانہ میں ڈیڑھ سو سال تک وہاں ویرانی اور ملبہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اہل مصر، فارسیوں اور رومیوں کی فلسطین پر حکومت کے مختلف ادوار گزرے ہیں اور ان کے دور میں یہاں تعمیرات بنتی اور منہدم ہوتی رہی ہیں۔ اس بات سے تاریخ کا ادنیٰ

طالب علم واقف ہے اور یہودیوں کو اس سے انکار کی مجال نہیں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مسجد اقصیٰ کی موجودہ تعمیر سے قبل یہاں بے شمار مرتبہ تعمیرات ہوئی ہیں۔ تو جب حضرت سلیمان علیہ السلام سے قبل یہاں عبادت گاہیں موجود تھیں اور ان کے بعد مختلف قوموں کے ہاتھوں تعمیرات ہوتی رہیں اور یہود کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خود کو اس جگہ کا اوّلین یا تنہا وارث ثابت کر سکیں تو آخر کس بنیاد پر وہ اس کے استحقاق کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ محض اتنی بات کہ بنی اسرائیل کے جلیل القدر نبی سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس جگہ ایک مرتبہ تعمیر کی تھی، یہود کے دعویٰ کے اثبات کے لیے ہرگز کافی نہیں، کیونکہ فارسیوں اور رومیوں سمیت دنیا کی نجانے کتنی قوموں نے اس مقدس جگہ کو بنی اسرائیل سے پہلے اور ان سے زیادہ عرصہ تک بطور عبادت گاہ کے آباد رکھا ہے تو صرف یہودی ہی اس کے دعویدار کیونکر ہو سکتے ہیں؟

القدس کا وارث کون؟

اگر بالفرض بغرض بحث یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں سب سے پہلی تعمیر سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی تھی نیز یہ کہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں موجودہ مسجد اقصیٰ کی بنیاد پڑنے تک یہاں اور کوئی تعمیر نہیں ہوئی تو پھر بھی یہودیوں کو اس مقدس خطے کے ہتھیانے اور یہاں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس وجہ سے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وراثت کے ہرگز حقدار نہیں، یہ بدبخت قوم تو دیگر انبیاء کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان میں بھی سنگین گستاخی کرتی ہے اور ان کے والد سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کی بھی سخت بے ادبی کی مرتکب ہوتی ہے۔ ان کی موجودہ تورات میں ان جلیل القدر انبیائے کرام کے بارے میں ایسے واقعات ہیں کہ قلم میں مجال نہیں کہ ان کو نقل کر سکے۔ حضرات علمائے کرام اور طلبہ علوم دینیہ کی نظر سے وہ اسرائیلی روایات ضرور گزری ہوں گی جن کی تردید حضرات مفسرین سورۂ ص میں حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام کے قصص کے ذیل میں کرتے ہیں۔ علمائے اسلام نے ان روایات کو اصلی الفاظ کی بجائے نسبتاً ہلکے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ یہودیوں کے اصل الفاظ اگر پڑھ لیے جائیں تو انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے

۱۔ یہ سطور اس وقت تحریر کی گئیں جب موصوف زندہ تھے۔

کہ یہ بدباطن قوم ان مقدس ہستیوں کے بارے میں کیسے توہین آمیز نظریات رکھتی ہے اور یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ آج کل ہیکل کے سنگ بنیاد کے حوالے سے انٹرنیٹ پر یہودی جو تفصیلات جاری کررہے ہیں ان میں صاف طور پر ان غلیظ اور من گھڑت روایات کا ذکر موجود ہے جن کو پڑھ کر اس بدبخت قوم پر ازلی رسوائی کی مہر لگنے کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ الغرض جب قوم یہود سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بھی گستاخ اور بے ادب ہے (جبکہ یہودیوں کا قومی نشان، ستارہ داؤدی اور ان کا مذہبی ارمان ہیکل سلیمانی انہی دو عظیم المرتبت باپ بیٹوں کی طرف منسوب ہے) اور قرآن کریم کی سچی خبر کی رو سے حضرت داؤد علیہ السلام نے اس قوم کے لیے بددعا بھی فرمائی ہے (دیکھیں سورۂ مائدہ: ۷۸) تو یہ راندۂ درگاہ یہودی ان حضرات کی وراثت کا دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں؟ ان کے حقیقی وارث تو درحقیقت مسلمان ہیں جو نہ صرف ان انبیاء کی عظیم فضیلت کے قائل ہیں بلکہ ان سے سچی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔

سمجھنے کا نہ سمجھانے کا:

ہیکل کی بنیاد رکھنے کا حالیہ قصہ بھی ایسا عجیب وغریب ہے کہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ یہودیوں کی مذہبی روایات کے مطابق ہیکل کی تیسری تعمیر مسیح موعود کے ظاہر ہونے کے وقت ہوگی جو یہود کو ہزاروں سال کی ذلت سے چھٹکارا دلوائیں گے اور پھر فرشتے اس کی تعمیر کریں گے۔ کٹر یہودیوں کے نزدیک موجودہ مسجد اقصیٰ میں داخل ہونا بھی جائز نہیں کیونکہ اس کے نیچے ہیکل اول ودوم کے آثار موجود ہیں جن کے اوپر چلنا بے ادبی سے خالی نہیں۔ اس واسطے اکثر یہودی اس تعمیر کے لیے کسی غیبی واقعے کا انتظار کررہے ہیں، مگر چند منچلے یہودیوں سے صبر نہیں ہوتا، وہ فرشتوں کی بجائے خود یہ فریضہ انجام دینا چاہتے ہیں مسجد میں داخلے کے جواز کے لیے انہوں نے یہ تاویل نکالی ہے کہ وہاں ہم نماز اور دعا کے لیے جائیں گے اس بہانے سنگ بنیاد رکھ دیں گے (یہ حیلہ قرآن کریم اور کتب تفسیر میں مذکور یہودیوں کے ان حیلوں سے ملتا جلتا ہے جن کے ذریعے وہ حرام کو حلال اور ناجائز کو جائز کرلیا کرتے تھے۔ مثلاً دیکھیے: سورۂ اعراف میں اصحاب السبت کا قصہ) یہودیوں کا یہ گروہ عرصہ دراز سے مسجد اقصیٰ کے انہدام کی کوشش کررہا ہے۔ کبھی مسجد کی بنیادوں کے نیچے آثار قدیمہ کی تلاش کے بہانے سرنگیں کھودی

جاتی ہیں اور کبھی مفسد یہودی اپنے ساتھ ایسا کیمیکل لے جاتے ہیں جو مسجد کی اینٹوں کے درمیان بھرے گئے مصالحے کو ریزہ ریزہ کردے اور ان کی مشکل آسان ہو جائے۔

سوز بھری صدا:

فلسطینی مسلمان اگرچہ یہودیوں کے نرغے میں گھرے ہوئے اور محصور و مجبور ہیں، لیکن ایسی حیرت انگیز شجاعت اور ہمت کا مظاہرہ کررہے ہیں جس کا اندازہ خود یہودیوں اور ان کے سرپرستوں کو بھی نہ تھا۔ اور اس دور میں جبکہ جمہوریت اور انسانی حقوق کا غلغلہ ہے اور لمحے بھر میں ایک واقعے کی خبر دنیا کے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی ہے، اہل فلسطین پر یہودی ایسے مظالم کررہے ہیں جو مہذب دنیا کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں...... لیکن آفرین ہے ان بے کس و بے بس مسلمانوں کو کہ انہوں نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا۔ وہ حوصلے اور بہادری کی ایسی تاریخ رقم کررہے ہیں جس کا آج کے بے خبر مسلمانوں کو تو احساس نہیں لیکن مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اس پر بجا طور پر فخر کرسکیں گی۔ آج مسجد اقصیٰ سوگوار ہے، اس کا شکوہ فلسطینی مسلمانوں سے نہیں کیونکہ وہ مقدور بھر کوشش سے پہلو تہی نہیں کررہے، اس کا شکوہ دنیا بھر کے ان سرمایہ دار مسلمانوں سے ہے جن کا دل فلسطینیوں کی مظلومیت پر نہیں کڑھتا، ان نوجوانوں سے ہے جن کی جوانیاں دنیا پر لگ رہی ہیں، ایوبی کے ان فرزندوں سے ہے جو اس کی طرف نسبت پر فخر تو کرتے ہیں لیکن اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کے لیے قربانی دینے پر تیار نہیں۔ مسجد اقصیٰ سے سوز بھری صدا آتی ہے: آج جو مسلمان میرے غم میں شریک نہیں، کل وہ محشر کی عدالت میں میرا سامنا کس طرح کرے گا؟

سامری کا بچھڑا

آپ جانتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کا اطلاق اس پوری چار دیواری پر ہوتا ہے جسے حرم قدسی بھی کہتے ہیں لیکن عام بول چال میں صرف اس ہال کو بھی مسجد اقصیٰ کہہ دیتے ہیں جو نماز کے لیے مخصوص ہے۔ اس واسطے اس حدود میں واقع ایک ایک انچ کی حفاظت اہل توحید کا فرض منصبی ہے اور اس میں سے ذرا سے ٹکڑے سے دستبردار ہونا بھی سخت بے غیرتی اور بدنصیبی ہوگی۔ موجودہ دور میں اپنے گھناؤنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جس طرح کی مکارانہ سازشیں، دھوکہ وفریب اور ضرورت پڑے تو سفاکانہ دہشت گردی کا جو مظاہرہ یہود نے کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی...... لیکن حیرت کی بات ہے کہ دنیا انہیں مظلوم اور معصوم سمجھتی ہے اور ان کے ہاتھوں ستم سہنے والے مسلمان دہشت گرد قرار پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم یہود کا ہر فرد اپنے حصے کا کام کرتا ہے۔ ان کے صحافی جھوٹ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ان کے سرمایہ دار صہیونیت کے لیے پیسہ لٹانے سے دریغ نہیں کرتے، ان کی خواتین اور بوڑھوں سے بھی جو بن پڑے اسے کر گزرتے ہیں، ان کے منصوبہ ساز ذاتی مفاد کی بجائے اجتماعی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہیں، ان کے سوچنے والے دماغ یہودیت کے لیے سوچتے ہیں اور عمل کرنے والے جسم یہودیت کو پروان چڑھانے کے لیے کارکردگی دکھاتے ہیں۔ سیاسی لیڈروں سے لے کر مذہبی رہنماؤں تک سب صہیونیت کے لیے راستہ ہموار کرتے ہیں خواہ اس کے لیے کتنا ہی بدترین اخلاقی جرم کرنا پڑے۔ اس وجہ سے انہیں عارضی غلبہ ملا ہوا ہے...... لیکن جس دن مسلمان دنیا سے زیادہ آخرت کو، زندگی سے زیادہ شہادت کو اور ذاتی سے زیادہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے

لگیں گے، اس دن یہودیت مردہ چھپکلی کی طرح زمین سے چمٹی ہوئی کراہ رہی ہوگی۔ بس اس چیز کا شعور مسلمانوں میں پیدا ہونے کی دیر ہے، یہودیت کا طلسم فنا ہونے اور اس کی برتری پامال ہونے میں اتنا وقت بھی نہ لگے گا جتنا سامری کے بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ سمندر میں بہانے میں لگا تھا۔

عظیم تر اسرائیل کیا ہے؟

پچھلی مجلس کے اختتام پر بات چل رہی تھی کہ بعض حضرات عرب حکمرانوں کے بارے میں حقائق پر مشتمل تبصروں کو سوءِ ادب گردانتے ہیں اور مقامات مقدسہ کی تعمیر کے حوالے سے ان کی خدمات کے پیش نظر اس بارے میں سکوت کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ بات سن کر وہ کرنل صاحب یاد آجاتے ہیں جن کی خوش اطواری ہم نے زمانہ طالب علمی کے آخر میں ملاحظہ کی تھی۔ یہ کرنل صاحب وردی اور بوٹوں کے بوجھ سے آزاد کر دیے گئے تھے، لیکن ان کا کرنیلی جتانے کا شوق سرد نہ ہوا تھا۔ وہ ہر لمحہ یہ باور کراتے رہنا چاہتے تھے کہ وہ کوئی خاص قسم کی مخلوق ہیں جن کو ہر آدمی ''سر'' کہہ کر پکارے، ''یس سر'' کہہ کر جواب دے، ان کے لیے راستہ چھوڑ دے، دروازہ کھولے، اگر ان کی ''اسٹک'' گر جائے تو اٹھا کر پیش کرے، جب وہ آجائیں تو سب مؤدب ہو جائیں اور جب تک وہ رخصت نہ ہو جائیں تب تک ان کے رعب سے سہمے رہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وردی اتر جانے کے بعد کون کسی کے یہ ناز اٹھاتا اور چونچلے برداشت کرتا ہے لیکن کرنل صاحب نے اپنے اس ذوقِ انانیت کی تکمیل کے لیے یہ راستہ ڈھونڈ لیا تھا کہ وہ محلے کی مسجد کمیٹی کے صدر منتخب ہو گئے۔ اب تو خدا دے اور بندہ لے۔ مسجد میں گویا مارشل لا نافذ ہو گیا۔

سب سے پہلے کرنل صاحب نے مسجد کی کھڑکیوں اور دروازوں میں جالیاں لگوائیں، صحن کے فرش کو جھاگ والے پاؤڈر سے مل مل کر آئینہ نما بنایا گیا، نالیوں کے متعلق حکم ہوا کہ چاندی کی طرح چمکی ہوئی ہونی چاہییں، بیت الخلاء کے لیے الگ سے چپلیں رکھوا دی گئیں، کیاریوں اور پودوں کو پانی لگانے کا نظم الاوقات طے کیا گیا، دریوں کو سونگھ سونگھ کر دیکھا جانے لگا کہ کہیں ان کی

دھلائی باسی تو نہیں ہوگئی۔ غرض یہ کہ کرنل صاحب نے اپنی فراغت کا ایسا بھرپور حل تلاش کیا کہ فوجی چھاؤنی اور مسجد کے احاطے میں فرق معلوم کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ بظاہر یہ سب کچھ کرنل صاحب کے دل میں موجود خانۂ خدا کی خدمت کے جذبے کا مظہر تھا لیکن کرنل صاحب کے انداز واطوار کا مشاہدہ کرنے سے...... جو ہم لطف لے لے کر کیا کرتے تھے...... یہ بات شبہے سے بالاتر ہو جاتی تھی کہ وہ یہ سب کچھ اپنی صدارت کے تحفظ، حکم دینے کی عادت کی تسکین اور انانیت سے اٹی ہوئی اکھڑ طبیعت کی تشفی کے لیے کیا کرتے تھے۔ مسجد میں ان کے آنے کا انداز، کمیٹی کے دیگر ارکان اور خدام مسجد کے ساتھ ان کا یہ رویہ اور وقتاً فوقتاً ان کے نادر شاہی فرامین سب اس امر کے غماز تھے کہ اس شخص کو خانہ خدا کی خدمت کے اجر وثواب اور انوار و برکات سے کوئی خاص غرض نہیں، یہ اپنی طبیعتِ ناموزوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ رفاہی خدمات انجام دے رہا ہے۔ جس شخص کے اقدامات حکیمانہ نہیں حاکمانہ ہوں، جس کا رویہ اخلاقیات سے عاری اور نخوت بھرا ہو، وہ اگر خانۂ خدا سے تعلق میں اخلاص وخدمت کا دعویٰ کرے تو اس پر یقین کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ڈاڑھی منڈے مچھڑ پیر کی گالیوں کو ''پہنچی ہوئی سرکار کے تبرکات'' سمجھ کر سینے سے لگائے پھرے۔

حرمین شریفین کے موجودہ خدام کی تعمیری وتوسیعی خدمات بلاشبہ مثالی ہیں لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ان میں کرنل صاحب مذکور کی عادات واطوار کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان حضرات نے اپنے ملک میں کھیل، تفریح اور ''انٹرٹینمنٹ'' کو خوب فروغ دے رکھا ہے۔ یورپ اور امریکا میں کون سی ایسی تفریح ہے جو انہوں نے اپنے عوام کو گھر بیٹھے مہیا نہ کر رکھی ہو لیکن مجال ہے ان کی حدود مملکت میں جہاد کے بارے میں کسی کو ایک لفظ کہنے کی اجازت ہو۔ ان کے پڑوس میں اسرائیل کا ہر نوجوان عسکری تربیت سے آراستہ ہے لیکن یہ ''محافظین حرمین'' اپنے نوجوانوں کے لیے جہادی تربیت کو شجر ممنوعہ قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے عوام پر جو جبری نظام مسلط کر رکھا ہے اس کی شدت کی انتہا یہ ہے کہ ان کی حدود مملکت میں جہاں تین افراد جمع ہو جائیں وہاں چوتھا حکومتی جاسوس ہوتا ہے جو اس بات کی کھوج لگاتا ہے کہ کہیں شیخ اُسامہ کا

تذکرہ یا امریکا کی مخالفت کے سنگین جرم کا ارتکاب تو نہیں ہو رہا۔ ان صاحب ایمان حکمرانوں کی اُمت مسلمہ کے لیے دل سوزی کا یہ عالم ہے کہ یورپ و امریکا کی کوئی تفریح گاہ ایسی نہیں جہاں وہ دادِ عیش نہ دیتے ہوں اور ان کے جو نوجوان مغربی دنیا کے تفریحی اداروں سے دل بہلائیں تو یہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ ان کی توجہ بٹی رہے، لیکن اگر کسی کے متعلق معلوم ہو جائے کہ یہ سرزمین جہاد میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے یا وہاں سے ہو کر آیا ہے تو اس کے متعلق ان کی تشویش اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک وہ سلاخوں کے پیچھے نہیں پہنچ جاتا۔ ویسے تو مسلمانوں کی بدحالی کا تذکرہ کرتے ان کی زبانیں نہیں تھکتیں لیکن انہوں نے اپنی جیلوں میں مجاہدین یا امریکا مخالفین کے لیے ایذاءرسانی کے جو طریقے فراہم کر رکھے ہیں ان کو سن کر انسان کو یقین نہیں آتا کہ یہ حکمران اپنے دل میں مسلمانوں کا اس قدر ''درد'' رکھتے ہوں گے۔ اس موضوع کا ذکر صاحبِ ایمان کے لیے کوفت و رنج کا باعث ہے لیکن اس بحث کو چھیڑے بغیر فلسطین کے ان زخموں سے آشنائی نہیں ہو سکتی جو یہود مردود کے ہاتھوں اس مقدس سرزمین کو لگے ہیں اور ان حکمرانوں نے ان کے علاج کے لیے اتنا بھی نہیں کیا جتنا یہ اپنے پالتو جانوروں کے لیے کرتے ہیں۔

عرب کی مالدار ریاستوں کے مطلق العنان بادشاہوں کی اُمت مسلمہ سے خیانت دنیا کے سامنے نہ آتی اگر لارڈ رچرڈ کی تجوری میں موجود ''گریٹر اسرائیل'' کا خفیہ نقشہ آشکارا نہ ہو جاتا۔ رچرڈ ایک کٹر یہودی تھا، انتہائی متعصب اور شدت پسند، مالدار اتنا تھا کہ اسے خود بھی اپنی دولت کا صحیح صحیح اندازہ نہ تھا۔ اس نے اپنی ساری دولت صہیونیت کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اعلان بالفور کے ذریعے یہودی ریاست کا خاکہ تشکیل دیا گیا تو اس وقت صہیونی منصوبہ سازوں کے سامنے اہم مسئلہ فلسطین میں یہودی آبادی کا تناسب بڑھانے کا تھا۔ اس شخص نے دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں بسانے کے لیے اپنی خزانوں کے منہ کھول دیے۔ اس نے فلسطینی باشندوں کو منہ مانگی قیمت ادا کر کے ان سے زمین خریدنا شروع کی اور وہاں یہودی بستیاں تعمیر کرنے کے لیے پیسے کو بے دریغ

لٹایا۔ اس وقت کے علما نے عوام کو سختی سے منع کیا کہ وہ یہودیوں کو زمین بیچ کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی نہ ماریں۔ دردمند مسلمانوں نے دنیا بھر کے مشاہیر علما سے اس بارے میں فتاویٰ منگوائے اور عوام الناس کو مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی لیکن رچرڈ جیسے یہودیوں کی دولت نے عامۃ المسلمین کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا اور وہ مہنگی قیمتوں کے لالچ میں اپنی زمین دھڑا دھڑ فروخت کرتے چلے جا رہے تھے۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور کابل کے بعض علاقوں میں یہ کھیل ایک بار پھر دہرایا جا رہا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ عوام الناس اس وقت تک ہوش کے ناخن نہیں لیتے جب تک پانی سر سے اونچا نہیں ہو جاتا۔ علمائے کرام کی نصیحتوں اور مسلم زعماء کی اپیلوں پر کسی نے کان نہ دھرا اور رچرڈ جیسے سرمایہ دار یہودیوں کی وجہ سے فلسطینی زمینوں کی ملکیت اس وقت تک یہودیوں کے کھاتے میں منتقل ہوتی رہی جب تک یہودی اکثریت میں نہ ہو گئے۔ جیسے ہی ان کی آبادی کا تناسب مطلوبہ مقدار تک پہنچا تو انہوں نے مسلمانوں کو زبردستی ان کے گھروں سے بے دخل کر کے ہجرت پر مجبور کرنا شروع کر دیا اور وہ دولت مسلمانوں کے کچھ کام نہ آئی جو بزعم خود انہوں نے یہودی سرمایہ داروں سے اینٹھی تھی۔ لارڈ رچرڈ جب مرا تو اس کی دستاویزات سے ''عظیم تر اسرائیل'' کا نقشہ برآمد ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ اسرائیل تو ابھی ابتدائے نحوست ہے آگے آگے نجانے کیا غضب دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر یہ برآمد شدہ نقشہ آپ دیکھ لیں تو دل پر ہاتھ رکھ کر آپ بار بار سوچیں گے کہ اس نقشے میں دیے گئے رقبے (جو نیل سے دجلہ اور صنوبر والی زمین (لبنان) سے کھجوروں والی زمین (مدینہ منورہ) تک پھیلا ہوا ہے) اب کون سا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ ہم اور آپ بلکہ ہر وہ انسان جسے روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کو اس حال میں اپنے اعمال کا جواب دینا ہے کہ اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان کوئی اور حائل نہ ہوگا، صلیبیوں کے کندھے پر چڑھ کر آنے والے اس صہیونی طوفان کو روکنے کے لیے کیا کر رہا ہے؟؟؟ کیا ہم سب عرب حکمرانوں کی طرح اپنے آپ میں مست رہ کر یہود اور ان کے آلۂ کار عیسائیوں کے لیے تمام راستے کھلے چھوڑ دیں گے؟؟؟ یہ مسلمانوں کی غیرت کو درپیش وہ چیلنج ہے جس کے جواب کی تیاری پر ان کا مستقبل موقوف ہے۔

القدس کے فدائیوں کے نام

یہ ۸/ دسمبر ۱۹۸۷ء بروز منگل کی ایک یخ بستہ شام کا ذکر ہے، فلسطین میں زبردست سردی پڑ رہی تھی، سڑکیں سرِ شام سنسان ہو گئی تھیں اور لوگ جلد از جلد اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جانا چاہتے تھے تاکہ آگ کے سامنے بیٹھ کر شعلوں کی تپش کو جسم کی رگوں میں اتار دیں اور ہڈیوں میں اترتی سردی سے چھٹکارا پا سکیں۔ فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ ہونے کو تقریباً ۴۰ سال ہو آئے تھے (ارضِ مقدس انگریز کی بد دیانتی اور یہود نوازی کے سبب ۱۴/ مئی ۱۹۴۸ء کو یہود کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہوئی تھی) فلسطینی مسلمان عالمی طاقتوں اور ان کو استعمال کرنے والے عیار صفت یہودیوں کی حرکتیں دیکھ رہے تھے، ان کی مکاریوں کا بے نیازی سے جائزہ لے رہے تھے اور ان میں تاحال اس ننگے ظلم کے خلاف کوئی مربوط ردعمل نہ پایا جاتا تھا۔ نہ قومی اور اجتماعی سطح پر انہوں نے ارضِ مقدس میں آ گھسنے والے غاصبوں کے خلاف کسی تحریک یا جدوجہد کی منظّم صورت اپنائی تھی۔ ان کی صفوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، لیکن یہ خاموشی ایسی تھی جو کسی طوفان کی آمد سے قبل سمندر کی سطح پر ہیبت ناک انداز میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ عالمی استعمار اور صہیونی تحریک کے گماشتوں کی حرکتوں کا تماشہ کر کر کے ان مکاروں کے خلاف ان کے دلوں میں چالیس سال سے جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا وہ پھٹ پڑنے کو تھا۔ بس ایک ہلچل یا دھماکے کی ضرورت تھی جو منگل کی اس شام کو ایک درندہ صفت یہودی ڈرائیور نے فراہم کر دی۔

ہوا یوں کہ فیکٹریوں میں کام کرنے والے فلسطینی ملازم تھکے ہارے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ یہ غریب اور خستہ حال افراد کرائے کی مسافر گاڑیوں میں لدے پھندے ٹھسے

ہوئے تھے اور ایک سخت جاں گسل دن گزار کر جلد از جلد اپنے کچے پکے گھروں میں پہنچ کر اپنے بیوی بچوں کے درمیان سکون کے چند لمحات گزارنا چاہتے تھے۔ مخالف سمت سے ایک دیوہیکل ٹرک آرہا تھا جس کے اسٹیرنگ کے سامنے ایک خبیث صفت یہودی بیٹھا ہوا تھا۔ چونکہ یہودیوں کو آج تک ان کی خونریز کارروائیوں کا کوئی جواب نہ ملا تھا اس لیے یہ شیر ہوگئے تھے۔ کمینہ صفت لوگوں کی یہ خصلت ہوتی ہے کہ وہ کمزور پر شیر بن جاتے ہیں اور طاقتور کے سامنے بھیگی بلی..... جبکہ شریف آدمی طاقت کا بے جا مظاہرہ کرنے والوں کے سامنے تو ڈٹ جاتا ہے اور اس کا سر نیچا کرنے تک اپنا سر تانے رکھتا ہے، مگر اپنے سے کمتر لوگوں کی جلی کٹی بھی ہنس کر سن لیتا ہے اور ان پر ہاتھ اٹھانا تو کجا، جواب دینا بھی بلند ہمتی سے کم درجے کی بات سمجھتا ہے۔ یہودی ڈرائیور فولادی ٹرک پر اونچی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے جب دیکھا کہ سامنے ٹوٹی پھوٹی گاڑیوں میں سوار غریب مسلمان چلے آرہے ہیں تو اس کو خباثت سوجھی۔ یہ بدبخت جان بوجھ کر ٹرک کو مخالف سمت میں لے گیا اور ان گاڑیوں پر چڑھا ڈالا۔ مسافر گاڑیاں دیوہیکل ٹرک کی زوردار ٹکر سے کھلونوں کی طرح چکنا چور ہوگئیں۔ چار مسلمان موقع پر خالق حقیقی سے جا ملے جبکہ دیگر شدید زخمی ہوگئے۔ بات سنگین تو تھی لیکن اتنا آگے نہ بڑھتی جتنی کہ اسرائیلی حکام کے تعصب نے بڑھا دی۔

انہوں نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر ڈرائیور کو اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کی گاڑی میں بٹھایا اور موقع سے غائب کروا دیا۔ ان کے خیال میں انہوں نے ہوشیاری سے کام لیا تھا لیکن درحقیقت ان کی یہ حرکت ان کے لیے خودکشی کے مترادف ثابت ہوئی اور اس صریح جانبداری نے فلسطینی مسلمانوں کے دل میں بڑھتے ہوئے غم وغصے کے لاوے کو تیلی دکھا دی اور ان میں سے کسی کے دل بھی اب تک یہودی غاصب حکومت کی طرف سے کسی انسانیت کی توقع تھی بھی تو ختم ہوگئی اور دشمن کے ہاتھوں مرنے کی بجائے ''اسے مارو یا عزت سے مرجاؤ'' کا فیصلہ کر کے میدان عمل میں نکل آئے۔ اس دن یہودی ڈرائیور تو محفوظ مقام پر پہنچ گیا تھا لیکن اپنے پیچھے وہ آگ لگا گیا تھا جس نے یہودیوں کا چین سے جینا دوبھر کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کو اپنے لہو

سے ایسی آگ بھڑکانے پر مجبور کر دیا جو غاصب یہودیوں کی مکاری کا جواب بن جائے اور انہیں ارضِ مقدس پر قبضے کو ہضم نہ کرنے دے۔اس آگ کا نام ''انتفاضہ'' تھا جسے دنیا فلسطینی مجاہدین کی سرگرم تحریک جہاد کے نام سے جانتی ہے۔فلسطین کے بیٹوں نے سیاست، مطالبات، مذاکرات، احتجاج اور مظاہروں کو فضول جان کر بالآخر وہ راستہ اپنایا جو یہودیوں کو گُدّی سے پکڑ کر موت کی اس وادی میں دھکیلتا جس کے ڈر سے وہ دنیا بھر سے بھیڑوں کی طرح ہانک کر ارضِ مقدس میں آلائے تھے۔''انتفاضہ'' کی تحریک کا پہلا شہید حاتم السیسی تھا، اس کے بعد فلسطین کے فدائیوں نے اس چراغ کو اپنے لہو سے روشن کر رکھا ہے اور ایثار وقربانی کی دنیا میں انہوں نے ایسی ایسی قندیلیں جلائی ہیں جو رہتی دنیا تک آزادی وحریت کے متوالوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رہیں گی۔

تحریک انتفاضہ اگرچہ دیر سے شروع ہوئی لیکن اس نے کام ہر پہلو سے کیا۔ یہ فقط غاصبوں پر جا برسنے کی دعوت نہ تھی بلکہ اس میں نوجوانوں کی اصلاح، انہیں دین کی حقیقت سمجھنے، اس پر عمل پیرا ہونے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے ذہن سازی کے مربوط عمل کو ملحوظ رکھا گیا تھا چنانچہ جن خوش نصیب نوجوانوں نے اس سے وابستگی پیدا کی، انہوں نے اپنے عہد کو اس شاندار انداز سے نبھایا کہ آج عالمی لغت میں اعلیٰ مقصد پر فدا ہونا اور حماس کا نظریاتی فدائی مجاہد ہونا ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں کو اشکال رہتا ہے کہ فلسطینی فدائین کے ان حملوں سے حاصل وصول کیا ہوتا ہے، الٹا مسلمانوں پر صہیونی تشدد بڑھ جاتا ہے لیکن اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صہیونیوں کا تشدد فدائی حملوں کے آغاز سے پہلے اس سے بھی زیادہ تھا، اب تو ان کو انتقامی کارروائیوں کا خطرہ بے دھڑک ظلم سے روکے رکھتا ہے اور مسلمان آبادیوں پر کارروائی کے لیے آنے والے فوجی گھبراتے ہیں کہ ان پر کہیں سے کوئی ان دیکھا حملہ نہ ہو جائے۔ پچھلے دنوں اخبار میں خبریں آچکی ہیں کہ اسرائیلی فوجیوں کے ایک گروپ نے مسلم آبادیوں میں ڈیوٹی دینے سے انکار کر دیا تھا اور اب ان فوجیوں کو خصوصی مراعات دی جاتی ہیں جو بنی اسرائیل کے

بندروں کی ''یہودی ریاست'' کے تحفظ کے لیے جان جوکھوں میں ڈال کر ان آبادیوں میں ڈیوٹی کے لیے ہمت باندھتے ہیں جہاں ہر لمحے انہیں مسلمان نوجوانوں کی عقابی نظروں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے یکطرفہ میدان مار رکھا تھا اور نہتے شہریوں پر بلا جھجک دل دہلا دینے والے ظلم کے خوفناک کوڑے برساتے تھے۔ ''دیر یاسین'' کا واقعہ اس کی بدترین مثال ہے۔ یہ واقعہ ۹/اپریل ۱۹۴۸ء یعنی اسرائیلی ریاست کے قیام سے صرف ایک مہینے پہلے پیش آیا تھا۔ اس زمانہ میں خفیہ صہیونی ایجنسیوں نے ہر طرف دہشت برپا کر کے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے کے لیے سفاکیت کی انتہا کر دی تھی، انگریزوں کی ناک تلے...... جی ہاں! انہی انگریزوں کی ناک تلے جن کے دیس میں پہنچ جانے کو آج مسلم نوجوان اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں اور اس منافق قوم کی زیادتیوں کو بھلائے بیٹھے ہیں...... یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ نہتے مسلمانوں کی بستیوں پر چھاپے مار کر بہادری کی داستانیں رقم کر رہے تھے۔ انگریزی قانون صرف مسلمانوں کے لیے تھا جو انہیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کی مدافعت سے روک رہا تھا البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر کہیں نکل جانے والے مسلمانوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ یہ فلسطینی مسلمان پڑوسی ممالک میں دربدر کی جوٹھوکریں کھا رہے تھے ان کی ایک جھلک آپ آنے والے ''اے بنی اسرائیل'' نامی مضمون میں دیکھ سکتے ہیں جو پاکستان کے ایک مشہور ادیب جناب قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت سوانح حیات سے لیا گیا ہے۔

اس زمانے میں مسلمانوں پر جو مظالم کیے گئے اسے ایک مغربی مصنف آرنلڈ ٹائن بی نے اپنی کتاب (A Study of History) میں نقل کیا ہے اور اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ دنیا بھر میں اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے یہودیوں کے یہ مظالم تو جرمن نازیوں کے ان مظالم سے بھی زیادہ تھے جس کا مزہ انہوں نے تازہ تازہ چکھا تھا مگر پھر بھی باز نہ آئے تھے۔ ۹/اپریل ۱۹۴۸ء کی رات دیر یاسین کے مکینوں کو کبھی نہ بھولے گی جب مسلح یہودی ان کی بستی پر چڑھ آئے اور ایسی ننگ انسانیت کارروائیاں کیں جو کوئی ایسی قوم نہیں کر سکتی جس میں شرافت

اور اخلاق کی ذرا سی رمق بھی موجود ہو۔ ان ظالموں نے مسلمان نوجوانوں اور مردوں کو گھروں سے نکال کر بے دریغ شہید کیا۔ (یاد رہے کہ اس بستی کے کسی شخص نے کسی یہودی کو قتل یا اس پر حملہ نہ کیا تھا مگر پھر بھی ان کے خلاف وہ کچھ ہوا جو انسان کو لرزا دیتا ہے۔ یہ فدائی حملوں کی برکت ہے کہ یہودی پہلے سے زیادہ طاقتور ہیں مگر کم از کم ایسی حرکت آج وہ سوچ بھی نہیں سکتے) بچیوں اور عورتوں سے جو سلوک کیا گیا اس سے حیا کی پیکر ان شریف زادیوں کی چیخوں سے آسمان ہلا جاتا تھا مگر سنگ دل یہودیوں پر اس دن شیطنت سوار تھی۔ وہ انہیں زبردستی ہنکاتے تھے، چلنے پر مجبور کرتے تھے، ان کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے گرد اسلحہ لہرا لہرا کر قہقہے لگاتے تھے۔ وہ دن اس بستی والوں کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا مگر ان کو جرمِ ضعیفی کی ایسی سزا دی جا رہی تھی جس کا تصور بھی انسان کو لرزا دیتا ہے۔ افسوس کہ آج تک ان مظالم کا صحیح انتقام نہیں لیا جا سکا ہے اور یہودیوں کا یہ قرض روئے زمین پر بسنے والے ہر مسلم نوجوان کے ذمہ باقی ہے۔ یہودی چاہتے تو ان سب کو ان کے مردوں کی طرح شہید کر سکتے تھے مگر اس سے ان کی ناپاک فطرت کی تسکین نہ ہوتی تھی۔ وہ ان عورتوں، بچوں، بچیوں اور بوڑھوں پر امریکا اور برطانیہ کے دیے گئے اسلحے سے دہشت بٹھانا چاہتے تھے۔ جب ابلیسیت کا یہ رقص اختتام کو پہنچا تو اگلے دن یہودی میراثی کرائے کی گاڑیوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے: ''ہم نے دیر یاسین کی آبادی کے ساتھ یہ کیا اور یہ کیا، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔''

اور قارئین کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس روز حملہ آور یہودیوں کا سرغنہ کون تھا؟ وہی پاگل گینڈا جسے لوگ ایرل شیرون کہتے ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کو اس سے مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا حل نکالنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس بدطینت شخص نے اس شرمناک کارروائی کی تکمیل کی اطلاع پا کر اپنے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا تھا: ''تم نے آج تاریخ رقم کی ہے، قوم یہود تمہارے کارنامے کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔'' فلسطینی مسلمانوں کے پاس اپنی بے بسی کا کوئی علاج نہ تھا اور بنی اسرائیل کے ملعون بھیڑیے ظلم و ستم کی تاریخ یونہی رقم کرتے

رہتے اگر دسمبر ۸۷ء کا وہ واقعہ پیش نہ آتا جس کا ذکر مضمون کے آغاز میں ہوا ہے اور جس نے مسلمانوں کو بالآخر کچھ کر گزرنے کا عزم دے کر ایک نئی راہ سجھائی۔ کم نفری اور کم ہتھیار سے دشمن کے خلاف لڑنے کے لیے اس وقت تک گوریلا جنگ ایجاد ہوئی تھی جو فلسطین کے مخصوص حالات کے تحت مجاہد جانبازوں کے لیے ممکن نہ تھی لہٰذا انہوں نے عسکریت کی دنیا میں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا اور دنیا کو فدائی حملوں کی تیکنیک سے متعارف کروایا جو خالی ہاتھ اور وسائل سے تہی دست مسلمانوں کے لیے تحفہ اور ان کے دشمنوں کے لیے سر پر لٹکتی ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کے متعلق معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی نوک پیٹ کو پہلے چاک کرے گی یا اس کا پھل گردن کا پہلے صفایا کرے گا۔ شروع شروع میں مجاہدین کے رہنما اس جانثار فدائی کا تعارف شائع کرتے تھے جو کامیاب کفر کش حملہ کرتا تھا، مگر اس کا نقصان یہ ہوتا تھا کہ یہودی فوجی اس کا گھر مسمار کر دیتے تھے۔ تب یہ فیصلہ کیا گیا کہ شہید کا نام ظاہر نہ کیا جائے گا اور اب تو وفا کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے کہ باہر سے آنے والے مجاہد بھی فدائی دستوں میں شریک ہو کر اخوت و ایثار کے جذبے کا مظاہرہ کر رہے ہیں جس کی نظیر دنیا کی اور کوئی قوم مشکل سے ہی پیش کر سکے گی۔ قربانیوں اور جنت کی بلندیوں کی طرف یہ سفر جاری ہے اور خوش نصیب آگے بڑھ بڑھ کر اپنی پاک جانوں کا نذرانہ اس مقدس مشن کے لے پیش کرتے رہیں گے جس کی تکمیل بالآخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی کے مبارک ہاتھوں سے ہوگی۔ القدس کے فدائیو! تمہیں یہ اعزار مبارک ہو۔

اے بنی اسرائیل......!

بیروت کا شمار بھی دنیا کے ان مہذب شہروں میں ہوتا ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بندرگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی بید کی چھڑی گھما گھما کر بہت سے گداگروں کو منتشر کر رہا تھا جو سیاحوں پر بھوکی چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ فلسطینی مہاجرین کا ایک خاندان سپاہی کی نظر بچا کر ایک طرف سہما کھڑا تھا۔ ظاہراً وہ دست سوال دراز نہیں کر رہے تھے، لیکن ان کے چہرے اپنی بے زبانی سے پکار پکار کر ان کی بے بسی اور خستہ حالی کی فریاد کر رہے تھے۔ اس خاندان میں ایک چھ سات سال کا لڑکا تھا، ایک آٹھ نو سال کی لڑکی تھی اور ان کی ماں ایک ادھوری بہار کی طرح تھی جسے وقت سے پہلے ہی خزاں نے پامال کر دیا ہو۔ وہ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی، کبھی راہ گیروں کی طرف اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھک منگوں کو بھگا رہا تھا۔ مجھے رکتا دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا: ''کیا آپ ہماری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں؟'' جس طرح ہمارے یہاں کے فقیر دیا سلائی یا بوٹ پالش کا سہارا لے کر بھیک مانگتے ہیں، اسی طرح فلسطین کے مہاجرین تصویر کھنچوا کر بخشش کی امید رکھتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال، تیکھے تیکھے نقوش اور اداس آنکھیں تصویر کشی کے لیے بڑے تابناک موضوع ہیں اور کیمرے والے سیاح ان کی فوٹو اتار کر بڑی فراخ دلی سے بخشش دیتے ہیں۔

تصویر کی فرمائش سن کر میرا جی چاہا کہ میں اس بچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لوں اور کہوں کہ میرے معصوم فرشتے! ابھی خدا نے وہ مصوّر پیدا نہیں کیا جو تیری تصویر کا حق ادا کر سکے۔

تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، اس جھلستی ہوئی دھوپ میں تمہارے پاؤں ننگے ہیں اور تمہاری سہمی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی خشک ہو چکی ہے۔ وہ تیری ماں ہے جسے قدرت نے شباب کی منزل سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے، اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر شاید کوئی فریاد لرز رہی ہے، لیکن وہ سپاہی کے ڈر سے اپنا منہ نہیں کھول سکتی یا شاید اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک غضبناک بددعا تڑپ رہی ہے جو اس نے صرف اس ڈر سے روکی ہوئی ہے کہ کہیں اس دنیا کا بھی وہی حشر نہ ہو جو عاد اور ثمود کی بدنصیب اقوام کا ہوا تھا، اور وہ تیری گڑیا سی بہن جس نے ایک ہاتھ میں اپنی ماں کا دامن تھاما ہوا ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ تمہیں واپس بلا رہی ہے تا کہ کوئی راہگیر تمہیں زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ نہ لے جائے، اس ننھی سے معصوم بچی کے پاؤں بھی ننگے ہیں، اس کے کپڑوں میں بھی بہت سے سوراخ ہیں، اس کے سنہری بال ریشم کے اُلجھے ہوئے گچھوں کی طرح پریشان اور گھنگریالے ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذرے ابرق کی طرح چمک رہے ہیں۔ بچی کی پلکیں گھنی اور نوکدار ہیں اور اس کی اداس آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی اتھاہ گہرائیاں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر یہ بچی آسمان پر پیدا ہوئی ہوتی تو بے شک جنت کی حور بنتی لیکن وہ اس بے رحم زمین پر پیدا ہوئی اور بنی آدم اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں خدا کا یہ نادر شاہکار بھوک سے مرجھایا ہوا ہے، خوف سے سہما ہوا ہے، بے گھر ہے، بے سہارا ہے، اداس ہے، پامال ہے......

اس بچی کی جلد زیتون کی طرح تازہ اور شفاف ہے۔ اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے اس میں ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور فلسطین کے پھولوں کی نگہت اور فلسطین کے انگوروں کا رس رچا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے وجود میں القدس کی اَن گنت صدیوں کے تقدس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پرورش بڑے بڑے بزرگوں کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ اس کی تربیت میں آسمانی صحیفوں کا ہاتھ ہے جو خدا نے اس برکت والی زمین پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آباؤ اجداد ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک ٹکڑے اور سہارے کی ایک جھونپڑی کے لیے ننگے پاؤں اور ننگے سر بیروت کی گلیوں میں

پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو ایک بار پھر وہ گھر یاد آنے لگا ہے جس سے ڈھائی ہزار سال قبل خدا نے انہیں نکال باہر کیا تھا۔ یہودیوں کا جدید ترین مقدس خط ۱۹۱۷ء کو ”بالفور“ کے دفتر خارجہ کی جانب سے نازل ہوا اور جس میں بشارت دی گئی تھی کہ شاہِ انگلستان کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر مہیا کرنے کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں یہودیوں کی ہر ممکن مدد کرے گی......

جس عقیدت مندی سے یہ یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر اسی طرح انہوں نے اپنی الہامی کتاب تورات کو بھی مانا ہوتا تو شاید بنی اسرائیل کو ہزاروں سال تک دربدر کی خاک نہ چھاننا پڑتی۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا جہان کے لوگوں پر فضیلت دی۔ جب خدا نے تمہیں قوم فرعون کے پنجے سے چھڑایا جو تمہیں بڑے بڑے دکھ دیتے تھے۔ تمہارے لڑکوں پر چھری پھیرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جب خدا نے تمہارے لیے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تم کو بچا کر فرعون کے آدمیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر ”من وسلویٰ“ اتارا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری اور اس میں سے تمہارے لیے پانی کے بارہ (۱۲) چشمے پھوٹ نکلے۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن بھی یاد کرو جب خدا نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم حق کے ساتھ باطل کو نہ ملانا اور خدا کی آیات کو سستے داموں نہ بیچنا، لیکن تم اس وعدے کو وفا نہ کر پائے اور تم نے بڑی ہٹ دھرمی سے بچھڑے کو اپنا خدا بنا لیا۔ تم نے من وسلویٰ کی نعمت کو ٹھکرا کر ساگ پات، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز کی فرمائش کی۔ اپنی اکڑ میں آ کر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹلایا اور بعض کو ناحق جان سے مار ڈالا اور خدا نے تمہاری نافرمانیوں کی پاداش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ کبھی تم کو بجلی نے لے ڈالا، کبھی تم راندۂ درگاہ ہو کر بندر بنا دیے گئے، کبھی تمہارے سر پر طور کا پہاڑ لٹکا دیا گیا۔

اے بنی اسرائیل! بے شک تمہارے دل پتھر ہو گئے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور ان سے پانی رسنے لگتا ہے۔

اے بنی اسرائیل! آج تمہاری نسل بالکل اس طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خدا کے کلام تورات کی شکل بدل ڈالی تھی۔ تمہاری رگوں میں جو لہو گردش کر رہا ہے، اس میں اسرائیلی خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دنیا کے گوشے گوشے میں مارے مارے پھر رہے ہو اور تمہاری نسل دوسری قوموں میں خلط ملط ہو کر اب اپنی کوئی امتیازی حقیقت نہیں رکھتی۔ یوں بھی تم نے خدا کے رسولوں کی جگہ اب امریکا اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمہاری موجودہ تورات ''اعلان بالفور'' ہے لیکن یاد رکھو، اس عرب بچی کا سہا ہوا دل اور اس کی غم دیدہ ماں کی ڈوبی ہوئی آہ تمہارے سر پر کوہِ طور سے بھی زیادہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہی ہے۔ اس معصوم بچے کی نگاہوں میں غضبناک، قہرناک اور زہرناک بجلیاں تڑپ رہی ہیں۔ اگرچہ آج کل بندر بنانے کا رواج عام نہیں لیکن خدا اپنے وعدے کا سچا ہے۔ تم امریکا اور انگلستان میں ڈھلے ہوئے سونے چاندی کے بچھڑوں کی جس قدر جی چاہے پوجا کر لو، لیکن عذاب کا جو طوق تمہاری گردن میں پڑا ہوا ہے، اس سے تمہیں نجات نہیں مل سکتی۔

(ماخوذ از شہاب نامہ: ص ۵۹۰، ۵۹۳)

دو قبریں ایک سبق

نبّو چاچا اور طوری ماما دو عجیب وغریب کردار تھے۔ ہم آج تک فیصلہ نہ کرسکے کہ ان کی شخصیتیں زیادہ دلچسپ تھیں یا ان کے معمولات زیادہ انوکھے تھے۔ ان دونوں کرداروں کا اپنا اپنا رنگ، مخصوص حلیہ اور منفرد انداز تھا۔ دونوں کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی اور وہ گہرے دوست تھے۔ یوں تو طوری ماما بھی کم نہ تھا لیکن آج کی مجلس میں ہم صرف نبّو چاچا کی بات کریں گے۔ طوری ماما کی بات آگے چل کر۔ نبّو چاچا ۵۰ کے پیٹے میں تھے لیکن ان کی نظر جتنی عقابی تھی، آواز اس سے زیادہ پاٹ دار تھی۔ جب وہ اپنے مخصوص لہجے میں چھوٹے (دکان میں کام کرنے والا لڑکا) کو بلاتا تو اس کی آواز کی کاٹ اور گونج سننے والی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ چھوٹا زخمی ہوگیا، اس کے ٹانکے لگائے گئے تو طوری ماما نے نبّو چاچا کو مشورہ دیا کہ وہ چھوٹے کو زور سے نہ بلائے ورنہ اس کے زخم کے ٹانکے کھل جانے کا اندیشہ ہے۔ نبّو چاچا کی گوشت کی دکان تھی اور وہ پیشے کے لحاظ سے قصاب ہونے کے باوجود اخلاقی اعتبار سے ہماری تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھا جس کی بنیاد اخلاقی روایات کی پاسداری، رکھ رکھاؤ اور وضعداری پر تھی اور جو اَب جینز برگر والے کلچر اور انٹینا وانٹرنیٹ کی لائی ہوئی تہذیب تلے دب کر رہ گئی ہے، لیکن ہم یہاں اس کی اور اس کی تربیت یافتہ بلیوں کی ایک مخصوص عادت کا ذکر کریں گے جس میں معرفت کے کئی اسباق پوشیدہ ہیں۔

یوں تو ہر گوشت کی دکان پر آس پاس آوارہ بلیاں مٹرگشت (گوشت گشت کہنا چاہیے) کرتی رہتی ہیں لیکن نبّو چاچا نے جو بلیاں پالی ہوئی تھیں ان کی بات ہی کچھ اور تھی۔ یہ بلیاں

تعداد میں درجن کے قریب اور رنگ، حجم اور وزن میں ہر قسم کی تھیں لیکن ان میں ایک عجیب وغریب صفت پائی جاتی تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ صرف اس چیز کو منہ لگاتی تھیں جو نبّو چاچا ان کی طرف پھینکتا تھا اس کے علاوہ کوئی ان کو دل جگر کی صاف بوٹی بھی ڈالے تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ نبو چاچا جب کوئی چیز ان کی طرف پھینکتا تو مجال ہے کہ بیک وقت دو بلیاں اس پر جھپٹیں یا آپس میں الجھ جائیں۔ ہرگز نہیں...... ایک بلی اگر کسی بوٹی یا چھیچھڑے کی طرف پاؤں بڑھا چکی ہے تو دوسری ہرگز اُدھر کو نہ جائے گی بلکہ اپنی باری کا انتظار کرے گی۔ بلیوں کو چھیچھڑے، کبوتروں کو دانہ اور چیلوں کو بوٹیاں کھلانے والے تو بہت دیکھے لیکن نبّو چاچا نے ان بلیوں کو استغناء اور ایثار کا جو سبق یاد کرا رکھا تھا وہ ایک منفرد مثال تھی۔ اس دور میں اس کی نظیر تو ایک استاد کے شاگردوں، ایک شیخ کے مریدوں یا ایک جماعت کے کارکنوں میں ملنی بھی مشکل ہے۔ چھیچھڑا خوری کے اس نظم وضبط کے علاوہ ایک اور منظر بھی دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا جب چاچا کام ختم کر کے طوری ماما کے تھلّے پر نشست جماتا تھا۔

نبّو چاچا بڑا سیر چشم اور قناعت پسند قسم کا انسان تھا، اس کی دکان میں اتنا صاف ستھرا اور عمدہ گوشت ملتا تھا اور صفائی کا معیار اتنا اچھا تھا کہ اگر وہ چاہتا تو رات گئے تک دکان کا شٹر گرانے کی نوبت نہ آتی اور اس کا کاروبار اتنا چلتا کہ دوسری دکانوں پر دوپہر کو ہی تالے پڑ جاتے مگر وہ گوشت کی ایک مخصوص مقدار میں بک جانے کے بعد دکان سمیٹ لیتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسے منافع خوری کی ہوس نہ تھی، دوسری بات وہ یہ بیان کرتا تھا کہ پاس پڑوس کے ''چھری بند'' بھائیوں کا بھی حق ہے۔ جب مجھے اللہ پاک میری ضرورت کے بقدر بلکہ زیادہ عنایت فرما دیتے ہیں تو مجھے اپنے ان بھائیوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ایسی اجارہ داری نہ بنانی چاہیے کہ دوسرے قصاب اپنے بیوی بچوں کے گزارے کے لیے بھی ترستے رہ جائیں۔ کبھی کبھار نبّو چاچا جب دیکھتا کہ سامنے والی دکان پر کافی دیر سے گاہک نہیں آیا تو وہ اپنے گاہک کو بلاوجہ ہی سودا دینے سے انکار کر دیتا اور اسے سامنے والی دکان پر بھیج دیتا جہاں گاہک کے انتظار میں چھریاں تیز کی جا رہی یا مکھیاں ماری جا رہی ہوتی تھیں۔ ذرا خود سوچیے! آج کے اس دور

میں قصابوں میں نہیں، علم وادب سے تعلق رکھنے والوں میں ایسی مروت اور وضع داری ڈھونڈنے سے بھی ملتی ہے؟

خیر تو بات یہ ہو رہی تھی کہ نبّو چاچا کی روانگی کا منظر بڑا عجیب ہوتا تھا، وہ ہر شام کو گوشت کی ایک مخصوص مقدار بکتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دیتا تھا۔ جب تک چھوٹا دکان دھوتا اور صفائی کرتا تب تک چاچا نہا دھو کر پاک صاف کپڑے پہن کر طوری ماما کے تھلّے پر پہنچ جاتا اور ان دونوں کا بقیہ وقت اکٹھے گپ شپ کرنے اور بیٹھک جمانے میں گزرتا تھا۔ جب چاچا تیار ہو کر نکلتا تو اس کی درجن بھر بلیاں اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ کوئی قدموں میں لوٹتی، کوئی دائیں بائیں چلتی، کوئی کندھے پر چڑھی ہوتی، کوئی گود میں اٹھکیلیاں کرتی۔ چاچا کی مخصوص چال اور درجن بھر بلیوں کا جلوس عجب سماں باندھتا تھا۔ بلیاں اس پر فدا ہوتیں اور چاچا بلیوں میں مستغرق ہوتا۔ یہ سلسلہ طوری ماما کے وعلیکم السلام کی آواز تک چلتا اور جیسے ہی چاچا طوری ماما کے تھلّے پر نشست جماتا یہ بلیاں اگلے دن چھیچھڑا خوری کے وقت تک رخصت ہو جاتیں اور چاچا کی نشست میں یا کسی اور کے آرام میں کوئی خلل نہ ڈالتیں۔ اخلاقیات کے زوال کے اس زمانے میں اپنے مربی اور محسن سے ایسی وفاداری اور مزاج شناسی، تربیت یافتہ مریدوں میں بھی خال خال ہی دیکھنے میں آتی ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کو توفیق دے تو ان پڑھ نبّو چاچا اور اس کی بے زبان بلیوں کے اس رویے میں وہ کچھ سیکھنے کو موجود ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ انسانوں کی صحبت میں بھی ایسے آدابِ زندگی سیکھنے کو نہیں ملتے۔ بعض قارئین کو اس بات سے تعجب ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ نبّو چاچا کی بلیوں میں وہ خاصیتیں پائی جاتی تھیں جن کی تعریف کی جانی چاہیے۔ انسان سیکھنا چاہے تو جانوروں سے بھی سیکھ سکتا ہے اس کی ایک مثال فقہاء کا وہ تبصرہ ہے جو انہوں نے ''فہد'' نامی شکاری جانور پر کیا ہے۔ (اس لفظ کا ترجمہ بعض لوگ چیتے سے کرتے ہیں جو ٹھیک نہیں، چیتا انسانی تربیت قبول نہیں کرتا۔ اس لفظ کا صحیح معنی ''تیندوا'' ہے۔ یہ بلی اور چیتے کے درمیان کی چیز ہے۔ اس جانور کو شکار کے لیے سدھایا جاتا ہے اور یہ درندوں میں اتنا ہی زبردست شکاری ہے جتنا باز پرندوں میں) فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ یہ جانور ایسی اعلیٰ فطری خصوصیات

کا حامل ہے جن کو انسان بھی اپنائے تو ان کے کردار میں بہترین اوصاف پیدا ہو جائیں۔ فقہ حنفی کی شہرہ آفاق کتاب ردالمحتار المعروف بہ ''فتاویٰ شامیہ'' کی کتاب الصید میں سے ایک پیرا گراف کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''شمس الائمہ سرخسی اپنے استاد شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ ''تیندوے'' میں کچھ ایسی خصلتیں ہیں جو عقلمند آدمی کو اپنانی چاہییں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ شکار پر جھپٹنے کے لیے گھات لگا کر چھپ جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ عقلمند آدمی کو چاہیے کہ اگر کوئی اس کا دشمن ہو جائے تو یہ اس کی مخالفت میں اپنی جان ہلکان نہ کرے بلکہ اس کے دفع شر کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں رہے اور اپنے آپ کو تھکائے بغیر دشمن سے نجات حاصل کرے۔ اس جانور کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس کو دورانِ تربیت اگر کسی غلطی پر سزا دی جائے تو یہ سیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کو سکھانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ کُتّا جب ویسی ہی غلطی کرے تو اس کے سامنے اسے سزا دی جاتی ہے تب یہ بھی وہ حرکت چھوڑ دیتا ہے۔ عقلمند لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ دوسروں سے عبرت پکڑتے ہیں۔ جیسا کہ عرب کی مشہور کہاوت ہے: ''السعید من وعظ بغیرہ'' (نیک بخت آدمی وہ ہے جس کو کسی دوسرے کے ذریعے نصیحت حاصل ہو اور خود اس پر کوئی مصیبت آنے سے پہلے دوسروں پر آئی آفت سے وہ اپنی اصلاح کر لے) اس جانور کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ یہ گندا گوشت نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک سے اچھے اور صاف گوشت کی توقع رکھتا ہے۔ صاحب عقل شخص کو چاہیے کہ ایسی چیز کو منہ نہ لگائے جس کو اس کے رب نے اس پر حرام قرار دیا ہے۔ ایک عادت اس کی یہ بھی ہے کہ یہ ایک شکار پر زیادہ سے زیادہ تین یا پانچ مرتبہ حملہ کرتا ہے۔ اگر پھر بھی وہ اس کے ہاتھ نہ آئے تو یہ اس کا پیچھا نہیں کرتا اور اپنی جان کو بلا وجہ خطرے میں نہیں ڈالتا۔'' (ردالمحتار، کتاب الصید: ج ۶ ص ۴۶۷)

واقعہ یہ ہے کہ وفا شعاری، غیرت و مروت، ایثار و قربانی اور بلند ہمتی و عالی حوصلگی ایسی صفات ہیں کہ اگر جانوروں میں پائی جائیں تو ان کی حیثیت اور اہمیت کو دو چند کر دیتی ہیں اور

اگر انسان ان سے محروم ہو تو وہ جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مادیت پرستی کے اس دور میں ان اعلیٰ انسانی اوصاف کی قدر نہیں لیکن پھر بھی یہ ایسی آفاقی حقیقتیں ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو وہ بیت المقدس کی مغربی دیوار میں موجود دو قبریں دیکھ لے۔ اسے یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔ یہ دونوں قبریں قریب قریب دو حجروں میں واقع ہیں۔ ایک ایسے غریب الدیار شخص کی ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی اور خلافت عثمانیہ کی حمایت کی خاطر بھرپور جدوجہد کی، ہر طرح کی قربانی دی، اپنی خطیبانہ صلاحیتوں کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ یہ شخص دیارِ غیر میں مسافری کی حالت میں فوت ہوا لیکن آج اس کے نام کی طرح اس کی قبر کو بھی جو عزت و احترام حاصل ہے اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ یہ شخص برصغیر کی تحریک آزادی کا مخلص کارکن اور تحریک خلافت کا پرجوش رہنما تھا یعنی مولانا محمد علی جوہر۔

مولانا محمد علی کا انتقال لندن میں اس زمانہ میں ہوا جب وہ پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے گئے تھے۔ جب وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تو ذیابیطس میں مبتلا تھے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں تحریک آزادی کے سلسلے میں یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے سول نافرمانی زوروں پر تھی اور تقریباً ایک لاکھ افراد جیلوں میں محبوس ہو چکے تھے کہ یکا یک ستمبر ۱۹۳۰ء میں وائسرائے ہند نے ۸۶ نمائندوں کو لندن میں ہونے والی انڈین راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (ہندوستانی گول میز کانفرنس) میں شرکت کے لیے مدعو کیا۔ ان میں ۵۷ برطانی ہند، ۱۶ ریاستی ہند اور ۱۳ ہندوستانی سیاسی جماعتوں کے نمائندے تھے جن میں آغا خان، سرتیج بہادر سپرو، سر محمد شفیع، سرسی ستیلواد، نواب چھتاری، مسٹر ایم جیکار، مسٹر سری نواس شاستری، مسٹر سی وائی چنتامنی، ڈاکٹر بے ایل مونجے، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی وغیرہ شامل تھے۔ اس گول میز کانفرنس کا آغاز انگریز وزیراعظم نے قصر سینٹ جان میں ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو کیا۔ یہ گول میز کانفرنس حسب توقع ناکام رہی اور کسی نتیجے پر ختم نہ ہوئی تو وزیراعظم نے یہ کہہ کر سب نمائندوں کو ٹالنا چاہا کہ آپ ہندوستان واپس جائیں، اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کا تصفیہ کریں اور ایک ایسا حل تلاش کریں جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

اس موقع پر مولانا جوہر نے کانفرنس میں وہ معرکۃ الآرا تقریر کی تھی جس میں انہوں نے نہایت صاف گوئی سے اپنے ملک کی سیاسی جماعتوں کو بھی اور حکومت کو بھی کھری کھری باتیں سنائی تھیں اور ان پر آزادانہ نکتہ چینی کی تھی۔ ان کی سب تقریروں میں یہ تقریر ہمیشہ کے لیے یادگار رہے گی جس کے بعد ہندوستان کا یہ غمخوار اور تقریر و تحریر کا شاہسوار ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ اس کے گزر جانے پر نہ صرف انگلستان اور ہندوستان میں اس کے بے شمار مداحوں اور دوستوں کو صدمہ ہوا بلکہ دیگر ممالک میں بھی جہاں جہاں اس کا نام پہنچ چکا تھا اظہار رنج وافسوس ہوا۔ انگلستان میں اس کے جو مسلم و غیر مسلم دوست تھے ان کا اصرار تھا کہ اسے وہیں دفن کیا جائے۔ ہندوستان میں سے اس کے عزیزوں اور دوستوں کے تار گئے کہ اسے وطن مالوف رامپور اور اس کے بزرگوں کے قبرستان میں پیوند خاک کیا جائے، مگر اس کے نصیب میں یہ بات تھی کہ وہ خاکِ پاک بیت المقدس میں آخری نیند سوئے۔ اتفاق یہ ہوا کہ یہ خیال دنیائے اسلام کی ایک ممتاز ہستی اور فلسطین کے مشہور رہنما الحاج مفتی امین الحسینی کے دل میں پیدا ہوا کہ وہ مرحوم کے رشتے داروں کو یہ مشورہ دیں کہ وہ ان کا جنازہ بیت المقدس میں لائیں اور مبارک زمین میں ان کا مزار بنے۔ مفتی صاحب نے اس مضمون کا تار مولانا شوکت علی کو دیا اور انہیں اطلاع دی کہ مسجد اقصیٰ کی چار دیواری کے اندر ایک حجرہ ان کی قبر کے لیے ان کے ایک غائبانہ مداح نے پیش کیا ہے۔ اس اطلاع نے ان سب بحثوں کا خاتمہ کر دیا جو مرحوم کی تدفین کے متعلق ہو رہی تھیں۔ ان کے رشتے دار بھی راضی ہوگئے اور انگلستان والوں کو بھی خاموش ہونا پڑا۔ ان کے جنازہ کو احتیاط کے ساتھ فلسطین پہنچانے کا انتظام ہوگیا اور ان کا جسد خاکی بحری جہاز پر اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ جب ان کا جنازہ پورٹ سعید (مصر) پہنچا تو مصر کے بے شمار مسلمان اس کے استقبال اور اس کے حق میں دعائے خیر کرنے کے لیے موجود تھے اور ان میں سے بہت سے لوگ جنازہ کے ہمراہ بیت المقدس کو روانہ ہوئے۔ جب یہ ساری جماعت القدس پہنچی تو ایک جم غفیر فلسطین کے مسلمانوں کا وہاں شریک جنازہ ہونے کے لیے جمع تھا جس کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر بیان کی جاتی ہے۔

جس حجرے میں مولانا مدفون ہیں وہ ایک مخلص عرب مسلمان کے پاس تھا جس کا تعلق مسجد اقصیٰ سے خادمانہ تھا اور جس کے بزرگوں سے اسے حجرہ ورثہ میں پہنچا تھا۔ اس کے دل میں مولانا محمد علی کی خدماتِ ملّی کی اس درجہ قدر تھی کہ اس نے ان کی وفات کی خبر سن کر مفتی فلسطین الحاج امین الحسینی کی خدمت میں یہ پیشکش کی کہ یہ حجرہ مولانا مرحوم کی آرام گاہ بنایا جائے۔ یہ تجویز جو اس نے اتنی محبت سے کی، فلسطینی مسلمانوں کی اخوتِ اسلامی کی زندہ مثال اور ایثار کی غیر معمولی نشانی ہے کیونکہ ایسی جگہ پر تھوڑی سی زمین بھی بڑے بڑے داموں پر مل نہیں سکتی۔ اس شخص نے کوئی معاوضہ اپنے حجرہ کا نہیں لیا اور اب تک بلا معاوضہ اس کی کلید برداری کا ذمہ دار ہے۔ اس زمانے میں متعدد ہندوستانی زائرین نے بتایا کہ جب اس نے حجرے کا دروازہ کھول کر مزار دکھایا تو زائرین نے چاہا کہ کچھ روپے اس کو بطور نذرانہ پیش کریں مگر اس سیر چشم شخص نے کچھ لینے سے عذر کیا۔

دوسری قبر اس کم نصیب کی ہے جس نے مسلمانوں کو امریکا و برطانیہ کی غلامی میں گرفتار کروایا، خلافتِ عثمانیہ سے غداری کر کے حجاز مقدس کو اس سے جدا کیا اور پھر خود بھی اپنے آقاؤں کی نظر سے گر کر گمنامی کی موت مرا۔ دنیا اسے شریف حسین کے نام سے جانتی ہے اس کی قبر مولانا جوہر کی قبر کے قریب ہے لیکن فلسطینی مسلمان اس کے قریب جانا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں جبکہ مولانا جوہر سے وہ عقیدت و محبت کا سلوک کرتے ہیں حالانکہ شریف حسین ان کا ہم زبان و ہم قوم تھا اور مولانا، ہندوستان کے اجنبی مسافر تھے جن سے ان کا کوئی مادی رشتہ نہیں بنتا لیکن بات وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ انسانی صفات کی ایسی قدر ہے کہ ایسا شخص ظاہراً اپنے مقصد میں کامیاب نہ بھی ہو تو وہ عزت واحترام کا مستحق قرار پاتا ہے اور جو ان سے محروم ہو تو وہ دنیا کے بہت سے کھوٹے سکے جمع کر لینے کے باوجود بے قدر اور بے عزت رہتا ہے۔ شریف حسین نے حکومت کی لالچ میں آکر صرف عربوں سے ہی نہیں ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی بدترین غداری کی۔ اس نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو جو سلطنت عثمانیہ کی مدد لے کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے، گرفتار کر کے انگریزوں کی قید میں دے

دیا۔ اگر یہ ایسی حرکت نہ کرتا اور حضرت الشیخ افغانستان کے مسلمانوں کو ساتھ لے کر عثمانی اسلحے اور ماہرین کی مدد سے ہندوستان پر حملے میں کامیاب ہو جاتے اور ان کے ساتھی ہندوستان کے اندر سے شورش برپا کرتے تو ہندوستان سے نکالنے کے ساتھ سلطنت عثمانیہ کو انگریزوں سے محفوظ کیا جاسکتا تھا، لیکن انگریزوں کے ورغلانے میں آ کر اس شخص نے گھناؤنا کردار ادا کیا اور پھر جب انگریزوں کی نظر میں آل سعود جچ گئے تو انہوں نے اس کو اردن کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا اور یہ شخص اپنے پیچھے اسرائیل کے پڑوس میں حکمرانوں کی ایک غدار نسل چھوڑ کر مر گیا۔ اس کو انگریز سرکار کی ایما پر بیت المقدس میں دفن کی جگہ دلوائی گئی لیکن انگریز اسے وہ عزت کہاں سے دلواتے جو اہل وفا کو نصیب ہوتی ہے۔

بیت المقدس کی مغربی دیوار کے پاس موجود یہ دو قبریں (بندہ کو اس دیوار میں ان قبروں کی صحیح جگہ کا علم کوشش کے باوجود نہ ہوسکا۔[1] اگر کسی صاحب کو معلوم ہو تو آگاہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے گا) مادہ پرستی کی غلاظت میں لتھڑے انسانوں کو پیغام دیتی ہیں کہ حق کو زوال نہیں اور باطل کو قرار نہیں۔ وفا کو فنا نہیں اور دغا کو بقا نہیں۔ جو لوگ نظریے کی خاطر جیتے ہیں موت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور جو سفلی خواہشات پر مرتے ہیں ان کے نام کو جھوٹی زندگی دینے کے لیے جتنی اونچی یادگاریں بنائی جائیں وہ ان کو عزت نہیں دلا سکتیں۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے امیر المؤمنین مُلّا محمد عمر مجاہد تک اور شریف حسین سے میر جعفر تک پھیلی ہوئی داستانیں انسانوں کو وفا و خلوص کی عظمت اور ضمیر فروشی کی ذلت کا راز بتا رہی ہیں۔ وقتی مفاد کی خاطر نظریے اور غیرت کا سودا کرنے والے انسان ان کو سنتے ہیں لیکن عبرت اس وقت تک نہیں لیتے جب تک وہ خود عبرت نہیں بن جاتے۔

---

(۱)......اب اتنا معلوم ہوا ہے کہ ان کی قبر بیت المقدس کی مغربی دیوار کے ساتھ باب القطانین کے باہر مدرسہ خاتونیہ کے سامنے ایک حجرے میں ہے۔ اس حجرے میں مشہور مجاہد، شہید معرکہ قسطل، سید عبدالقادر الحسینی کی قبر بھی ہے جو ۸ اپریل ۱۹۴۸ء کو قسطل کے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔ دیکھیے: بیت المقدس والمسجد الاقصیٰ، محمد حسن: ص ۴۲۹، دار القلم دمشق)

طوری ماما کا راز

نبّو چاچا کا جگری دوست طوری ماما بھی کچھ کم عجیب نہ تھا۔ طوری ماما خالص آفریدی پٹھان تھا۔ گورا چٹا، سرخ وسفید، مضبوط قد کاٹھ اور صحت مند جسامت کا مالک۔ ڈیوٹی سے فارغ ہوکر اس کے دنیا میں تین ہی شغل تھے: اپنے پالتو بٹیر سے کھیلنا، ریڈیو سننا اور نبّو چاچا سے گپ شپ کرنا۔ نبّو چاچا اور اس کی گپ شپ بھی عجیب ہوتی تھی۔ دونوں بولتے اتنے نہ تھے مگر چونکہ مزاجوں میں ہم آہنگی اور موافقت تھی اس لیے دونوں خاموش بیٹھے رہ کر بھی مجلس کا لطف اٹھاتے تھے۔ طوری ماما کا تھڑا ان دونوں کے جمع ہونے سے ایسا سج جاتا تھا کہ خالی ہونے کے باوجود بھرا بھرا لگتا تھا، حالانکہ اس میں مٹکے کے گھڑے، جائے نماز اور نسوار تھوکنے کے ریت بھرے ڈبے کے علاوہ کوئی خاص چیز نہ تھی۔ ماما شکل کی طرح مزاج کے اعتبار سے بھی خالص قسم کا خاندانی پٹھان تھا۔ انتہائی اصول پسند، نازک مزاج، مہمان نواز اور غیرتمند۔ یاروں کا یار اور ان کے لیے سب کچھ لٹا کر یہ سمجھنے والا کہ دوستی کا حق ادا نہ ہوا۔ جب وہ اپنے تھڑے پر بنائی ہوئی مخصوص نشست پر کڑک قسم کی جھاگ اڑاتی چائے کی کیتلی بھر کر بیٹھتا تھا تو اس کی سرمہ لگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بھری بھری مونچھیں اور سینے کے چاروں طرف پھیلی ڈاڑھی عجیب منظر دکھاتی تھی۔ ماما کا بڑھاپا جوانوں کے لیے قابل رشک تھا اور اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ جوانی میں کیا چیز رہا ہوگا۔ اس کا چوڑا چکلا اور بھاری بھرکم جسم بڑھاپے کی زد میں آنے کے بعد بھی اتنا ٹھوس اور اس کی گرفت اتنی جاندار تھی کہ اگر وہ کبھی اٹھنے بیٹھنے اور سہارا لینے کے لیے کسی نوجوان کی کلائی پکڑ لیتا تو اسے ہاتھ کی ہڈی چورا ہوتی محسوس ہوتی۔

ماما کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ پہاڑ جیسا بڑھاپا اکیلا کیوں کاٹ رہا تھا؟ اس راز کی کسی کو خبر نہ تھی، نہ ماما اس بارے میں کبھی لب کھولتا تھا۔ نبّو چاچا کو پتہ ہو تو ہو، لیکن اور کسی کو کچھ علم تھا، نہ ماما سے کچھ پوچھنے کی مجال۔ البتہ نبّو چاچا کا منجھلا لڑکا جو ماما کے لیے کھانا لانے اور برتن اٹھانے پر مامور تھا، بتایا کرتا تھا کہ ماما کا تعلق کسی نہ کسی طرح انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والے مجاہدین سے جڑتا ہے اور اغلب یہ ہے کہ ماما اپنی جوانی کے بالکل ابتدائی دور میں ان سے منسلک رہا ہے اور اس کی یہ جلاوطنی اختیاری اور خود ساختہ نہیں بلکہ یہ اس طویل مشقت اور ریاضت کا حصہ ہے جو انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگیں لڑنے والے مجاہدین کے حصے میں آئیں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ ہم نے اس سے پوچھا۔ کہنے لگا: ایک روز جب محلے کی بڑی سڑک کو شامیانوں سے بند کر کے دھواں دار قسم کا جلسہ ہو رہا تھا تو ایک مقرر نے برصغیر کے جہاد آزادی میں حصہ لینے والے علما اور مجاہدین کے خلاف کچھ فقرے کہے۔ اس وقت میں ماما کو کھانا دینے گیا ہوا تھا۔ ماما کو جلسے جلوسوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اس دن جلسے کا لاؤڈ اسپیکر ''جبری سماع'' کے نظریے کے تحت محلے کے ہر گھر تک آواز پہنچانے کی جستجو کر رہا تھا۔ ماما نے جب مجاہدین آزادی کے خلاف یہ تبصرے سنے تو اس دن وہ پہلی مرتبہ کھل گیا اور اس کی تنہائی کا راز ہمیں معلوم ہو گیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ سرحد کے قبائلی علاقے کے خوش حال گھرانے کا فرد تھا۔ اس کا اپنا باغ، اپنی زمین اور اپنا گھر بار تھا۔ اسکے علاقے کے خان لوگوں نے انگریزوں کو مخبری کر کے اپنی جائیدادوں میں اضافہ کیا لیکن ماما کو یہ طرزِ زندگی پسند نہ تھا۔ اس نے اپنے لیے وہی راہ چنی جو بلند ہمت، اصول پسند اور اولوالعزم لوگ منتخب کرتے ہیں، پھر اس راہ میں سب کچھ لٹا دیا، ماں باپ، گھر بار سے دوری اور جلاوطنی قبول کر لی مگر حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔ دراصل وہ ان لوگوں میں سے تھا جو یاروں کے لیے سب کچھ لٹا کر افسوس نہیں، بلکہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ تو جب دنیوی دوستی میں وہ حدوں سے گزر جانے کا قائل تھا تو اللہ والوں کے ساتھ تعلق ہو جانے کے بعد اسے کسی چیز کا خوف یا رنج کیسے ہو سکتا تھا؟ چاچا کے منجھلے لڑکے کا کہنا تھا کہ وہ تو خیر گزری کہ مقرر صاحب جلد دل کی بھڑاس نکال کر رخصت

ہو گئے، ورنہ اس دن کوئی خرابی والی بات ہو جاتی تھی۔

طوری ماما کے کردار کا یہ پہلو معلوم ہو جانے کے بعد ہمارے دل میں اس کی عزت اور بھی بڑھ گئی۔ وہ واقعی ان لوگوں میں سے تھا جو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ افسوس کہ ہماری قوم نے ان حریت پسندوں کی قدر نہ کی اور طوری ماما جیسے بہت سے لوگ جنہیں قیامِ پاکستان کے بعد اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا جانا چاہیے تھا، گمنامی کی زندگی گزارتے ہوئے کسمپرسی کے عالم میں اس دنیا سے چلے گئے جبکہ بہت سے ٹاؤٹ نسل کے ٹٹ پونجیے جو کسی زمانے میں موچی، تیلی یا ڈوم ہوتے تھے آج وہ عوام کے مستقبل کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان پر حکمرانی کرنے والے ان خاندانوں نے اس انگریز سے وفاداری کی تھی جس نے لاکھوں مسلمانوں کی جان لی، بیسیوں اسلامی ممالک کو تاراج کیا اور جاتے وقت یہاں اپنا تھوکا چاٹنے والے ایسے لوگ چھوڑ گیا جو آج تک اُمّت مسلمہ کے جسم میں ناسور کی طرح سوزش پھیلا رہے ہیں۔ انگریز وہی بدعہد، بدفطرت اور بدخصال قوم ہے جس نے ایشیا میں مغل سلطنت کے خاتمے، ایشیا اور یورپ کے سنگم پر عثمانی سلطنت کے سقوط اور افریقہ کے بہت سے مسلم ممالک کی آزادی سلب کرنے کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں یہودی ریاست کی سرپرستی کر کے عرب ممالک کو نہ ختم ہونے والی بدامنی کا تحفہ دیا۔ اس نے ہر موقع پر یہودیوں کی بیجا حمایت کی اور جب بھی یہودی سلطنت پر برا وقت آیا، یہ اس کے تحفظ کے لیے اس طرح چوکنے ہو گئے جیسے کچرا گھر کا چوکیدار رات کو کھٹکا سن کر کان کھڑے کر لیتا ہے۔

جون ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل کی عرب ممالک سے جنگ ہو رہی تھی دنیا حیران تھی کہ مٹھی بھر یہودیوں میں جان کہاں سے آ گئی کہ وہ اس قدر زور سے لڑ رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ برطانیہ کے دو طیّارہ بردار جہاز فلسطین کے دو سمتوں میں کھڑے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ ایک مالٹا میں تھا اور دوسرا عدن میں اور دونوں ایک منٹ کے نوٹس پر حرکت کے لیے پوری طرح چوکس تھے تاکہ اگر یہودیوں کے غبارے سے ہوا نکلنے لگے تو یہ انہیں سہارا دینے پہنچ جائیں۔ جبکہ یہ وہ دن تھے جب یہودی ریاست کی چوکیداری کا فریضہ برطانیہ سے لے کر

امریکا نے سنبھال لیا تھا اور برطانیہ یہ گند ابوجھ امریکا کے سپرد کر چکا تھا۔ دوسری طرف امریکا کا چھٹا بحری بیڑہ مصر کے ساحل پر پوری طاقت کے ساتھ تیار پوزیشن میں کھڑا تھا تاکہ معاملہ یہودی سورماؤں کے بس سے باہر ہونے لگے تو وہ حق وفاداری نبھاسکیں۔ واضح رہے کہ یہ وہ بحری بیڑہ ہے جس کا تین سال بعد ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان انتظار کرتا رہ گیا مگر وہ آ کر نہ دیا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ امریکا و برطانیہ کو یہود نوازی سے حاصل کیا ہوا؟ کیا یہودیوں کی دولت میں اتنی کشش ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک مکھیوں کی طرح اس پر گرتے ہیں یا ان ممالک کی سیاست، معیشت اور ذرائع ابلاغ پر نادیدہ گرفت انہیں یہود کی غیر مشروط حمایت پر آمادہ کرتی ہے؟ اگر انصاف سے جائزہ لیا جائے تو یہ دونوں عناصر اپنی جگہ وزن رکھتے ہیں مگر یہاں ایک بات اور بھی ہے۔

امریکا اور برطانیہ صلیب کے نمایندے ہیں اور صلیب نے کئی صدیوں تک جنگ کے باوجود جب دیکھا کہ وہ ارضِ مقدس پر قابض نہ ہوسکی تو انہوں نے یہود کی حمایت کا فیصلہ کیا تاکہ یہود کے خناس دماغ اور صلیبیوں کا سڑاندھرا تعصب مل کر مسلمانوں سے انتقام لے سکیں۔ یہ محض اندازہ نہیں، اس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں القدس پر یہودی قبضے کے بعد ''سنڈے ٹائمز'' لندن نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا The Holy War.Jun67 اس میں جنگ کا جو باب ہے اس کا عنوان ہے: Bake After 896 Years یعنی: ''۸۹۶ برس کے بعد واپسی'' اب یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے القدس کو صلیبی قبضے سے چھڑایا گیا تھا، یہودی اس وقت اپنے آنسو پونچھنے کے قابل بھی نہ تھے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ امریکا و برطانیہ کی طرف سے یہودیوں کی حمایت میں پس پردہ مسلم دشمنی اور انتقام کا جذبہ کام کر رہا ہے اور وہ اس لڑائی کو صلیبی جنگوں کا حصہ سمجھتے ہیں لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے دماغ میں دور دور تک اس دیرینہ دشمنی کو بھانپنے کی کوئی فکر نہیں۔ وہ تو اس عطار کی دوائی میں شفا سمجھتے ہیں جس کے سبب بیمار ہوتے ہیں۔ وہ آج بھی ان ممالک کو اپنا حلیف، ہمدرد اور مشکل وقت کا ساتھی سمجھ کر ان کے دارالحکومتوں کے پھیرے لگاتے رہتے ہیں۔

ان کے یہاں طوری ماما جیسے لوگ جنھوں نے اپنی جوانی، گھر بار زمین وجائیداد سب کچھ آزادی کے غاصبوں کے خلاف جہاد میں لٹا دیا، عزت وتکریم کے مستحق نہیں بلکہ وہ تیلی احترام کے قابل ہیں جن کے پسینے سے آج بھی انگریز کی ٹانگوں پر مالش کیے جانے والے تیل کی بو آتی ہے۔

ہمارے وطن عزیز کے اقتدار کے ایوانوں میں سینکڑوں بل پیش اور پاس ہوئے اور بیسوں بل بغیر پیش کیے پاس ہوئے مگر کسی چیز کے بارے میں اگر حکمرانوں کو کھٹکا ہوتا ہے تو وہ ''شرعی نظام عدل بل'' ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جو ملک جس مقصد، دعوے اور نعرے کو لے کر بنا اس میں آج ۵۸ سال بعد بھی اس کے مقصدِ تشکیل کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے کہ اسے پورا کیا جائے یا نہیں؟ اور جواب ملتا ہے کہ نہ صاحب! اس میں بہت سے خدشات، خطرات اور مشکلات ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص صبح سے شام تک نہر کھودے اور جب اس سے سیراب ہونے کا وقت آئے تو یہ بحث چھڑ جائے کہ کہ اس نہر میں صاف شفاف پانی چھوڑا جائے یا گندے پانی کی نالیاں کھول دی جائیں۔ دنیا میں اس وقت جو مملکتیں کسی نظریے کی بنیاد پر بنی ہیں اس میں اس نظریے کی حکمرانی کے علاوہ کسی اور بات کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ مشرقی تیمور میں کیتھولک کے علاوہ کسی اور مذہب، نظریے یا عقدے کی حکمرانی ہوسکتی ہے؟ بھارت میں ہندوازم اور اسرائیل میں صہیونیت کے علاوہ کوئی بات سنی جا سکتی ہے؟ ہر گز نہیں......

مگر ہمارے ہاں یہ بوالعجبی ہے کہ آج تک ہم اس مخمصے میں ہیں کہ اپنے لیے اپنے مذہب کے علاوہ اور کون کون سی چیز پسند اور نافذ کریں۔ اپنا پیارا، جامع مانع اور مکمل نظامِ حیات پر مبنی مذہب ابھی تک ہمارے زیر غور ہی نہیں۔ ہمارے یہی عجیب وغریب رویے ہیں جن کی بنا پر قوم کی عزت بیچنے والے اسپورٹس مین اور نوجوانوں کو تباہ کرنے والے بھانڈ، مسخرے اور بہروپیے؛ ایوارڈ، سرٹیفکیٹ اور نوٹوں میں تولے جاتے ہیں اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے لوگوں کا تماشا بنا کر انہیں ''ریٹائرڈ'' کر دیا جاتا ہے۔ قسما قسم کے دن رنگا رنگ انداز میں منائے جاتے ہیں مگر یوم تکبیر کو یوں گزارا جاتا ہے جیسے اس دن کوئی ناروا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جس قوم کے جینے کا یہ رنگ ڈھنگ ہوا سے فلاح وترقی کیسے نصیب ہوسکتی ہے؟

لُدّ کے دروازے پر

تحقیق کی آڑ میں:

برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) عصرِ حاضر کا مشہور مستشرق ہے۔ مغرب میں اسے علوم اسلامیہ میں سند تسلیم کیا جاتا ہے اور عالمِ اسلام کی نفسیات، احوال اور مستقبلیات کے بارے میں اس کی رائے ''ان'' کے ہاں بہت اہمیت ووقعت رکھتی ہے۔ مستشرق اس عالم کو کہتے ہیں جو مسلمان نہ ہو...... لیکن علوم اسلامی اور مشرقی زبانوں کا مطالعہ اور واقفیت رکھتا ہو۔ یہود نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دنیا میں موجودگی کے دوران یہ طریقہ اختیار کرلیا تھا کہ مسلمان ہونے کا اعلان کردیتے تھے، مسلمانوں جیسا لباس، ان جیسی شکل، ان جیسا نام رکھ لیتے تھے اور کچھ عرصے بعد یہ کہہ کر دینِ اسلام کو چھوڑ دیتے تھے کہ ہمیں اس میں دینِ برحق کی نشانیاں نہیں ملتیں تاکہ عرب کے ان پڑھ اُمّی ان نام نہاد عالموں کے ''بغور مطالعۂ اسلام'' کے نتائج سن کر شک وشبے میں پڑ جائیں لیکن ان کی یہ سازش اس واسطے کامیاب نہ ہوسکی کہ سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگرد تھے جن کے دل کی گہرائیوں میں ہدایت کا نور اُتر چکا تھا اور ایسی عیارانہ حیلہ سازیوں اور دجالی مکروفریب سے خدا کے ان سچے عاشقوں کو ان کے عقیدے اور نظریے سے ذرہ بھر بھی نہ ہٹایا جاسکتا تھا...... لہٰذا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس جماعت جس طرح مشرکین کی طرف سے دی گئی جسمانی تکالیف، جلاوطنی، قتل وغارت اور مال وجان کے ضیاع کے سامنے استقامت کا پہاڑ بن کر ڈٹی رہی، اسی طرح یہود کی ''عالمانہ تحقیق'' (آج کی زبان میں یہود نواز پروفیسروں اور اسکالروں کی سائنٹیفک

اسلامک ریسرچ) بھی ان کی خدا ورسول سے محبت وعقیدت اور دین اسلام سے تمسک واستقامت میں ذرہ بھر اثر نہ ڈال سکی۔

حزب الشیطان کا کردار:

خیر القرون گزرنے کے بعد یہود کے اس طریقہ واردات نے ایک خطرناک شکل اختیار کر لی جس کے لیے ''مستشرقین'' کے گروہ کے گروہ کھڑے کیے گئے۔ انہوں نے دین اسلام کے انہدام اور مسلمانوں کا قرآن وسنت سے ربط توڑنے کے لیے ''تلبیس حق وباطل'' کا حربہ آزمایا اور علوم اسلامیہ کا گہرائی سے مطالعہ کر کے ایسی لایعنی بحثوں اور خالی از فائدہ تحقیقات کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جن میں غوطہ زنی کر کے سر کھپانے والا آج تک کچھ لے کر واپس نہیں آیا۔ یہ شیطانی طریقِ کار انہوں نے عیسائیت پر بھی آزمایا تھا اور عیسائیت اس کی تاب نہ لاتے ہوئے گم شدہ بھیڑوں کی طرح آج تک بھٹک رہی ہے لیکن اسلام چونکہ آخری دین اور قرآن پاک آخری کتاب ہے اس لیے یہود کی یہ ابلیسی جدوجہد مسلمانوں میں چند باطنی فرقے پیدا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی اور اُمت مسلمہ کا سوادِ اعظم ان کی اس فتنہ خیزی سے محفوظ رہا، لیکن جس طرح شیطان بار بار رسوا ہونے کے باوجود اپنے کرتوتوں سے باز نہیں آتا، یہودیت بھی حزب الشیطان کا کردار ادا کرتے ہوئے آج تک یہی حربہ آزماتی جارہی ہے۔ مسلمان معاشروں میں ایسے ڈاکٹروں، اسکالروں اور پروفیسروں کی کمی نہیں جو یورپ وامریکا جا کر ان یہودی مستشرقین سے اسلامی علوم میں کسب کمال کرتے ہیں اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ساتھ حق وباطل کا ایسا ملغوبہ لے کر لوٹتے ہیں جو آج کل کی اصطلاح میں ''ماڈرن اسلام'' کہلاتا ہے جبکہ اس پر ''یہودی اسلام یا اسلامی یہودیت'' کا نام سجتا ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ وہ سلوک کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے عیسائیوں کے ساتھ ''عیسائی یہودیت یا یہودی عیسائیت'' ایجاد کر کے کیا۔ سر سید، ڈپٹی نذیر احمد، غلام احمد قادیانی، غلام احمد پرویز، محمد عبدہ، طٰہٰ حسین، ضیاء گوک الپ، عبداللہ چکڑالوی، نیاز فتح پوری، گوہر شاہی، بابر چودھری، فرحت ہاشمی اور شیخ محمد انہی کوششوں کا شاہکار ہیں اور اب تو خیر سے اس فوج ظفر موج میں یہودی استادوں کی شاگرد خواتین بھی شامل

ہونا شروع ہوگئی ہیں جو اسلام کی سب سے بڑی خدمت اس کو سمجھتی ہیں کہ کسی طرح پاکستان میں ''خواتین کی پہلی مسجد'' تعمیر کرلی جائے جو اسلام کی تاریخ کا انوکھا حادثہ ہوگا۔

ایک خطرناک مرض:

چونکہ یہودیوں کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے متعلق تمام باتوں حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی بظاہر غیر اہم نظر آنے والی جزئیات سے پوری طرح واقفیت حاصل کرتے ہیں پھر اپنی جملہ قوت کو مجتمع کر کے معرکے میں جھونکتے ہیں اس لیے برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) جیسے اسلامیات اور علوم شرقیہ کے ماہرین کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام اور عالمِ اسلام کا بے حد گہرائی سے مطالعہ کریں اور ضرورت پڑنے پر اپنے منصوبہ سازوں کی بروقت اور درست رہنمائی کریں جیسا کہ انہوں نے اس سے قبل عیسائیوں کے خلاف معرکہ آرائی کے وقت یورپ اور اس کی نفسیات سے متعلق تمام جزئیات سے آگاہی حاصل کر کے اسے تہس نہس کرڈالا لہٰذا آج کا یورپ دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں کو تو پالتا ہے لیکن خود اپنی معیشت، سیاست اور سماج سے اس نے عیسائیت کو دیس نکالا دے دیا ہے۔ ہمارے ہاں کے مدبر اور دانشور حضرات کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ مغرب کی نفسیات کا بغور مشاہدہ کر کے ان کی جزئیات کو اہل اسلام تک منتقل کرنے سے زیادہ اس بات پر توجہ دیتے ہیں کہ عالمِ اسلام کی باریک سے باریک بات کو مغربی زبانوں میں منتقل کر کے ان مستشرقین کا کام آسان کردیں جو میدان میں اترنے سے پہلے اس کے نشیب وفراز سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عادت دراصل اس مرض کا حصہ ہے جو مسلمانوں کی اکثریت کو اس وقت لاحق ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنی زندگی بدلیں، دوسروں کی اصلاح چاہتے ہیں۔ ہم میں کا ہر فرد پورے اخلاص اور خیر خواہی سے دوسرے مسلمانوں کو راہِ راست پر دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسروں کے پڑھنے کے لیے اذکار اور مناجات کے مجموعے چھاپتا ہے، غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی سوچتا ہے، ان تک اسلام کے اچھے پہلو پہنچانا چاہتا ہے جبکہ خود اس بات کا خواہش مند ہے کہ جتنی جوانی، دولت اور فرصت تفریحات میں لگ جائے، غنیمت ہے۔ اپنے اوقات کی حفاظت، اپنے عیوب کو بے جگری سے ٹٹولنا اور دل کڑا کر کے ان کے ازالے پر محنت کرنا اور اگر کوئی عیب کی نشاندہی کرے تو اس کا شکر گزار ہونا ہمارے اسلاف کا وہ وصف تھا جس نے انہیں اوجِ کمال تک پہنچایا تھا۔ ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس بات کا منتظر ہے کہ دوسرے مسلمان صحیح ہوجائیں اور اسلام کو دوبارہ غالب کردیں اور

خود وہ کان ڈھانپ کر من موجیوں میں غرق رہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے معرکہ کارزار کی گرمی کے وقت آگے بڑھ کر قربانی دینے کی بجائے ہر شخص یہ سوچے کہ ساتھ والے مورچے کے ساتھی کچھ کر دکھائیں گے، ہمارا تو یہاں موجود رہنا ہی کافی ہے..... اس سے کیا نتیجہ نکلے گا.....؟ ویسا ہی جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں اور جس سے چیخ و پکار کی فضا تو قائم رہ سکتی ہے مگر قوموں کی تقدیر بدلی نہیں جاسکتی۔

پانچویں حصے کا خطرہ:

بات برنارڈ لیوس کی ہو رہی تھی۔ اس نے پچھلی صدی کی آخری دہائی میں جو بیسویں صدی کی طوفان خیز دہائی کہلاتی ہے، ۲/مئی ۱۹۹۰ء کو این برگ انسٹیٹیوٹ فلاڈلفیا میں لیکچر دیتے ہوئے مغرب کو آگاہ کیا: ''دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ مغرب اور بطور خاص امریکا اور مغربی نظام کا دشمن ہے۔'' لیکچر میں پیش کیے گئے اعداد و شمار اور دیگر بحثیں اسی ایک جملے کی تشریح تھے۔ پانچویں حصے سے مراد مسلمان تھے اور مغرب کے ساتھ ان کی دشمنی ثابت کرنے سے اس یہودی عالم کا مقصد یہ تھا کہ مغرب کی زندگی کی ضمانت اس بات میں ہے کہ اس پانچویں حصے کو پوری طرح کچل ڈالے اور ان کی قوتوں کے مراکز پر براہِ راست تسلط حاصل کر لے۔ خصوصاً وسائل، ذرائع پیداوار، تجارت، بحری و فضائی گزرگاہوں، ذرائع ابلاغ و ترسیل اور بالخصوص سیاست و معیشت کو پوری طرح اپنے قبضے اور اختیار میں لے لے۔ اس طرح کے زہریلے خیالات کا اظہار اس نے چند ماہ بعد اسٹین فورڈ یونیورسٹی پاؤلو آلٹو میں ایک لیکچر کے دوران دوبارہ کیا۔ اس مشہور یہودی دانشور کی طرف سے مغرب کے سامنے واویلا کرنے اور اس کو ابھارنے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اس وقت ملت اسلامیہ کے علاوہ یہود کا کوئی حریف نہیں۔ وہ ساری دنیا کے عقائد و نظریات اور اخلاقیات و روایات کو روند کر یونی پولر سسٹم (یک قطبی نظام) کو متعارف کروا چکے ہیں، جو دجّال کے دعوائے خدائی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ سوائے مسلمانوں کے دنیا کی آبادی کی اکثریت کو اپنے پیٹ اور شرمگاہوں کے تقاضوں کی تکمیل سے آگے کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جینے کی فکر نہیں۔ یورپ کے عوام کی اکثریت ہفتے کے پانچ دن زیادہ سے زیادہ کمانے اور دو دن اسے بہتر سے بہتر مزے میں اُڑانے سے

آ گے کی کوئی بلند سوچ نہیں رکھتی ۔ یہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت ہے جو خود کو اور ساری دنیا کو ربانی نظام کی برکتوں سے فیضیاب کرنے اور ابلیس کی پیروکاری اور ہلاکت سے بچانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ دجّال کی عالمی حکومت کے قیام کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے اگر اس کرۂ ارض پر کوئی خطرہ ہے تو وہ اُمّت مسلمہ ہے۔

دوخبریں، سنگین حقائق:

مسلمانوں کے سوا دنیا کی تمام قوتوں کی قسمت میں صہیونی استعمار کی حاشیہ برداری کے سوا کچھ نہیں۔ اس طاغوت سے پنجہ آزمائی کی ہمت اور ضروری شرائط مسلمانوں بالخصوص جوہری طاقت اور دو عشروں سے زیادہ عملی جہاد کا تجربہ رکھنے والی پاکستانی قوم کے علاوہ کسی اور قوم میں نہیں پائی جاتیں۔ اس لیے روئے زمین پر ابلیسی قوتوں کے سب سے بڑے مرکز اسرائیل کو کوئی اور ملک تسلیم کرے یا نہ کرے، اسے مسلمان ملکوں سے خصوصاً پاکستان سے تسلیم کروانا دجّال کے کفریہ طاغوتی نظام کے علمبرداروں کی اشد ضرورت ہے۔ یہود کے ذہین دماغ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ عالمِ اسلام پر سیاسی، عسکری اور اخلاقی حملوں میں پورا زور خرچ کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی اپنے مرکز (اللہ، رسول، قرآن وسنت اور حرم مکی ونبوی) سے وابستگی حسب توقع کمزور نہیں ہوسکی بلکہ ان میں بے چینی اور بہتری کی تلاش وطلب بڑھتی ہی چلی جارہی ہے اس لیے وقت یہود کے ہاتھ سے نکلا چلا جارہا ہے اور یہ خطرہ پیدا ہورہا ہے کہ اگر نئے عالمی طاغوتی نظام کو جو دراصل دجّالی حکومت کا پیش خیمہ ہے، فوری طور پر پوری قوت سے نافذ نہ کیا گیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ ممکن ہے کہ بعض قارئین کو یہ سب باتیں فرضی یا مبالغہ آمیز معلوم ہوں لیکن اگر وہ درج ذیل دو خبروں پر نظر ڈال لیں تو انہیں حقائق کی سنگینی کا کسی قدر احساس ہوجائے گا۔

(۱) بحیرۂ عرب کے ساحل پر واقع بلوچستان کے علاقے جیوانی میں (جو دنیا کی اہم ترین بحری گزرگاہ کے منہ پر واقع ہے) جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا امریکی بحریہ اور فضائیہ کا اڈا تعمیر کیا جارہا ہے جس سے علاقے میں جہاز رانی، تیل کی ترسیل اور تجارت کو کنٹرول کیا جائے گا اور پھر وسط ایشیا تک باآسانی رسائی کا ذریعہ بننے والا یہ اہم حصہ عملاً بلوچستان سے الگ کرلیا

جائے گا۔ (خبر میں یہ وضاحت نہیں کہ بلوچستان سے عملاً الگ ہونے کے بعد...... نہر سوئز کے بعد...... دنیا کا یہ اہم ترین جغرافیائی حصہ کس کے ساتھ ہوگا؟)

(۴) وزارت خزانہ اور اسٹیٹ بینک نے مبینہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر امریکی بینکوں میں رکھے جائیں گے۔

آپ خود فرمایئے! اُمت مسلمہ کا اہم ترین رکن، جوہری اسلامی طاقت کا حامل اور جذبۂ جہاد کی لازوال طاقت رکھنے والا ملک جس پر ساری اسلامی دنیا کی نمایندگی، ترجمانی اور سرپرستی کی اہم ذمہ داری ہے، وہ سیاسی اور معاشی طور پر خود کو یوں خدا اور انسانیت کے دشمنوں کے ہاتھ ثمن قلیل کے عوض (بلکہ اب تو ثمن قلیل بھی نہیں رہا) گروی رکھ دے اور جس شیطانی طاقت کے مقابلہ کرنے کا منصب اسے سونپا گیا تھا اسے تسلیم کرنے کی تیاریاں شروع کر دے، غمزدہ مسلمانوں کے آنسو پونچھنے، ان کا حوصلہ بڑھانے اور ان کا انتقام لینے کی بجائے عراق میں دجّالی ریاست کے پھیلاؤ کے لیے برسرپیکار امریکی فوجیوں کو ذلت آمیز شکست سے بچانے کے لیے ان کی مدد کو جانا قبول کرلے، اسے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور مستجاب الدعوات نیک بندوں کی نظر سے گرنے سے کون روک سکتا ہے......؟ پر ایسا لگتا ہے کہ ہم نے تہیہ کر رکھا ہے کہ نہ اپنی کارکردگی پر نظر ثانی کریں گے نہ اپنا احتساب کریں گے، نہ خود کو نجات اور ترقی کی راہ پر لائیں گے بلکہ طرح طرح کے حیلوں سے اپنی بے راہ روی، جمود اور تعطل کو سند جواز فراہم کرتے رہیں گے۔

قیام کے وقت سجدہ:

خلافت عثمانیہ اور مغلیہ سلطنت کے سقوط کے بعد اُمّت مسلمہ کی بدقسمتی رہی ہے کہ جب قیام کا وقت آیا وہ سجدے میں گر پڑی۔ قیام پاکستان کے وقت اگر مسلمان ہمت کر کے سری نگر ایئرپورٹ تک پہنچ جاتے تو آج کشمیر جنت نظیر کو بنیے کی کالی زبان اپنا اٹوٹ انگ کہنے کی جرأت نہ کر سکتی۔ اس کے بعد ۱۹۴۸ء، پھر ۱۹۶۵ء اور پھر ۱۹۹۹ء میں اکھنور اور کارگل میں ایسے مواقع آئے کہ دشمن کی دکھتی رگ انگوٹھے تلے آگئی تھی مگر عین اس وقت ہمارا انگوٹھا خود دکھنے لگ گیا۔ آج پھر پاکستان کو خدا نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ وہ اُمّت مسلمہ کا دل، دماغ اور دست و بازو ہے۔ اگر یہ ایمان وعزم اور ہمت وحوصلہ سے کام لے تو اسے تاریخ عالم میں سنہرا اور ناقابل فراموش مقام مل سکتا ہے لیکن یہ اُمّت محمدیہ

کے اس دشمن کے سامنے جس سے ٹکراؤ ناگزیر ہے، سینہ تاننے کی بجائے اسے سینہ سے لگانے کی فکر میں ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت جس ملت دشمن فرقے نے کشمیر گنوا کر مسلمانوں کا راستہ کھوٹا کیا آج وہی اسرائیل کو تسلیم کروانے کے لیے سرگرم ہے۔ کشمیر لینے کے لیے پیش قدمی کرنے والی مجاہدین کی جماعت کو قادیانی فرقے کا ایک شخص جنگلوں میں اس وقت تک بھٹکاتا رہا جب تک بھارت کی چھاتہ بردار فوج سرینگر ایئرپورٹ پر نہیں اتر گئی۔ آج فلسطینی مسلمانوں کے قاتل اور پوری دنیا میں مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور پاکستان کے خلاف تباہ کن سازشوں کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دینے کی کوشش کرنے والے اسرائیل کو نیا قادیانی سربراہ مرزا مسرور احمد تسلیم کروانے کے مشن پر نکلا ہوا ہے۔ یہود کے عالمی قائد دجّال کو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام "لُدّ" شہر کے دروازے (کسی شہر کا ایئرپورٹ اس کا دروازہ ہوتا ہے) پر قتل کریں گے (لُدّ اسرائیلی دارالحکومت کے مضافات میں ہے اور وہاں آج کل اسرائیل کا بین الاقوامی ایئرپورٹ "بن گوریان انٹرنیشنل ایئرپورٹ" ہے) حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات کا انکار کرنے اور ہر موقع پر یہود کا ایجنٹ بن کر پاکستان اور اُمّت مسلمہ کے مفاد کو نقصان پہنچانے والے اس مرتد فرقے کا انجام بھی لگتا ہے کہ یہود سے زیادہ بدتر ہوگا کیونکہ یہ ان دو فرقوں میں سے ہے جن کو صہیونی دماغوں نے مخصوص مقاصد کے تحت اسرائیل میں بسنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ چناب نگر میں ریاست کے اندر ریاست قائم کر کے یہودی آقاؤں کی خوشنودی ڈھونڈنے والو! جس کے ساتھ جیو گے حشر بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہود پہلے خود ساری دنیا سے سمٹ کر ارضِ فلسطین میں جمع ہوئے پھر اپنے ساتھ مشہور یہود نواز فرقوں (بہائی اور قادیانی) کو بھی ریاست دجّال کے پایہ تخت میں مرکز بنا کر دیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ کرۂ ارض سے مردود انسانوں کے صفایا کے لیے اُلٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ دیکھیے! ہاتفِ غیبی کس رفتار سے ان ہندسوں کو گن کر پورا کرتا ہے؟

کاسابلانکا سے اسرائیلی پارلیمنٹ تک

محبوب شریکِ کار:

مقصد کی ہم آہنگی کبھی کبھی تاریخی دشمنوں کو بھی یکجا کر دیتی ہے۔ اس کی بڑی مثال آج کی عیسائی دنیا کا اپنے قدیم ترین دشمن یہود کے ساتھ وہ اتفاق واتحاد ہے جو اسرائیل کے استحکام اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ گزشتہ دو ہزار سال سے عیسائیوں کے ہاں دنیا کی مبغوض ترین قوم یہود تھی مگر اب وہ اسے ''محبوب شریکِ کار'' (Philo Esmitism) کا نام دیتے ہیں۔ یہ نفرت محبت میں اور یہ دشمنی شرکت کار میں کیسے تبدیل ہوئی؟ اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے۔ یہ تبدیلی کسی احساسِ جرم کے تحت نہیں ہے کہ ماضی میں عیسائیوں نے یہود کو میراثی کے ڈھول کی طرح پیٹا اور نہ اس لیے کہ یہود کا مختلف مواقع پر بڑی تباہی اور قتلِ عام (Holocaust) ہوا بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جس کا سمجھنا آج کے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر مغرب کے مسلم کش اقدامات اور اسلام دشمنی پر مبنی نفسیات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

دنیا پرست پیشوائیت:

یہود کے لیے افراد کی قلت ہمیشہ سے مسئلہ رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کے ہاں اولادِ نرینہ کا کم پیدا ہونا ہے۔ (اس وقت دنیا میں نرینہ بچوں کی سب سے کم شرح پیدائش یہود میں اور سب سے زیادہ فلسطینی مسلمانوں میں ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ کی کھلی نشانی ہے) دوسری وجہ یہودیوں پر وقتاً فوقتاً عذاب کا نازل ہوتے رہنا ہے جس میں ان کے اچھے دماغ اور

صحت مند جسم ختم ہو جاتے ہیں اور تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ کسی انسان کا یہودیت میں داخلہ قبول نہیں کرتے۔ یہودیت دنیا کے ان دو مذاہب میں سے ایک ہے جس کا مدار روحانیت اور پاکیزگی پر نہیں بلکہ نسل پرستی اور تعصب پر ہے۔ یہ دو مذاہب اپنی تعلیمات کو انسان کی نجات کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، لیکن ایک مخصوص نسلی گروہ کے علاوہ دوسرے انسانوں کو اس سے فیضیاب نہیں ہونے دیتے کیونکہ وہ بقیہ سب انسانوں کو جانور، اچھوت اور نجات کے لیے ناقابل سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم ان مذاہب کے بانیوں کی نہیں ہوسکتی، یہ تو بعد کے دنیا پرست پیشواؤں کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں اور یہ جاہل پیشوائیت یہود اور برہمن دونوں میں وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ تو بات یہ ہو رہی تھی کہ یہود کے لیے قلتِ تعداد بڑا مسئلہ رہا ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے یہ ہمیشہ کسی نہ کسی کندھے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ قرآن کریم نے سورہ حشر میں بزدلی اور عیاری پر مشتمل ان کی اس نفسیات کو انتہائی خوبی اور بلاغت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ اپنی اس عادت کے پیش نظر عیسائیت کے ہاتھوں صدیوں تک مار کھانے اور ذلت سہنے کے بعد انہوں نے اس پر ایسی چوٹ لگانے کا ارادہ کیا جو اس کی جڑوں کو ہلا دے اور اس میں ایسے فرقے پیدا کر دے جو یہود کے ہمنوا ہوں۔ یہ ایسا خطرناک انتقام تھا جس کے سامنے عیسائی پیشوائیت رُل کے رہ گئی اور اب ہم جسے عیسائی دنیا کے نام سے پکارتے ہیں وہ درحقیقت یہود کی روندی ہوئی دنیا ہے۔

احتجاج کا جرثومہ:

یہود نے پہلا کام یہ کیا کہ انہوں نے عیسائیوں کے ایک طبقے میں ''احتجاج'' کا مرض پیدا کر دیا یعنی کسی بھی قائم اور موجود صورت، کیفیت، عقیدہ ونظریہ اور ادارہ، تنظیم وثقافت کے خلاف قولی وعملی احتجاج اور اس سے علیحدگی ..... جب یہ مزاج پختہ ہو جاتا ہے تو بعد میں جب نیا عقیدہ اور نظریہ کی صورت وکیفیت وغیرہ قائم اور موجود ہو جائے تو اس کے خلاف بھی قولی وعملی احتجاج خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔ احتجاج کا یہ جرثومہ کسی منزل پر اپنا کام نہیں چھوڑتا لہٰذا پروٹسٹنٹ نام کے جو عیسائی سولہویں صدی میں احتجاج کرتے ہوئے عیسائیت کے مرکز، رومن کیتھولک چرچ سے علیحدہ ہو گئے تھے، اب تک خود احتجاج در احتجاج کے عمل کے

نتیجے میں درجنوں ذیلی طبقات میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ پروٹسٹنٹ نامی اس فرقے کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا اتفاق صرف اس بات پر ہے کہ عقیدہ ہو یا ثقافت، جب کوئی بات موجود اور رائج ہو جائے تو ان کا اس پر اتفاق نہیں رہتا البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو ان کے تمام گروہوں میں مشترک و متفق ہے اور وہ ہے یہودیت، اس کے صحائف اور اس کے عزائم، اس کی رسوم اور مقاصد حتیٰ کہ یہودی جذبات کی حمایت و مدافعت اور ان کی مخالفت کو خدا اور اس کے تلوینی مقاصد کی مخالفت سمجھنا۔ امریکا میں اس فرقے کی اکثریت ہے۔

پوپ صاحب سے ایک سوال:

مذہبی روایات اور رسوم کے خلاف احتجاج کے بعد دوسرا نظریہ پیش کیا گیا کہ کلیسا اور پادری کی ضرورت نہیں ہے، کتابِ مقدس کا خود مطالعہ کرنا چاہیے۔ اللہ اور بندے کے درمیان کسی دوسرے بندے کو واسطہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ہر شخص کو خود تحقیق کر کے قرآن و حدیث..........اوہ! معاف کیجیے گا! خداوند کا مقدس کلام سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب یہ نظریہ چل پڑا تو عیسائیوں کے ایک ذہین فرد اسکوفیلڈ کو خرید کر اس سے بائبل کی نئی شرح لکھوا کر اس کی بڑے پیمانے پر اشاعت کروائی گئی۔ یہ تقریباً ایسی ہی صورت حال تھی جیسے کہ کچھ عرصہ قبل قرآن مجید مترجم کے نام سے بغیر عربی متن کے صرف ترجمہ چھاپ کر کثیر تعداد میں پاکستان بھر میں تقسیم کیا گیا تھا تا کہ "مطالعۂ قرآن تحریک" فروغ پا سکے۔ وہ تو خدا کا کرم ہوا کہ علمائے کرام کی بروقت گرفت کے سبب یہ فتنہ تھم گیا ورنہ اگر ہر جدت پسند مفسر اپنا مجرد ترجمہ و تفسیر چھاپنا شروع کر دیتا تو نوبت جانے کہاں تک پہنچتی) اس شرح میں جا بجا یہودی عقائد داخل کر دیے گئے تھے۔ اب ہوا یوں کہ قدیم متن مشکل اور جدید حاشیہ آسان تھا، لہٰذا مشکل متن کی بجائے آسان حاشیے کا رواج ہوا اور اس نئی بائبل کے ذریعے یہودی عقائد عیسائیوں میں پھیلتے چلے گئے۔ متعصب عیسائی پادریوں کے دلوں میں بھی یہود کی قربت اور ہمدردی پیدا ہوتی گئی، حتیٰ کہ قدیم عیسائیت سے روگردانی، آزاد خیالی اور عیسائی اکابر کی تعلیمات کی تقلید کی بجائے من مانی تشریحات ماننے کے نتیجے میں ۱۲۷ اکتوبر ۱۹۶۵ء کا حادثہ پیش آیا۔ یہ وہ دن تھا جب رومن کیتھولک عیسائیت جو اصل بنیاد پرست عیسائیت تھی، بھی یہودیت کے آگے ڈھیر

ہوگئی اور ویٹی کن ثانی کے ایک حکم نامے Nostra Nation کے تحت عیسائیت کے ایک بنیادی عقیدے اور عبادت کو یکسر ختم کر دیا گیا۔ اس سے پہلے پوری عیسائی دنیا کا متفقہ عقیدہ تھا کہ یہود (نعوذ باللہ) خدا (یعنی حضرت مسیح علیہ السلام) کی قاتل قوم (Diecide Nation) ہے۔ لہٰذا یہودیوں پر لعنت بھیجنا ان کی عبادت کا اہم ترین جز تھا۔ یہ عقیدہ اور عبادت قدیم عیسائیوں یعنی رومن کیتھولک چرچ میں باقی رہ گئی تھی مگر پوپ کے ایک حکم سے یہ بھی موقوف ہوگئی اور جمعہ حزنیہ یا عید فصح (Good Friday) کے نام سے کی جانے والی وہ مخصوص اور اہم ترین عبادت جو انیس صدیوں سے عیسائیت کے لوازمات میں سے تھی اور اس میں یہودیوں پر علانیہ طور پر لعنت بھیجی جاتی تھی، ختم کر دی گئی اور انہیں قتلِ مسیح کے جرم سے بری الذمہ قرار دے دیا گیا۔ اس موقع پر ہم جناب پوپ سے یہ تو نہیں پوچھتے کہ کسی عقیدے یا عبادت کو موقوف کرنے کا حق انہیں یا کسی اور انسان کو حاصل ہے یا نہیں؟ لیکن ان سے یہ سوال کرنے میں پوری دنیا حق بجانب ہے کہ وہ کسی تاریخی حقیقت کو کیسے بدل سکتے ہیں؟ جب یہ بات انسانی تاریخ کی متفقہ اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہود نے سچے مسیح سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناقابلِ بیان اذیتیں دی تھیں، ان کو نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ ولد الحرام کہا، ان کے قتل کا فتویٰ جاری کیا، انہیں کانٹوں کا تاج پہنا کر پھانسی کا جلوس نکالا، راستے میں بے حد وحساب گستاخیاں کیں، مسیحی عقیدے کے مطابق انہیں ہاتھ پاؤں میں سات سات انچ کی لمبی کیلیں ٹھونک کر سولی پر چڑھا دیا۔ حضرت یسوع المسیح علیہ السلام کا یہودیوں کے ہاتھوں صلیب دیا جانا عیسائیوں کا ایسا عقیدہ ہے جو ان کی پہچان اور ایمان ویقین کا ایسا جز ولاینفک ہے کہ صلیب کے بغیر عیسائیت کا تصور کوئی معنیٰ نہیں رکھتا.......... حتیٰ کہ چاروں بائبل میں اس کا ذکر ہے.......... اس تاریخی حقیقت کو پوپ صاحب یا کوئی دوسرا شخص کیسے بدل سکتا ہے؟

اسرائیلی مولویوں کی کھیپ:

اب تک تو معاملہ بائبل کی تشریح کی حد تک تھا۔ اگلا قدم اس سے بھی خطرناک اٹھایا گیا، مارٹن لوتھر سے پہلے کتابِ مقدس صرف انجیل پر مشتمل ہوتی تھی، اس نے تورات کو بھی اس کا حصہ بنایا۔ اس کی تحریک سے عیسائی تورات کی عصمت وصداقت پر ایمان لائے، اسے دل

سے وحی تسلیم کر کے اس سے براہِ راست رجوع کرنے لگے، اور اسے ''قدیم عہد نامہ'' کے نام سے کتاب مقدس بائبل کا حصہ بنا لیا گیا، انجیل کو ''نیا عہد نامہ'' کی خوبصورت اصطلاح دی گئی۔ (ہمارے ہاں بھی عیسائی مشنریوں کو آپ دیکھتے ہوں گے کہ خدا کا مقدس کلام پڑھنے کی دعوت اس عنوان سے دیتی ہیں کہ مطالعہ تو ہر مذہب کا کرنا چاہیے) تورات اور بالخصوص اس کے محرّف اور تبدیل شدہ حصوں کے مطالعوں سے عیسائی دنیا میں نئے مذہبی رجحانات کی لہر چلی اور وہ رفتہ رفتہ اس امر کے قائل ہوتے چلے گئے کہ فلسطین یہودیوں کی سرزمین ہے اور اسرائیل کا قیام بائبل کی پیش گوئیوں کی تکمیل ہے، اسرائیل پر تنقید گویا بائبل کی تکذیب اور خدا پر حرف گیری کے مترادف ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان بائبل سوسائٹی کچھ عرصے سے کتابِ مقدس کا جو نسخہ چھاپ رہی ہے اس کے آخر میں ہیکل سلیمانی کا خیالی ماڈل بھی چھاپا جا رہا ہے (اب تو پاکستان میں بھی اسرائیلی مولویوں کی ایک کھیپ پیدا ہوگئی ہے جو یہودی ربّیوں سے انٹرنیٹ پر گفتگو کا شرف حاصل کرنے کے بعد اس موضوع پر یہودی اسکالروں کے لکھے گئے مقالے اپنی طرف منسوب کر کے شائع کر رہی ہے کہ ''مسجد اقصیٰ پر یہود کا حق ہے'' بلکہ اب تو مسجدِ اقصیٰ کے لفظ کا تکلف بھی ختم کر دیا گیا ہے، اب تو وہ صاف صاف ہینک رہے ہیں کہ ''احاطہ ہیکل'' کی تولیت یہود کو ملنی چاہیے) یہ نظریہ رفتہ رفتہ اتنا پختہ ہوگیا کہ عیسائی خصوصاً امریکا و برطانیہ کے عیسائیوں میں یہود کے لیے ''محبت'' بلکہ ممنونیت اور تشکر کے جذبات پیدا ہوتے گئے کیونکہ ان کے خیال میں یہود دنیا بھر سے اسرائیل میں جمع ہو کر وہ کچھ کرتے جا رہے ہیں جو خود عیسائیوں سے نہ ہو سکا یعنی اس جگہ سے مسلمانوں کا انخلاء ایک غیر مسلم ریاست کا قیام جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ ظہور ہوگا۔ چنانچہ یہ عیسائی اگرچہ یہود اور یہودیت کے لیے حقارت آمیز خیالات رکھتے ہیں لیکن یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ ''خدا امریکا پر محض اس لیے مہربان ہے کہ امریکا یہودیوں پر مہربان ہے۔'' اس نظریے کی بنیاد تورات کا یہ عہد ہے جس کی تعلیم بائبل کے ہر طالب علم کو دی جاتی ہے: ''اور (اے اسرائیل!) جو تجھے برکت دے میں اسے برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت بھیجے میں اس پر لعنت بھیجوں گا۔'' امریکا میں صہیونیوں کا سب سے بڑا عیسائی وکیل جیری فال ویل اپنے وعظوں میں کہتا پھرتا ہے: ''دینی لحاظ سے ہر عیسائی کو چاہیے کہ

اسرائیل کی حمایت کرے، اگر ہم اسرائیل کو تحفظ دینے میں ناکام رہے تو ہم خدا کے آگے اپنی اہمیت کھودیں گے۔'' ان کے خیال میں سارے عرب ''مسیح دشمن'' (AntichRist) ہیں اس لیے ان کو نہ صرف یروشلم (بیت المقدس) بلکہ مشرق وسطیٰ کے بیشتر خطوں سے نیست و نابود کر دینا چاہیے کیونکہ خدا نے یہودیوں سے جو وعدے کیے ہیں، یہ ان کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ''بیشتر خطوں'' کے لفظ پر شاید قارئین نے غور نہ کیا ہوگا۔ اس سے مراد عراق، اُردن، شام، لبنان اور سعودی عرب کا مدینہ منورہ تک کا حصہ ہے جیسا کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کی اندر کی دیوار پر ثبت نقشہ میں دکھایا گیا ہے۔

خون آشام چمگادڑیں:

دیکھا آپ نے یہودیت کا دجّالی کمال! ''مسیح دشمن'' وہ خود تھے لیکن عیسائیوں کی اکثریت کو انہوں نے یہ باور کروادیا ہے کہ ''مسیح دشمن'' مسلمان ہیں لہٰذا اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنی تاریخی دشمنی بھلا کر ایک بات پر اتفاق کرلیا ہے کہ مسلمانوں کو کسی طرح ختم کرو یا محکوم بناؤ، آپس کے جھگڑے ہم مسیح کی آمد کے بعد نمٹالیں گے۔ انہوں نے اگر عیسائیت کو برحق کہا تو فبہا اور اگر یہودیت کو دنیا پر غالب کیا تو بھی سرِ تسلیم خم۔ آج کل امریکی اور برطانوی عیسائیوں کی اکثریت اس ذہنیت کی حامل ہے اور یہ خطرناک جراثیم اس کے طبقۂ بالا میں بھی پوری شدت سے سرایت کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ امریکی صدر جارج واشنگٹن نے یہود کو خون آشام چمگادڑیں (Vampires) قرار دیا تھا لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ امریکی صدر بھی تحریف شدہ تشریحات کے شدت سے قائل ہوگئے۔ رونالڈ ریگن جیسے صدر کی بیشتر پالیسیاں ''اسکوفیلڈ بائبل'' کی پیش گوئیوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ اس کو یقین تھا کہ آرمیگاڈون کا معرکہ عظیم اس کے پہلے دورِ صدارت میں نہیں تو دوسرے میں ضرور پیش آئے گا۔ اس کے بعض مشیر تو بنیاد پرستی میں اس حد تک آگے چلے گئے تھے کہ ماحولیات کے تحفظ، خاندانی منصوبہ بندی اور خود اختیاری موت جیسے مسائل پر بحث کو وقت اور سرمائے کا ضیاع سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے داخلی پروگراموں میں تخفیف کر کے سرمائے کو آزاد کر دینا چاہیے تا کہ آرمیگاڈون کی جنگ لڑنے کے کام آئے۔ ریگن کے نائب

جارج بش سینئر تھے، یہ اس معاملے میں ان سے بھی زیادہ پیش گوئی پرست تھے۔ آزاد چلن اور مشکوک کردار کے حامل بل کلنٹن نے تو برملا اعلان کیا تھا کہ اسرائیل کے تحفظ کے لیے کسی مورچے میں ڈیوٹی دینے کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ جارج بش جونیئر تو اپنے والد سے بھی زیادہ گورے نکلے ہیں۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ وہ یہود کی گود میں پلنے والے عیسائی فرقے پروٹسٹنٹ کی کٹر صہیونیت نواز شاخ ''ایونجلسٹ'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک فضائی سفر میں ان کو کوئی پادری نہ ملا تو محترمہ کونڈو صاحبہ سے دعائیہ سروس کروالی تھی۔ افغانستان کے خلاف حملوں کے وقت وہ اسے صلیبی جنگ (The Last Crusade) کہہ کر دل کی بات زبان پر لے آئے تھے لیکن پھر بوجوہ اسے گول کر گئے۔

سستے سودے اور مہنگے قرضے:

الغرض اب ایسا نازک دور آ گیا ہے کہ یہود عیسائیوں سے زیادہ اور عیسائی یہودیوں سے بڑھ کر مسلم دشمن بن چکے ہیں۔ یہ دونوں مل کر مسلمانوں پر وہ ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں جو کبھی ایک دوسرے پر استعمال کیے تھے یعنی مرد و زن کے آزادانہ میل ملاپ کا رواج، حکمرانوں کو خریدنے کے لیے سستے سودے کرنا اور ملکوں کو قابو کرنے کے لیے مہنگے قرضوں کے جال میں جکڑنا، میڈیا پر گرفت اور فحاشی و عریانی کا فروغ، سود، جوئے اور رشوت کا لقمہ ہر منہ میں پہنچانا تاکہ کسی کی دعاء و مناجات قبولیت کے قابل نہ رہے، نصاب میں تبدیلی خصوصاً یہود کی غداریوں اور ان کے خلاف غزوات کے تذکرہ کو حذف کرنا (پاکستان کے نئے نصاب میں چھٹی جماعت کی اسلامیات میں غزوۂ احزاب کی تفصیلات بدلنے کے علاوہ ''غزوۂ خیبر'' کی جگہ ''صلح خیبر'' کا عنوان رکھا گیا ہے۔ آغا خانیوں، بہائیوں اور قادیانیوں جیسے فرقوں کی پرورش اور سرپرستی کرنا، (اسرائیل میں صرف ان تین ''مسلمان'' فرقوں کو کام کرنے کی اجازت ہے) یہودی علماء سوء کے نام نہاد مسلمان شاگردوں کی کھیپ کی کھیپ تیار کر کے مسلمان ملکوں میں انجیکٹ کرنا اور مسلم عوام کو علما و مشائخ سے فیضاب ہونے کی بجائے ان فارمی ڈاکٹروں، پروفیسروں اور اسکالروں سے استفادے کی اہمیت جتانا، مذہب میں نت نئی بحثیں اٹھا کر اہلِ علم کو ان میں مشغول کرنا اور فروعی مسائل کو دین و ایمان کا مسئلہ بنانا، بین

الاقوامی کاروبار پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے کنٹرول حتی کہ دیہات میں بھی لوگ مٹکے کی جگہ فریج استعمال کرنے لگے ہیں، کچی لسّی اور ٹھنڈائی کی جگہ پیپسی اور کوک پینے لگے ہیں، گرمی میں ٹھنڈک دینے والی مہندی کی جگہ کیمیاوی مادوں سے بنا ہوا ہیئر کلر استعمال کرتے ہیں۔

اندر کا دشمن:

ان دونوں قوموں کے پاس جتنے وسائل تھے اور انہوں نے جس طرح بے دریغ انہیں استعمال کیا اس حساب سے تو مسلمانوں کو اب تک ٹھکانے لگ جانا چاہیے تھا مگر اسلام چونکہ عیسائیت کی طرح چند رسوم اور دعاؤں کا مجموعہ نہیں کہ یہودیت کے آگے جلد ڈھیر ہو جائے...... یہ ایک متحرک، زندہ اور عملی مذہب ہے، مسلم عوام کا اپنے علمائے کرام، مساجد اور قرآن پاک سے تعلق ہے، ان کو دینی مدرسے اور خانقاہیں دینی غذا فراہم کرتے رہتے ہیں اور ان کے علمائے کرام بیدار مغزی سے کام لیتے ہوئے باطل فتنوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور شیخ محمد، بابر چوہدری، جاوید غامدی اور فرحت ہاشمی جیسے لوگوں پر نظر رکھتے ہیں، اس لیے مسلمان انتہائی سخت جان ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی زبردست مزاحمت نے دشمن کو بوکھلا دیا ہے۔ پھر قربان جایئے جہاد اور مجاہدین سے جن کے لہو نے اسلام کے چراغ کو نہ صرف بجھنے سے محفوظ رکھا ہے بلکہ اس کی روشنی کو تیز تر کرنے کی جدوجہد جاری رکھی ہوئی ہے۔ چنانچہ یہودیت نئے یروشلم کے کاسا بلانکا (کاسا بلانکا کے معنی قصرِ ابیض کے ہیں جو یہودی مذہبی داستانوں کے مطابق ان کی نئی مقدس آبادی کا صدر مقام ہے۔ امریکا کی صدارتی رہائش گاہ وہائٹ ہاؤس کے معنی قصرِ ابیض ہیں) سے ہیکل کی طرز پر قائم اسرائیلی پارلیمنٹ تک کا سفر کر چکی ہے مگر وہاں سے القدس کی چٹان تک کے راستے میں ہر ہر قدم پر اسے زبردست مزاحمت کا سامنا ہے۔ اس مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے اسرائیل کو مسلم ممالک سے تسلیم کروانے اور قضیۂ فلسطین کو پوری دنیا کے مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ کی بجائے عربوں کا سیاسی مسئلہ باور کرانے کی کوشش جاری ہے۔ دجّال کے پیروکار اپنے پیشوا کے مخصوص دجل سے کام لیتے ہوئے حالات کو اپنے ڈھب پر لانے میں مصروف ہیں۔ اب یہ مسلمانوں کے امتحان کا وقت ہے کہ وہ سود، جوئے، فحاشی اور دروغ گوئی

و بددیانتی کے اس طوفان میں بہہ جاتے ہیں یا کتاب وسنت سے اپنا تعلق مضبوطی سے قائم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو حرام کھانے اور حرام پہناوے سے بچائے رکھتے ہیں؟

اے مسلمانو! یادرکھو جو آج حرام میں ملوث ہوگا، کل اس کے قدم باطل کے مقابلے میں نہ جم سکیں گے۔ ایک حدیث کے مطابق دجّال کے خلاف جنگ میں صفِ آرا مسلمانوں کی افواج کا ایک تہائی حصہ بھاگ کھڑا ہوگا جسے اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جو سامنے کے دشمن پر غلبہ تو چاہتے ہیں لیکن اندر کے دشمن پر غلبہ نہیں پا سکتے۔

گش ایمونیم

اسٹینلے گولڈ فلیٹ جنوبی افریقہ کے ایک متوسط یہودی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس کا خاندان کٹر مذہبی تو تھا لیکن کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا۔ گولڈ فلیٹ کو بھی واجبی سی تعلیم کے بعد کاروبار کے ''یہودی گر'' سیکھنے کے لیے تجارتی پنڈتوں کے حوالے کر دیا گیا۔ گولڈ فلیٹ نے جب یہودی بڑوں کے پاس آنا جانا شروع کیا تو ان زمانہ شناس اور گھاگ کاروباریوں نے اس کے والد کو رپورٹ دی کہ تعلیم کی طرح اس کا ذہن کاروبار میں بھی نہیں چلتا، یہ تو کند ذہن اور کاہل سانڈ کی طرح غبی اور از کار رفتہ ہے۔ گولڈ فلیٹ کے لالچی اور بخیل والد کو اس سے بڑی تشویش ہوئی، وہ آخری عمر میں اپنے اردگرد بہت سی دولت اور اسبابِ تعیش دیکھنے کا خواہش مند تھا اور اس کی چاہت تھی کہ جو اس کی ناآسودہ تمنائیں پوری نہ ہوئیں ان کو اس کا بیٹا اس کے لیے پورا کر دکھائے گا۔ اس نے بڑی کوشش کی مگر گولڈ فلیٹ کے وحشی مغز میں وہ جراثیم ہی نہ تھے جو علم و ہنر سیکھنے کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ گولڈ فلیٹ نے آوارہ گردی شروع کر دی، اس کا اُٹھنا بیٹھنا اوباش یہودی لڑکوں کے ساتھ ہو گیا جو دنیا کی ہر بُرائی اس یقین کے ساتھ کرتے تھے کہ وہ خدا کی محبوب قوم کے بیٹے ہیں۔ اس کے والدین کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کی شامیں اور راتیں کہاں گزرتی ہیں؟ رفتہ رفتہ اس کا گھر آنا جانا کم ہو گیا یہاں تک کہ ایک دن اس کے والد نے سنا کہ وہ گش ایمونیم (Gush Emunim) والوں کے ہتھے چڑھ کر ''وفاداروں کے دستے'' (Block of the Faithful) میں شامل ہو گیا ہے اور جنوبی افریقہ سے نقل مکانی کر کے ''میراث کی سرزمین'' جا پہنچا ہے جہاں وہ اب یہودی نوآبادیوں میں رہتا ہے جن کے

باشندے سب سے پہلے ''مسیحا'' کا استقبال کرنے کا اعزاز حاصل کریں گے۔

''وفاداروں کا دستہ'' کیا چیز ہے؟ یہ ان متشدد اور جنونی صہیونیوں پر مشتمل گروہ ہے جن کی زندگی کا واحد مقصد مسجدِ اقصیٰ کے صحن میں موجود مقدس چٹان پر قائم گنبد کو شہید کرنا ہے تا کہ اس چٹان پر تیز سرخ رنگ اور بے داغ کھال والے کم عمر و بے عیب سانڈ کی قربانی دی جا سکے۔ یہود بھی عجیب قوم ہے۔ جب سیدنا حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام ان کو گائے کی قربانی کا حکم سناتے تھے تو طرح طرح حیلے بہانے ان کی جان نہ چھوڑتے تھے۔ انہوں نے بے جا باتیں پوچھ کر اپنے مقدس نبی کو دق کر چھوڑا اور اب ہزاروں سال بعد انہیں قربانی کی رسم پوری کرنے کا سودا آ چڑھا ہے۔ ان کے ربّیوں کے مطابق یہ قربانی اس قربانی کی یادگار ہوگی جو (یہودی عقائد کے مطابق) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں اپنے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی بے مثال قربانی سے قائم ہوئی تھی (یہودیوں کے مطابق ذبیح اللہ، سیدنا حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں جنہیں اس پتھر پر راہِ خدا میں قربان کیا گیا تھا جبکہ مذہبی حقائق سے ہٹ کر تاریخی شواہد کے اعتبار سے بھی یہ بات کسی طرح درست ہو ہی نہیں سکتی) اس گروہ کے ارکان یہودی بھی ہیں اور عیسائی بھی۔ انہوں نے ''یروشلم ٹیمپل فاؤنڈیشن'' جیسے ملتے جلتے ناموں سے ایسی تنظیمیں بنا رکھی ہیں جو ٹیمپل ماؤنٹ (Temple Mount) کو ہیکل کی تعمیر کی غرض سے صاف کرنے کے لیے دنیا بھر کے یہودیوں سے لاکھوں ڈالر چندہ اکٹھا کرتی ہیں۔ ان تنظیموں کے ارکان زیادہ تر دریائے اُردن کے مغربی کنارہ (West Bank) میں ان زمینوں میں رہتے ہیں جو فلسطینی مسلمانوں کو قتل و غارت کے ذریعے جلا وطنی پر مجبور کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ اسرائیلی حکومت ان آبادیوں کے گرد اونچی اونچی ناقابلِ عبور دیواروں کے ذریعے حفاظتی حصار قائم کر رہی ہے۔ ان تنظیموں کی شدت پسندی اور دیوانگی کی حد تک پہنچے ہوئے دماغی سرسام کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک رسوائے زمانہ تنظیم اسٹرن گینگ (Stern Gang) نے مہاجر کیمپوں میں مقیم مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے خون سے (نہتے لوگوں کو سامنے دیکھ کر یہود غراتا بھیڑیا بن جاتے ہیں) اس بے دردی کے

ساتھ ہاتھ رنگے کہ اس کی خبریں مغربی پریس میں پہنچنے سے مغربی دنیا پر بھی لرزہ طاری ہو گیا تھا اور ڈیوڈ بن گوریان جیسے یہودی نے بھی اس کو لاقانونیت کا مجرم ٹھہرا کر اس پر پابندی لگا دی تھی حالانکہ اسرائیل کا یہ حکمران اپنی مسلم کش پالیسی اور شقاوتِ قلبی میں خود بھی بدنامی کی حد تک مشہور تھا۔ مسلمان تو چھوڑیے! اپنے محسن برطانیہ کے ساتھ ان سنپولیوں کا رویہ یہ تھا کہ اس تنظیم کے ایک جنونی ممبر نے القدس شہر کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں جہاں برطانوی فوجی اور سفارتکار ٹھہرے ہوئے تھے...... ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو محض اس وجہ سے بم رکھ دیا تھا کہ انگریز جلد از جلد فلسطین سے نکل جائیں اور یہود کو اپنی مشفقانہ سرپرستی سے آزاد کر دیں۔ اس بم دھماکے میں برٹش سیکرٹریٹ اور عارضی فوجی ہیڈ کوارٹر تباہ ہو گیا تھا اور ۱۰۰ سے زائد انگریز اپنے پالے ہوئے سانپوں کے ہاتھوں اس انجام کو پہنچے تھے جو یہود کے ساتھ مہربانیاں کرنے والوں کا مقدر ہے۔ برطانوی حکومت کے سیکریٹریٹ میں بم رکھنے والا یہ ممبر جنوبی افریقہ کا تارک الوطن آوارہ دہشت گرد گولڈ فلیٹ تھا جو اپنے جیسے دیگر جنونیوں کے ساتھ مل کر اس مقصد کے لیے چندہ اکٹھا کرتا تھا کہ ارضِ موعود سے مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو ختم کر دیا جائے تاکہ اس کے نتیجے میں ایسی خونی تباہی پھیلے کہ مسیحا کا ظہور قریب سے قریب تر آ جائے۔

قارئین کو یہ بات حیرت انگیز لگی ہوگی کہ ان تنظیموں میں یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کا کیا کام؟ اس کا کچھ جواب ہم پہلے دے چکے ہیں اور کچھ کا آیندہ کے شماروں میں دیں گے۔ اسی طرح اکثر قارئین شاید سمجھ نہ سکے ہوں کہ ٹیمپل ماؤنٹ کی صفائی سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب ایک پہاڑی کے تعارف سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق یہودیوں کا کہنا ہے کہ جس کا قبضہ اس پر ہو، وہی القدس کا حکمران ہے۔ اس پہاڑی کا ذکر ان کے اس مشہور مقولے میں بھی آتا ہے: ''اسرائیل بغیر یروشلم کے بے کار ہے اور یروشلم بغیر ہیکل کے کسی کام کا نہیں۔'' وہ ہیکل اسی پہاڑی کے اوپر بنے گا اور اس پہاڑی پر چونکہ دنیا کے مشہور ترین اور خوبصورت ترین آثارِ قدیمہ میں شامل ایک مقدس اسلامی عبادت گاہ ہے اس لیے یہود کے مطابق اس کے ملبے تک کو صاف کرنا ضروری ہے۔ یہ پہاڑی قدیم القدس شہر میں واقع ہے اور اس کا نام صہیون

(Zion) ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام نے اس پہاڑی پر ایک عبادت خانہ تعمیر کیا جہاں وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے ایک اہم پیغمبر تھے لہٰذا اس پہاڑی کو مقدس سمجھا جانے لگا۔ یہودیوں نے اسے اپنے عالمی قومی مقاصد کے لیے ایک علامت بنالیا۔ اسی سے لفظ صہیونیت (Zionism) بنا ہے۔ یہ عالمی مقاصد پانچ ہیں اور جو لوگ اسرائیل کو تسلیم کرنے کی باتیں کرتے ہیں ان میں اگر ایمان کی ذرا بھی رمق باقی ہے تو انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کروا کر ان پانچوں ناپاک مقاصد میں معاون و مددگار رہوں گے اور یہ لوگ جو یہودی کی خاکروبی کر کے ان کے لیے میدان صاف کر رہے ہیں، یہ شوق ایک دن انہیں اس انجام تک لے جائے گا کہ وہ حسرت کریں گے کہ کاش! ہم یہ دن دیکھنے سے پہلے مر گئے ہوتے۔ صہیونیت کے پانچ مشہور عزائم یہ ہیں:

☆ فلسطین کی سرزمین پر تمام دنیا کے یہود کے لیے ایک قومی وطن بنانا۔ یہ مقصد ۱۹۴۸ء میں برطانیہ کی سرپرستی میں حاصل کرلیا گیا۔

☆ یروشلم (القدس شہر) کو صہیونی سلطنت کا دارالخلافہ بنانا۔ یہ مقصد ۱۹۶۷ء میں امریکا کی نگرانی میں پورا کرلیا گیا۔

☆ تمام مسلم ممالک کو نسلی، لسانی، گروہی تصادم کے نتیجے میں توڑ کر مسلم اور غیر مسلم باشندوں کو اکٹھا کر کے منی (چھوٹی) ریاستیں یا کینٹونز (Cantons) قائم کرنا جن کے حکمران امریکا اور اقوامِ متحدہ کے انتخاب کے تحت مقرر کیے جائیں گے اور جن کے تمام قدرتی، صنعتی، آبی، معدنی اور دیگر وسائل نیز بجلی، پانی، گیس اور فون وغیرہ بنیادی ضروریات کے ادارے پرائیوٹائزیشن کے ذریعے بین الاقوامی یہودی کمپنیوں (Multinational Companies) کے ہاتھ میں ہوں گے۔ مشرق وسطیٰ کو ۱۲ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے وہاں ایسے حکمران مسلط کروا دیے گئے ہیں کہ جن کو خبر ہی نہیں کہ ہمارے تیل کی دھار کسی اور کے پاس ہے۔ ان باتوں کو کوئی افسانہ سمجھے گا اور کچھ لوگوں کو ان میں اپنے وطن کے حالات کی تصویر نظر آئے گی۔ یہ تصویر کئی مغربی مفکرین (Think Tanks) کھینچ چکے ہیں

اوراب تو ایک مسلم اور سابقہ پاکستانی دانشور ڈاکٹر ابوالمعالی نے بھی اپنی کتاب The Twin Eras of Pakistan میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ (خاکم بدہن) نئے ہزاریے کی پہلی دہائی کے اختتام تک پاکستان کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہوگا۔ پہلا ٹکڑا جو اس علاقے کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ، خوشحال اور معدنی و صنعتی طاقت ہوگا، ری پبلک آف بلوچستان ہے۔ دوسرا کراچی اور حیدرآباد (شہری سندھ) کو ملا کر لیاقت پور یا جناح پور، تیسرا دیہاتی سندھ پر مشتمل سندھو دیش، چوتھا شمالی علاقہ جات اور آزاد و مقبوضہ کشمیر کو ملا کر متحدہ کشمیر کی شکل میں ہوگا۔ یہ کتاب وینٹیج پریس مین ہٹن نیویارک سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہو کر ۱۹۹۳ء میں پاکستان آچکی ہے، عام دستیاب ہے اور پڑھنے والے ہم وطنوں کے حوصلوں کی بلندی کا کام دے رہی ہے۔

☆ چوتھا صیہونی عزم نہایت سنگین ہے یعنی مسجدِ اقصیٰ کو شہید کر کے ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا۔ اس کے لیے ہر سطح پر کام ہو رہا ہے۔ ایک طرف گولڈ فلیٹ جیسے دہشت گرد اور اسٹرن گینگ جیسی بدنام زمانہ تنظیمیں اپنے منصوبوں کی نوک پلک درست کر رہی ہیں، دوسری طرف صیہونی میڈیا یہ کوشش کر رہا ہے کہ فلسطین پر قبضے کی حقیقت کے ادراک سے مسلمانوں کو بہکا دے۔ چنانچہ کبھی اس کو ''آزادیٔ وطن'' اور ''قومی غیرت'' کا عنوان دے دیا جاتا ہے، کبھی اسے ''چھنی ہوئی زمین اور لٹے ہوئے مال'' کا مسئلہ بتایا جاتا ہے۔ کبھی اسے ''خانماں برباد فلسطینیوں'' کے ساتھ ''سپر طاقتوں کا کھیل'' کہہ کر معاملے کی نزاکت کو دبا دیا جاتا ہے۔ یعنی غضب یہ ہے کہ اس مسئلے سے دین اور مذہب کے عنصر کو خارج کر دیا گیا ہے اور اب کسی کو شعور ہی نہیں کہ یہ اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان زمین کا تنازع نہیں جو مذاکرات سے حل ہو جائے گا، بلکہ یہ حق و باطل کا معرکہ ہے جس میں ہر صاحبِ ایمان کی آزمائش ہے۔ یہ رحمانی اور شیطانی قوتوں کی جنگ ہے جس میں ہر ایک کلمہ گو اپنی حیثیت کے بقدر جوابدہ ہے۔ تیسری طرف مسلم معاشروں میں نوخیز اسرائیلی مولویوں کی کھیپ تیار کی جارہی ہے جو مسجدِ اقصیٰ اور ارضِ فلسطین کو مظلوم یہودیوں کی میراث قرار دیتی ہے جسے اگر ان کے حوالے نہ کیا گیا تو امتِ مسلمہ تکذیبِ آیات اللہ کی مرتکب ہوگی۔ چوتھی طرف دجل اور فریب کی شعبدہ بازیاں ہیں۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے بہانے مسجدِ اقصیٰ کے نیچے گہری

سُرنگیں کھود کر وہاں عارضی طور پر یہودی عبادت جاری کی جاچکی ہے اور یہودی ربی اپنے عوام کو یہ باور کروا رہے ہیں: ''فی الحال زیرِ زمین اور مستقبل قریب میں برسرِ زمین۔'' اس زیرِ زمین منصوبے کو زمین کے اوپر لانے کی وہ کوشش جس کے ذریعے آخری مرحلے کا آغاز ہوگا، یہودیوں کی اصطلاح میں ''گش ایمونیم'' کہلاتی ہے اور جو اس خوفناک اور خطرناک عمل کے متجانب اثرات (Collateral Effects) کے مطالعے کی تکمیل کے بعد بس ظہور میں آیا ہی چاہتی ہے۔

☆ صہیونیت کا پانچواں عزم گریٹر اسرائیل کا قیام ہے یعنی فلسطین کے بعد شام، لبنان، اُردن، کویت اور عراق مکمل جبکہ سعودی عرب، مصر اور ترکی کے کچھ علاقوں پر مشتمل عظیم تر صہیونی ریاست کی تشکیل جو مسیحائے منتظر و موعود (دجّالِ اکبر، جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے خدانا شناس دنیا کو اپنے چنگل میں کرنے والا، نئے عالمی نظام کا سربراہِ اعظم) کے شایانِ شان ہوگی اور پورے کرۂ ارض کے لیے وضع کیے گئے ''نئے عالمی نظام'' (New World Order) کو نافذ کرے گی۔ واقفانِ حال مسلم زعماء بارہا اس کا اعلان کر چکے ہیں کہ اسرائیل کا سانپ ان تمام مسلم ممالک کو ہڑپ کر جائے گا مگر دور پار کے ممالک فلسطین کی پھر بھی کچھ فکر رکھتے ہیں، لیکن تمام عرب ممالک خادم الحرمین الشریفین کی پیروی میں کالے دھندے والے گورے لُٹیروں کی اس جوڑی (بش و بلیئر) کا سایۂ عاطفت تلاش کرتے رہتے ہیں جن کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے۔ صہیونیت کا پروردہ عالمی استعمار اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان حکمرانوں سے دومنہ والے کڑیالے سانپ کی طرح (جو ایک منہ سے پچکارتا ہے اور دوسرے سے ڈستا ہے) سلوک کر رہا ہے۔ عالمی طاغوتی نظام اعلان کر چکا ہے: ''ہم آخری اور فیصلہ کن جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم ساری دنیا کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔'' (صدر بش: خطاب فروری ۱۹۹۱ء) شر کی طاقتیں ہمہ جہتی طریقہ (Many Front Approach) استعمال کر رہی ہیں جبکہ خیر کو پھیلانے کے ذمہ دار تا حال بدی کی قوتوں کے ہتھکنڈوں سے واقف ہی نہیں۔ انہیں کون سمجھائے ذرا اپنے اردگرد کی خبر لو! انہیں کون بتائے پہاڑی کے پیچھے سے فوج چڑھی آ رہی

ہے۔ آج اس یلغار کو امت کا ہر فرد اپنے اپنے دائرہ کار میں ذمہ دارانہ اور مخلصانہ کردار کے ذریعے روک سکتا ہے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر کل آنے والے ہولناک عذاب کو روکنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

زرد گنبد کی شبیہہ

ڈاکٹر لیمبرٹ ڈولفن ایک ممتاز امریکی سائنس دان ہے۔ یہ کیلی فورنیا میں واقع اسٹین فورڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے وابستہ ہے۔ اس نے تعمیراتی مقاصد کی غرض سے زمین کا جائزہ لینے کے لیے ایکسرے کی طرح کا ایک راڈار ایجاد کیا ہے۔ یہ راڈار زمینی تحقیق کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس حوالے سے خاصا قابلِ اعتماد ہے۔ اس کے ایجاد کردہ طریقِ کار میں کسی علاقے کی ارضیاتی تحقیق کے لیے پہلے ایک فضائی فوٹو گرافی ہوتی ہے پھر زمین کے اندر کی ساخت اور دیگر معلومات کے لیے جدید سائنسی طریقہ THERMAL INFRARED IMAGINARY استعمال کرتے ہوئے زمین کے اندر راڈار داخل کر دیا جاتا ہے جو زمین کے اندر کی آوازیں بھی جانچ لیتا ہے۔ اس جغرافیائی اور ارضی تحقیق کی روشنی میں انجینئر صاحبان اپنے منصوبے کا آغاز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈولفن کٹر قسم کا شدت پسند (DISPENSATIONALIST) ہے۔ اس کی شہرت سن کر مسجدِ اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مہم چلانے والے مشہور اداروں میں سے ایک ادارے یروشلم ٹمپل فاؤنڈیشن نے اس کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ فاؤنڈیشن یہ چاہتی تھی کہ ڈاکٹر موصوف اور اس کی ٹیم ہیکل کی تعمیر کے لیے مسجدِ اقصیٰ کی زمین کا سروے کرے۔ بظاہر اس کا مقصد ارضیاتی جائزہ تھا لیکن درحقیقت وہ یہ چاہتے تھے کہ مسجدِ اقصیٰ کی چار دیواری کے اندر موجود تعمیرات کی بنیادوں کا جائزہ لیا جائے کہ یہ کس حد تک مضبوط ہیں اور ان کے نیچے سرنگوں کی کس زاویے سے کھدائی اور ان میں ارتعاش پیدا کرنے والے آلات کی تنصیب سے انہیں

ایسا نقصان پہنچ سکتا ہے کہ وہ (خدانخواستہ) کچھ عرصے بعد بوسیدہ ہوکر خود ہی گر جائیں اور اسلامی دنیا اس کو یہودی کارستانی کی بجائے قدرتی حادثہ سمجھے۔ڈاکٹر ڈولفن سے اس کی ٹیم کی آمدورفت، قیام اور منصوبے کی تکمیل کے لیے اخراجات کا تخمینہ پوچھا گیا تو اگر چہ وہ خود عیسائی تھا اور یہود کے اس پروپیگنڈے کا قائل تھا کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ زمین پر بھیجنے سے قبل ہیکل کی تعمیر ہو جانی چاہیے......لیکن یہودی تنظیم کے پاس موجود فنڈز کے پیش نظر اس نے انہیں ساڑھے دس لاکھ ڈالرز کا خرچ بتایا۔اس تنظیم کو کیولری چیپل نامی سرمایہ دار یہودی نے اس ''عظیم کارِ خیر'' کے لیے رقم تن تنہا فراہم کردی اور ڈاکٹر ڈولفن اپنا سائنسی سازوسامان اور عملے کے ساتھ القدس شہر پہنچ گیا۔یہ ۱۹۹۹ء کی گرمیوں کی بات ہے۔

ڈاکٹر ڈولفن نے ''زمینی تحقیق سے متعلق راڈار'' اور دیگر سازوسامان کے ساتھ کئی ہفتے اس مقدس شہر میں گزارے۔اس دوران وہ القدس کی تاریخی اسلامی عبادت گاہوں کے قریب کھدائیاں اور ایکسرے کرتا اور مٹی کے نمونے اور مسلمانوں کے ردعمل کا جائزہ لیتا رہا۔جب منصوبے کے اصل حصے یعنی مسجدِ اقصیٰ کے قریب اس نے کھدائی شروع کی اور زمین کے اندر آوازوں کی جانچ کرنے والا ایکسرے کرنا چاہا تو فلسطینی مسلمانوں میں زبردست اشتعال پھیل گیا۔پورے شہر کی فضا خراب ہوگئی، خطرہ محسوس ہونے لگا کہ ڈاکٹر اور اس کی ٹیم پر فلسطینی جانباز فدائی حملہ نہ کردیں۔اسرائیلی حکومت نے یہ حالات دیکھے تو فاؤنڈیشن کو دیا گیا اجازت نامہ منسوخ کردیا اور امریکی ڈاکٹر کو حکم ہوا کہ جلد از جلد اپنا سازوسامان لپیٹے اور عملہ کو ساتھ لے کر رخصت ہو جائے۔ڈاکٹر ڈولفن تو کیلی فورنیا واپس رخصت ہوگیا لیکن کیا یہ مہم رُک گئی؟ نہیں ہرگز نہیں! بیت المقدس کی جگہ ہیکل کی تعمیر یہودیوں کے لیے سرسام بن چکی ہے۔ان کے خیال میں جب تک ہیکل تعمیر نہیں ہوگا، ان کا نجات دہندہ دجالِ اعظم ان کی مدد کو ظاہر نہیں ہوگا اور جب تک وہ ظاہر نہیں ہوگا ان کو حسبِ منشا غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا نہ ان کے مصائب ختم ہوسکتے ہیں لہٰذا اس وقت درجنوں تنظیمیں اس غرض کے لیے کام کررہی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مقدس مسجد کو شہید کرکے اس کی جگہ یہودی عبادت گاہ تعمیر کردی جائے۔اس غرض کے لیے

لاکھوں ڈالر چندہ اکٹھا ہوتا ہے اور ان تنظیموں کی ویب سائٹ پر ناظرین کو کام کی رفتار اور ترقی سے مطلع کیا جاتا ہے۔ یہ کوشش ہمہ جہتی ہے اس میں ہر یہودی چاہے...... سیاست دان ہو یا دہشت گرد غنڈہ، سرمایہ دار ہو یا جوئے کے کسی مرکز کا کیشئر...... اپنی اپنی حیثیت اور وسعت کے بقدر حصہ لے رہا ہے۔

جون ۱۹۶۷ء سے اب تک ۱۰۰ سے زائد مرتبہ جوشیلے یہودی مسلمانوں کی اس انتہائی مقدس عبادت گاہ پر حملے کر چکے ہیں۔ ان حملوں کے لیے اس تاریخ کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ صفر ۱۳۸۷ھ کے موافق ہے۔ یہ وہی مہینہ تھا جب تقریباً ۱۳۸۰ سال قبل مسلمانوں کو خیبر کے غدار یہودیوں پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ ان حملوں میں مسلح یہودی ربّی سب سے پیش پیش رہتے ہیں۔ ایک مشہور یہودی ربّی شومن گورین کو جب اسرائیل کا ربّی اعظم بنایا گیا تو اس کا انتخاب کرنے والوں کے پیش نظر اس کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر حملہ کرنے والے ۵۰ مسلح غنڈوں میں سب سے آگے تھا اور ان کی قیادت کر رہا تھا۔ ان حملوں میں اسرائیلی حکومت پوری طرح ملوث ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ اسرائیلی فوج کے ذریعے کام کروائے اور پھر دنیا بھر کے خوابیدہ مسلمانوں کو جگا کر مصیبت مول لے۔ اس کی خواہش ہے کہ یہ کام یہودی انتہا پسند اپنے طور پر کریں اور وہ بڑی بڑی ناقابلِ عبور دیواریں تعمیر کر کے انہیں تحفظ فراہم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۷ء سے آج تک اسرائیل کے سرکردہ ربّیوں (مذہبی رہنماؤں) نے ان تنظیموں کی کارروائیوں کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ یہودی دہشت گردوں کی طرف سے مسجد پر ہونے والے متعدد حملوں کی ایک بار بھی اسرائیلی حکومت کے کسی اہلکار یا کسی سیاسی پارٹی کے عہدیدار نے...... چاہے وہ حکومت میں ہو یا اپوزیشن میں...... مذمت نہیں کی، بلکہ یہ لوگ اگر اپنی حماقت کی وجہ سے ایسے کسی منصوبے پر عمل کے دوران گرفتار ہو جائیں تو ان سے عظیم قومی ہیرو جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی دہشت گرد کو لمبے عرصے قید کی سزا نہیں دی جاتی بلکہ اسرائیلی صدر نے ان کی سزاؤں میں خصوصی اختیارات کے تحت تخفیف ہی کی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعلیٰ سطح پر حکومت

ان کارروائیوں کو نہ صرف پسند کرتی ہے بلکہ اس میں وہ در پردہ مکمل طور پر شریک ہے۔

حرم قدسی پر ہونے والے شدید مسلح حملوں میں وہ بڑے بڑے تمام ربی شامل رہے ہیں جو سرکاری ملازم ہیں اور اسرائیلی سرکار سے بھاری تنخواہ و مراعات پاتے ہیں۔ یہ یہودی رہنما پریس کے سامنے اسرائیلی عوام کو تو امن کی تلقین کرتے اور عربوں سے تعلقات بہتر بنانے پر زور دیتے ہیں (مسلمانوں کی جگہ وہ عربوں کی اصطلاح عالمی میڈیا جان بوجھ کر استعمال کرتا ہے تاکہ مسئلہ فلسطین کو عرب یہود کا سیاسی تنازع باور کرا سکے) لیکن یہودیوں کے سامنے کیے جانے والے خطابات میں مسلسل اشتعال انگیزی کرتے اور جنونی یہودی غنڈوں کی سرپرستی اور قیادت کرتے ہیں۔ ان کے خطابات کا بنیادی موضوع یہ ہوتا ہے: ''ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تمام جلاوطنوں کو اکٹھا کرنے اور اپنی ریاست بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ مقدس عبادت گاہ اور قربان گاہ تعمیر کی جائے۔'' امریکا خصوصاً نیویارک (جو جیویارک بھی کہلاتا ہے) سے اسرائیل گئے ہوئے یہودی اس حوالے سے سب سے زیادہ متشدد ہیں۔ آیئے ان میں سے چند ایک کے خیالات ملاحظہ کرتے ہیں:

☆ ...... بوبی براؤن بروک لین کا رہنے والا ہے، اس نے ''مسیحا کے استقبال'' کا شرف حاصل کرنے کے لیے نیویارک کی پُرآسائش زندگی کو چھوڑ کر مقبوضہ فلسطین کی ایک یہودی بستی میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ٹکویا (TEKOA) نامی یہ بستی بیت اللحم میں ہے۔ اس نے صحافیوں کے ایک گروپ سے بات چیت کرتے ہوئے کہا: ''ماؤنٹ موریا پر مسجدِ اقصیٰ کی موجودگی اس زمین پر بڑا بوجھ ہے۔ یروشلم کی کسی بھی تصویر پر نظر ڈالو، مسجدِ اقصیٰ نظر آ جائے گی۔ [بیت المقدس کے زرد گنبد سے یہودیوں کے بغض و عناد کا اس ایک جملے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے] اسے تو جانا ہی ہوگا۔ ایک دن ہم اپنی تیسری عبادت گاہ وہاں تعمیر کر ہی لیں گے، یہ کام لازمی طور پر کریں گے تاکہ عرب اور ساری دنیا دیکھ لے کہ ہم یہودیوں کا قبضہ سارے یروشلم پر ہے، اسرائیل کی تمام زمین پر ہے۔''

☆ ...... رابرٹ فرائیڈ بھی امریکا سے گیا ہوا ایک یہودی آباد کار ہے۔ اس سے جب

پوچھا گیا کہ مسجدِ اقصیٰ کو تباہ کر دینے سے ایک ہولناک جنگ شروع ہوسکتی ہے کیا آپ کو اس کا اندازہ نہیں؟ تو اس نے کہا: ''ٹھیک! بالکل یہی بات ہے۔لیکن ایسی ہی جنگ تو ہم چاہتے ہیں کیونکہ ہم اس میں جیتیں گے، پھر ہم تمام عربوں یعنی فلسطینی مسلمانوں کو، بقیہ عرب مسلمانوں کو اپنی دولت شمار کرنے اور اس کا مصرف ڈھونڈنے سے ہی فرصت نہیں] اسرائیل کی سرزمین سے نکال دیں گے اور تب ہم اپنی عبادت گاہوں کو از سرِ نو تعمیر کریں گے۔''

☆......روزن ہوورنامی ایک یہودی تنظیم کا اعلیٰ عہدیدار یہودی دہشت گردوں کے لیے دنیا بھر کے یہود سے چندہ اکٹھا کرتا ہے۔اس نے غیر ملکی صحافیوں سے برملا کہا: ''یہودی عبادت گاہ کی تعمیر کے لیے مسجدِ اقصیٰ کو تباہ کرنے سے اگر تیسری جنگِ عظیم شروع ہوجاتی ہے تو بیشک ہوجائے۔خدا کی مرضی یہی ہے۔''

☆......۱۹۸۵ء میں یہودہ ایٹزون (YEHUDA ETZION) نامی ایک دہشت گرد گرفتار ہوا۔اس نے میناخم لونی نامی اسرائیلی فوج کے ایک ریٹائرڈ انجینئر کے ساتھ مل کر مسجد کے انہدام کا خفیہ منصوبہ بنایا تھا۔انہوں نے فضائی فوج کے ایک پائلٹ کو ساتھ ملایا جس نے جہاز کو مسجد کے اوپر لاکر فضائی حملہ کرنا تھا۔تب یہودیوں کے بم بردار دستے دیواریں پھاند کر مسجد کے صحن میں داخل ہوجاتے، تاہم منصوبے پر عمل سے پہلے وہ گرفتار ہوگئے۔مقدمے کے دوران یہودہ ایٹزون نے عدالت میں بیان دیا: ''اسرائیلی حکومت چونکہ مسلمانوں سے سرزمین کو خود پاک نہیں کرے گی تو لازم آتا ہے کہ یہ کام میں خود انجام دوں۔'' وہ اپنے فعل پر نادم نہیں تھا۔اس نے عدالت سے کہا: ''میں سو فیصد معصوم ہوں کیونکہ اس عمارت (مسجدِ اقصیٰ اور گنبدِ معراج) کو ضرور ہٹانا ہے۔''

تو برادرانِ اسلام یہ ہیں وہ حالات جن کی رو سے ایک اندھا بھی سمجھ سکتا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ سخت خطرے میں گھری ہوئی ہے۔اس پر سازشوں کے گہرے بادل منڈلا رہے ہیں۔نہتے فلسطینی مسلمانوں نے اپنے زخمی جسموں سے اس کے گرد حفاظتی دیوار کھڑی کررکھی ہے لیکن وہ کب تک تنہا اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔یہ ان کا نہیں پوری امتِ مسلمہ کا، روئے زمین

پر بسنے والے ہر کلمہ گو کی غیرتِ ایمان کا مسئلہ ہے لیکن حالت یہ ہے کہ فلسطین کے غم میں شریک ہونے پر کوئی تیار نہیں، اقصیٰ کے آنسو پونچھنے پر کوئی آمادہ نہیں۔ مسلمانوں پر جو مصائب نازل ہو رہے ہیں اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقدس مقامات کو بھی بھلا رکھا ہے اور اپنے مظلوم بھائیوں کے بارے میں ایسی سنگ دلانہ بے حسی کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ اس کے انجام کو سوچ کر روح کانپ اٹھتی ہے۔

ربیع الاول کے مہینہ میں ہمارے ہاں خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی کی شبیہیں بنائی جاتی ہیں۔ ان مقامات سے محبت مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے اپنے ذہن کے مطابق اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس مظلوم مسجد کا کیا ہوگا جو یہود کے قبضے میں ہے اور کوئی اس کو یاد نہیں کرتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دو نہیں، تین مقدس مقام ہیں: بیت اللہ، مسجدِ نبوی اور بیت المقدس۔ پہلے دو مقام پر تو مسلمان حاضری بھی دیتے ہیں اور ان کی خوبصورت تصاویر بھی ہر گھر میں آویزاں ہیں۔ بہت سی مساجد میں روضۂ مطہرہ جیسے خوبصورت گنبد بھی بنے ہوئے ہیں۔ فیصل آباد میں ایک فیکٹری کے ساتھ بنی مسجد میں ایک گنبد کے اندر اتنا خوبصورت اور نفیس کام ہوا ہے کہ انسان حُسنِ ذوق کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ مسلمانوں کے عشق و محبت کے جذبات ہیں لیکن غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے تیسرے مقدس مقام کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ ہمیں اس مسئلہ کو زندہ رکھنا ہوگا کیونکہ مستقبل قریب میں ہمارا سب سے بڑا امتحان اس مسجد کے حوالے سے ہوگا۔ مسلمانوں کے گھر، دفاتر اور بیٹھکیں اس مقدس مقام کی تصاویر سے آراستہ رہنی چاہییں۔ اس کے علاوہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے: مساجد کے مرکزی ہال کے وسط میں جو گنبد بنایا جاتا ہے اس کی ساخت بیت المقدس کے مشہور زمانہ زرد گنبد کے طرز پر بنائی جائے تو یہ ایک جدت بھی ہوگی اور مسلم امہ کے عظیم ورثے سے نسبت کا اظہار بھی۔ ایسی نسبت جسے ہمارے دشمن فراموش کروا دینا چاہتے ہیں۔ قیامِ اسرائیل کو پچاس سال ہو چکے ہیں اور نصف صدی میں کرۂ ارض کے مسلمانوں کی وہ نسل دنیا سے گزر چکی ہے جس نے اپنی آنکھوں سے بیت المقدس کی زیارت کی ہو۔ اب تو اسپین کی مسجد قرطبہ کی طرح نئی نسل جانتی

بھی نہیں کہ بیت المقدس نامی وہ چیز کیا ہے جو ہم سے چھین لی گئی۔ حیرت ہے کہ آپ کو نجف اور کربلا کی اسلامی تعمیرات کا نمونہ تو اپنے ملک میں مل جائے گا لیکن بیت المقدس کو ہی ایسا یتیم سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کی یادگار یا شبیہہ بھی کوئی نہیں بناتا۔ مسلمانوں کے ملکوں میں بہت سی نئی مساجد بنتی رہتی ہیں اور اب تو جدت طرازی کے خوشگوار نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اگر نئی بننے والی مساجد میں سے چند ایک کے مرکزی ہال کے وسط میں زرد گنبد بن جائے تو یہ شاندار یادگار ہوگی جو نئی نسل کو اس کا فرض یاد دلاتی رہے گی اور اگر یہ ہال گنبدِ صخرہ کی دیواروں کی طرح آٹھ کونوں والا ہو تو کیا کہنے، سبحان اللہ! لطف ہی آجائے گا۔ ضربِ مؤمن میں مسجدِ اقصیٰ اور گنبدِ صخرہ کے ماڈل اتنے زاویوں اور اتنے رُخ سے چھپ چکے ہیں کہ متوسط صلاحیت والا انجینئر بھی انہیں دیکھ کر مطلوبہ ماڈل بآسانی ڈیزائن کر سکتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو گنبدِ صخرہ کی تصاویر پر مشتمل سی ڈی بھی مل سکتی ہے۔ اگر یہ گنبد مسجد کے ہال کے بیچ میں بنایا جائے تو اس پر کوئی اتنا زیادہ اضافی خرچ بھی نہیں اُٹھے گا۔

جو قوم اپنی روایات اور ورثے کی حفاظت کرتی ہے وہ قدرت کی طرف سے اپنی بقا کے فیصلے کروا لیتی ہے اور جو انہیں فراموش کر دے تو اللہ اور اس کا دین کسی کا محتاج نہیں، وہ کسی اور کو اس کی حفاظت کے لیے کھڑا کر دیتا ہے۔

تورات کیا کہتی ہے؟

''مولانا صاحب! السلام علیکم''

''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''

''بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ اسرائیل یہودی ریاست نہیں، یہودیوں کی ریاست ہے؟''

''اس لفظوں کے کھیل سے ان کا مطلب کیا ہے؟''

''اسرائیل کی نفرت کم کرنے کے علاوہ اور کیا مطلب ہوسکتا ہے؟''

''جب تورات کے مطابق اسرائیل کی بداعمالیوں کے سبب خود اس کا خدا اس سے نفرت کرتا ہے تو ان کو کیا پڑی کہ وہ اس مردود قوم کی نفرت کم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ بھی اس لعنت میں سے حصہ پانا چاہتے ہیں جو ایک عہد شکن، گستاخِ انبیا اور غدار و بدعمل قوم کے لیے مقرر ہے؟''

''اچھا آپ کچھ رہنمائی تو فرمائیں؟''

''پہلے یہ بتایئے یہ لوگ شکل صورت سے مولوی تھے یا عام آدمی؟''

''مولوی تھے تبھی تو ہمیں پریشانی ہے''۔

''تو پھر یہ اسرائیلی مولوی ہوں گے''۔

''اسرائیلی مولوی؟''

''جی ہاں! آج کل علمائے سوء کی ایک نئی قسم نکلی ہے جو نجاست اور نحوست میں اس کی پہلی تین قسموں (شکم پرست ملا، درباری ملا اور کٹ ملا) سے بھی نمبر لے گئی ہے''۔

''اچھا آپ اب اس موضوع پر کچھ بولیے''۔

''آپ ان سے پوچھتے: اسرائیل کے بانی کون ہیں؟ (بندہ کا مضمون ''دو ڈاکٹروں کی کہانی'' دیکھیے) وہ لوگ تو اسے نہ صرف یہودی اور صہیونی ریاست کہتے ہیں بلکہ اسے ''ارض موعود'' اور ''میراث کی سرزمین'' کہتے ہیں اور دنیا بھر میں پمفلٹ تقسیم کرتے ہیں کہ ''مسیحا کے استقبال کے لیے ایک اینٹ یا ایک درخت اسرائیل میں لگائیے''۔ یہ ان کا مذہبی عقیدہ ہے کہ صرف فلسطین نہیں بلکہ ''نیل سے فرات تک'' ارض موعود کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں شریک نہ ہونے والا یہودی لامذہب اور بددین ہے۔ بن گوریان نے کہا تھا: ''ہر وہ یہودی جو ارض موعود کی طرف واپس نہیں آئے گا، اسرائیل کے خدا کی رحمت سے محروم ہو جائے گا۔'' موشے دایان نے ۶ جون ۱۹۶۷ء جنگ کے خاتمے پر اعلان کیا: ''ہم نے یروشلم پر قبضہ کرلیا ہے۔ اب ہم یثرب اور بابل کی طرف بڑھنے والے ہیں۔'' ان شکم پرست ملاؤں سے آپ پوچھیں: یہودی یثرب کس شہر کو کہتے ہیں؟ اسرائیلی پارلیمنٹ کی دیوار پر ''عظیم تر اسرائیل'' کا جو نقشہ بنا ہے اس کی تصویر ہم شائع کر چکے ہیں۔ یہ نقشہ ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اسرائیل یہودی ریاست ہے یا یہودیوں کی ریاست؟''

''ان حضرات کا کہنا تھا اسرائیل کی پارلیمنٹ میں مسلمان بھی ہوتے ہیں؟''

''آپ ایک دو کا نام بتائیے''۔

''گہری خاموشی......''

''اچھا سنیے! اسرائیل کی حکمراں اگودت لیبر پارٹی کے دستور میں لکھا ہے: ''اسرائیل دوسری ریاستوں جیسی ایک ریاست نہیں ہے۔ تورات کی ہمیشہ رہنے والی شریعت اسرائیلی قوم اور اسرائیلی ریاست کا قدرتی دستور ہے''۔

''اس کا حوالہ آپ دے سکتے ہیں''۔

''حوالہ؟ آپ نیٹ پر جائیں اور وہاں سے خود لے لیں لیکن پھر مجھے یہ ضرور بتائیے گا کہ ''قدرتی دستور'' کا کیا مطلب ہے؟''

''وہ حضرات یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ارضِ فلسطین کی وراثت اور مسجد اقصیٰ کی تولیت

کا حق یہود کو ہے''۔

''ارض فلسطین کی وراثت کا لفظ اندر کا کھوٹ بتلا رہا ہے کہ وہ اسے ابدی یہودی ریاست سمجھتے ہیں۔اس سے ان کی پہلی بات کی خود بخود نفی ہوگئی''۔

''اس بات پر میں ان کو پکڑوں گا لیکن مولانا صاحب! مسجد اقصیٰ کی تولیت تو یہود کو ملنی چاہیے کیونکہ یہاں ان کی مذہبی عبادت گاہ ''ہیکل سلیمانی'' تھی''۔

''پہلی بات پوری ہونے دیجیے! ارضِ فلسطین کی وراثت سے ان یہودی ملاؤں کی مراد کیا ہے؟ مادی وراثت تو ہو نہیں سکتی کہ قوم یہود باہر سے یہاں آ کر آباد ہوئی تھی۔ خود تورات میں لکھا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام جو ہمارے اور ان کے جد امجد ہیں عراق سے یہاں تشریف لائے تھے۔ جب وہ فلسطینی الاصل نہ تھے تو یہود کیسے یہاں کے وارث ہو سکتے ہیں؟ اگر روحانی وراثت کا دعویٰ ہے تو خود تورات کے مطابق یہود کی بداعمالیوں کے سبب ان سے یہاں کی وراثت چھین لی گئی ہے ورنہ وہ یہیں رہتے ان کو یہاں سے لونڈی غلام بنا کر کیوں نکالا گیا؟''

''آپ نے تورات پڑھی ہے''۔

''کئی مرتبہ۔ اور وقتاً فوقتاً پڑھتا رہتا ہوں۔ ہر عالم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں تک تاریخی مذہبی عبادت گاہ پر ان کا حق تسلیم کرنے کی بات ہے تو اس کلیے کی رو سے بھی یہود کا حق نہیں بنتا کیونکہ ''ہیکل سلیمانی'' یہود نے یہاں خالی جگہ پر تعمیر نہ کیا تھا نہ اس جگہ ہیکل کی تعمیر پہلی تعمیر تھی۔ اس جگہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے عبادت گاہ چلی آ رہی ہے۔ خانہ کعبہ کی ابتدائی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی اور بیت المقدس، خانہ کعبہ کے چالیس برس بعد تعمیر ہوا ہے۔ اس وقت سے...... یعنی یہود کی یہاں آمد کے ہزاروں سال پہلے سے...... اس بابرکت جگہ جو عبادت گاہ بنتی رہی اس کی تولیت اہل حق کو ملتی رہی، بیچ میں یہودیوں کا دور آیا تو حضرت داود و حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہم الصلاۃ والسلام کو ملی۔ ان کے بعد جب یہودیوں نے ان مقدس انبیائے کرام کی نافرمانی کی تو انہی انبیاء کرام نے ان پر لعنت اور بددعا کی اور یہودی دھتکار کر یہاں سے نکال دیے گئے اور قیامت تک اہل حق کو اس جگہ کی تولیت دے دی

گئی۔ خلاصہ یہ کہ یہ جگہ یہودیوں نے تعمیر نہیں کی ان سے پہلے کی تعمیر تھی اور ان کے بعد اہل توحید کے سجدوں سے آباد ہے۔ یہود صرف اس عبادت گاہ پر دعویٰ کر سکتے ہیں جو پہلی مرتبہ انہوں نےخود تعمیر کی ہو، مسجد اقصیٰ پر ہرگز نہیں کر سکتے کہ یہ تو ابتدا سے یہودی عبادت گاہ نہ تھی۔ یہودیوں سے ہزاروں سال پہلے سے چلی آ رہی ہے اور ان کے بعد بھی ''قیامت تک سجدہ گاہ اہل اسلام رہے گی''۔

''وہ یہ اصول بیان کر رہے تھے کہ ہر فرقے کی مرکزی عبادت گاہ اسی کو ملنے چاہیے''۔

''یہود اور اصول؟! اس اصول کا جواب دے چکا ہوں۔ یہود کو یہ جگہ لینی ہی تھی تو اس وقت لے لیتے جب سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو ترغیب دے دے کر اُبھار رہے تھے کہ میرے ساتھ چلو اور یہ عبادت گاہ چھڑا لو لیکن گستاخ یہودی کہہ رہے تھے: ''تم اور تمہارا رب جا کر لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' اس وقت فلسطین کی وراثت اور ہیکل کی تولیت ان کو کیوں یاد نہ آتی تھی''۔

''اب انہوں نے آدھے سے زیادہ فلسطین پر قبضہ کر ہی لیا تو یہ واپس تو جائیں گے نہیں۔ انہیں تسلیم تو کر لینا چاہیے''۔

''یہ قبضہ انہوں نے نہیں کیا۔ تورات کہتی ہے کہ قدرت انہیں یہاں ہانک کر لائی ہے تاکہ سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھوں ان کو آخری سزا دلوائے۔ اب جو کوئی اس ناجائز قبضے کو تسلیم کرتا ہے وہ بھی اس سزا کا مستحق ہوگا جو ان کے لیے مقرر ہے''۔

''مولانا صاحب! آپ فلسطین کی بات یہاں بیٹھ کر کیوں کرتے رہتے ہیں؟''

''یہی بات میں ان ایمان فروشوں سے پوچھتا ہوں۔ وہ اسرائیل کی بات یہاں بیٹھ کر کیوں کرتے ہیں؟

اب اصل جواب سنیے: دنیا میں اس وقت جو بھی حالات ہیں یہ سب فلسطین میں ہونے والی ''آخری جنگ عظیم'' کا پیش خیمہ ہیں جس کو ہر مجدون یا آرمیگاڈون بھی کہتے ہیں اور اس میں پاکستان و افغانستان کے مجاہدین کا عظیم حصہ ہوگا۔ زرقاوی عراق سے یہودی انخلا کی خاطر شہید نہیں ہوا بلکہ اس نے مسجد اقصیٰ کے تحفظ کے لیے جان دی ہے۔ زرقا سے بعقوبہ تک کی

داستان حیات آپ غور سے پڑھیے! ہر موڑ اقصیٰ اور القدس سے ہوکر گزرتا نظر آئے گا۔ افغانستان کی جنگ قدرتی ذخائر سے بھرپور پہاڑوں کے لیے نہیں، صہیون کی پہاڑی کو خدا کی مغضوب قوم سے بچانے کے لیے ہے۔ بابری مسجد کی شہادت، مسجد اقصیٰ کی شہادت کی ریہرسل ہے۔ یہود و ہنود ایک ہیں۔ کاش عرب و عجم بھی ایک ہو جائیں"۔

"مولانا صاحب! آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں"۔

"جو سمجھ کر بھی نہ سمجھے اسے کون سمجھا سکتا ہے؟ میں بھی نہیں چاہتا کہ ساری باتیں فی الفور کھول کر سمجھا دی جائیں۔ اس سلسلے کو آہستہ آہستہ چلانا چاہیے۔ ورنہ لوگ جہاد اور تقویٰ چھوڑ کر حضرت مہدی کے انتظار میں آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر بیٹھے رہ جائیں گے اور جب حضرت مہدی کے لشکر کی آواز لگے گی تو گناہوں اور ترک جہاد نے انہیں یا ان کی نسل کو اس قابل نہ چھوڑا ہوگا کہ وہ اس مبارک جماعت میں شامل ہو سکیں"۔

بہترین دوست بدترین دشمن

امریکا آنے جانے والوں سے لوگ بلاوجہ ہی دلچسپی رکھتے ہیں اور وہاں کی طلسماتی دنیا کے بارے میں ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ ان کی دلچسپی کی اپنی اپنی وجوہ ہوتی ہیں۔ بندہ کو ان میں سے کوئی پڑھا لکھا معقول شخص مل جائے تو کوشش ہوتی ہے کہ اس سے تین سوالوں کا جواب معلوم کیا جائے۔ ان تین سوالات کے مختلف جوابات سامنے آتے ہیں جن کو جمع کرنا اور موازنہ کرنے سے دلچسپ صورتحال سامنے آتی ہے۔ ان تین سوالوں کا ذکر پھر کبھی، آج آپ کو میں اس حوالے سے ایک نوجوان کی کہی ہوئی بات سنانا چاہوں گا۔ یہ ذہین نوجوان اسکالرشپ پر امریکا گیا تھا اور اس نے سات ہزار طلبہ میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے خود کو اس وظیفے کا حقدار ٹھہرایا تھا۔ بندہ نے اس سے پوچھا: ''کبھی کسی یہودی سے ملاقات رہی؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں! میرا ایک کلاس فیلو یہودی میرا اچھا خاصا دوست بن گیا تھا۔ اس کا خیال تھا مجھے اس پر تعجب ہوگا اور میں بے ساختہ پوچھوں گا: یہودی اور دوست؟ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں یہودیوں کی نفسیات کو جانتا تھا کہ نجی زندگی میں یہ بہترین کاروباری، اور بہترین معاملہ کار ہوتے ہیں نیز یہ مزاجاً اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ اندر سے ''بوائل'' ہو رہے ہوں پھر بھی چہرے پر ''سمائل'' سجائے رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے مہمان نے خود ہی کہا: ایک مرتبہ میں نے اپنے یہودی کلاس فیلو سے تعجب کا اظہار کیا کہ ایک مسلمان وہ بھی پاکستانی، اس سے دوستی چہ معنی دارد؟ اس پر یہودی زور سے ہنسا۔ اس کی ہنسی اس طرح کی تھی جیسے مزے لے رہا ہو۔ پھر اس نے کہا: تم میں اور ہم میں تو فرق ہے۔ تم

مسلمان انفرادی طور پر ہمارے سخت دشمن ہو لیکن اجتماعی طور پر ہماری وفاداری کا دم بھرنے میں تم سے آگے کوئی نہیں۔ہم یہودی اجتماعی طور پر تمہارے بدترین دشمن ہیں لیکن انفرادی طور پر تم ہمیں بہترین دوست پاؤ گے''۔

قارئین محترم! اس ایک جملے میں یہودی صاحب نے اپنی نفسیات اور طریق کار سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہودی دنیا میں کہیں بھی ہو، نجی طور پر وہ کیسا ہی ہو، لیکن ایک لمحے کے لیے اجتماعی ذمہ داری سے غافل نہیں رہتا۔ نہ اسے یہ بھولتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کا فرد ہے جس نے چار ہزار سالہ ذلت آمیز اخراج کے بعد ''وعدے کی سرزمین'' (یعنی فلسطین جسے یہودی ''میراث کا ملک'' بھی کہتے ہیں) میں واپسی کی ٹھانی ہے اور وہاں کے باشندوں کو وہاں سے بالجبر نکال کر اپنی بستیاں بسا رہی ہے لہٰذا اس ظلم پر پردہ ڈالنے میں اسے بھی حصہ ادا کرنا چاہیے۔ اس اجتماعی ظلم عظیم میں جس نے لاکھوں فلسطینی مسلمانوں کو بے گھر کر دیا ہے، ہر یہودی اپنی شرکت لازمی سمجھتا ہے لیکن آس پڑوس کے مسلمانوں سے اس کا سلوک مثالی ہوگا۔ جبکہ اس کے برعکس فلسطین کے حالات سے باخبر اکثر مسلمان یہودیوں کے حوالے سے غم وغصے کے جذبات رکھتے ہیں لیکن اجتماعی طور پر یہودیوں کا دست بازو بننے والوں میں آپ کو پیش پیش مسلمان ہی نظر آئیں گے۔

فلسطین سے زیادہ اس کی واضح مثال اور کون سی ہوگی؟ ''اسرائیل مردہ باد'' اور ''القدس کی آزادی تک جنگ رہے گی'' جیسے نعرے لگانے والے بہت ہیں لیکن اس وقت جبکہ حماس کو اس کی اسلامیت پسندی کی سزا دی جا رہی ہے اور فلسطینی مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے، پوری دنیا میں کون ہے جو اہل فلسطین کو اس جاں کنی کے عالم سے نکلنے میں مدد دینے کے لیے آگے آیا ہو؟ ایسی المناک صورتحال میں مسلمان عوام کی طرف سے انفرادی طور پر اپنے فلسطینی بھائیوں کے ساتھ امداد کے بہترین جذبات میں کمی نہیں پائی جاتی، مسلم عوام کا کمال یہ ہے کہ وہ انفرادی کوتاہیوں کے باوجود باطل سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں۔ مشکل ان حکمرانوں کی وجہ سے پیش آتی ہے جن کے ہاتھ میں اس وقت عالم اسلام کی لگام ہے اور وہ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی بجائے مغرب کے وفادار اور اطاعت گزار ہیں۔ مغربی دنیا گزشتہ صدی

سے اس بات کے لیے کوشاں رہی ہے کہ اسے عالم اسلام میں ایسے حکمران میسر آ جائیں جو عوامی سطح پر مسلمانوں میں مقبول ہوں لیکن حب الوطنی اور ملیّ وفاداری سے عاری ہوں۔ بظاہر ملک وملت کے خیر خواہ ہوں لیکن کریں وہ کچھ جو مغرب کے حق میں جاتا ہو۔حماس کی شاندار کامیابی کے بعد اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے جانبدارانہ اور وحشیانہ سلوک پر پورے عالم اسلام کی خاموشی کی آپ اور کیا توجیہ کریں گے؟

یہاں پہنچ کر میں امت کے اہل علم ودانش سے عاجزانہ درخواست کروں گا کہ خدارا مغربی افکار ونظریات سے مغربی تہذیب وتمدن کو گہرائی سے سمجھیں۔ سرسری مطالعہ کر کے اس کے گرویدہ نہ ہو جائیں بلکہ اس کی حقیقت تک رسائی کی کوشش کریں۔ الجزائر کے بعد فلسطین دوسری مثال ہے جہاں مغرب کی نام نہاد روایات کا دوغلا پن اور اخلاقی اصولوں کا کھوکھلا پن ہمارے سامنے آ رہا ہے لیکن ہم اس کی اخلاقیات اور اصول پسندی کے گن گائے نہیں تھکتے۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کا عذر امریکا کی یہودی وزیر خارجہ میڈیمین البرائٹ (گولڈا میئر کے بعد یہ دوسری خاتون ہے جس کی یہودی کے لیے خدمات کا جائزہ لیا جائے تو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا) نے یہ بیان دیا تھا کہ ''امریکا ایسی حکومت کو تسلیم نہیں کر سکتا جو جمہوری اصولوں کے بغیر قائم ہوئی ہو۔'' یار لوگوں نے اس کو جمہوریت پسندی پر محمول کیا تھا۔ لیکن اب حماس کے اسی اصول پر حکومت حاصل کرنے کے بعد جمہوریت پسندی کیوں پامال ہو رہی ہے؟ اس کا جواب اب یہ خاتون یا ان کا کوئی جانشین نہ دے سکے گا۔ اس کے لیے ہمیں مغرب کے طریق کار پر غور کرنا ہوگا۔ مضمون طویل ہو رہا لیکن چند ایک باتیں خدارا غور سے سنیے!

عالم اسلام کی امنگوں کو سرد کرنے اور اسے کنٹرول کرنے کے لیے مغرب نے مختلف طرح کے حربے اپنا رکھے ہیں، مغربی ایشیا، مصر، الجزائر، تیونس، مراکش، انڈونیشیا کے حکمرانوں کی تدبیریں اس کی مثالیں ہیں، تاہم اسلام کو محدود کرنے کی ایک اہم کوشش وہ ہے جو وسطی ایشیا کے نو آزاد مسلم ملکوں ازبکستان، ترکمانستان، قازقستان، تاجکستان، کرغیزستان اور آزربائجان میں یہودیوں اور سابق کمیونسٹوں کی مدد سے کی گئی تھی۔

عالم اسلام میں اسلامی قوتوں کو دبانے کی کوششیں عموماً تین طرح کی ہوتی ہیں (۱) Neutralisation یعنی انہیں بے اثر بنانا (۲) Containment یعنی ان کی قوت واثر کو محدود اور کمزور کرنا اور (۳) Marginalisation یعنی انہیں دھکیل کر کنارے کر دینا۔ان تینوں طریقوں پر تفصیلی گفتگو ایک مستقل موضوع کا تقاضا کرتی ہے، اس لیے یہ پھر کبھی صحیح ،سرِ دست ہم ان عمومی طریقوں میں سے تیسرے طریقے پر بحث کریں گے۔

Marginalisation کا مطلب ہے کسی کا کلی مقاطعہ کر کے اس کا ناطقہ بند کر دیا جائے۔ جب کوئی قوم یا ملک یا گروہ باوجود دباؤ اور دھمکیوں کے نفاذِ اسلامی سے باز نہ آئے اور باضابطہ اور عملاً اس سمت پیش قدمی کرنا شروع کر دے تو مغرب اس کا مقاطعہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ مقاطعہ بالواسطہ، بلاواسطہ، علانیہ اور خفیہ ہر قسم کا ہوسکتا ہے۔ وہ تمام انسانی اور بین الاقوامی حقوق جن کا وہ حقدار ہوتا ہے اور وہ تمام مراعات جن کا وہ مستحق ہوتا ہے اس کے لیے ممنوع قرار دے دیے جاتے ہیں۔کبھی یہ مقاطعہ مغربی ممالک فرداً فرداً کرتے ہیں،کبھی بعض بڑے ممالک یا خود سب کا سربراہ امریکا کر دیتا ہے اور کبھی یہی کام سلامتی کونسل سے کروایا جاتا ہے۔کوشش دراصل اس بات کی ہوتی ہے کہ اس قوم کی زندگی دوبھر کر دی جائے اسے عملاً اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے۔ کسے علم نہیں کہ افغانستان کے وہ مجاہدین جو حقیقی اسلامی روح سے سرشار تھے اور جن میں آیندہ کے افغانستان کو صحیح اسلامی خطوط پر لے جانے کی صلاحیت موجود تھی۔مغرب کی اسی ضرب کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب تک نجیب اللہ کی حکومت رہی مغرب اسے بچانے کے درپے رہا۔ جب وہ باقی نہ رہی تو مغربی اقوام اس بات کی کوشش میں رہے کہ مجاہدین میں مقاطعہ ہو وہ لوگ اقتدار میں آجائیں جو سیاسی سوجھ بوجھ کے حامل ہیں اور بیدار مغز ہیں۔ پھر جب طالبان اقتدار میں آ گئے تو ان کا کیسا مقاطعہ ہوا؟ جو کچھ افغانستان میں ہو رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب اس کی جی توڑ کوشش کر رہا ہے کہ خواہ کوئی برسرِ اقتدار آجائے مگر طالبان کو زمام کار نہ ملے۔

یہی کچھ سلوک سوڈان کے ساتھ روا رکھا گیا۔اسلامی انقلاب کے آنے سے قبل سوڈان کو

مختلف قسم کی مدد دی جاتی تھی۔ ملک میں کئی رفاہی ادارے جو بین الاقوامی رفاہی اور امدادی اداروں کی شاخیں تھیں کام کرتے تھے۔ بعض مغربی ادارے اپنے طور پر بھی مدد دیا کرتے تھے۔ لیکن انقلاب کے آتے ہی تمام ملکوں اور اداروں نے ہاتھ کھینچ لیے۔ ساری امداد بند کردی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض عالمی اداروں اور ملکوں نے سوڈان پر پابندیاں لگانی شروع کردیے۔ عالمی بینک World Bank نے شرح سود میں اضافہ کردیا۔ عالمی مالی فنڈ IMF نے سوڈان کی رکنیت معطل کردی۔ حد تو یہ ہے کہ مغربی ملکوں نے بعض امیر مسلم ملکوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ سوڈان کی مدد سے دست کش ہوجائیں۔ چنانچہ نہایت نازک دنوں میں ایک نہایت امیر مسلم ملک نے سوڈان اور افغان مجاہدین کی امداد بند کردی۔

مذکورہ تینوں طریقوں سے ہٹ کر ایک صورت Aggressive Neutralisation کہلاتی ہے۔ یعنی غیر معمولی طریقے سے باضابطہ حملہ آور ہوکر اسلامی نظام یا اسلامی ملکوں کی اس قوت کو ختم کردینا جو مستقبل قریب یا بعید میں بالواسطہ یا بلاواسطہ نفاذ اسلام کی راہ میں اور باطل سے مقابلہ آرائی میں سرگرم ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

ایسی ہی ایک کوشش ۱۹۹۲ء میں لائے گئے تاجکستان کے انقلاب کے خلاف کی گئی، تاجکستان میں حزب النہضۃ نے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے کمیونسٹ حکمرانوں کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کیا مگر یہودیوں اور سابق کمیونسٹوں نے نہ صرف یہ کہ کے جی بی K.G.B کی مدد سے اسلامی قوتوں کا تختہ پلٹ دیا بلکہ پورے ملک میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کردیا۔ ہزاروں افراد شہید ہوئے اور کئی لاکھ کو افغانستان میں پناہ لینی پڑی۔

عالم اسلام کے پاس دنیا کے بہترین وسائل اور امکانات موجود ہیں۔ Geo Politics کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ کو وہ تمام نعمتیں دے دی ہیں کہ جن سے کوئی قوم سرخرو ہوسکتی ہے۔ شاید اُمت محمدیہ مستجابہ کو جو چنا ہوا قرار دیا گیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔ آخرت میں جو انعامات ان شاء اللہ ملیں گے وہ اس سے الگ ہیں۔ Geo Politics کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کئی امور اہم نظر آتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے اس امت کو اور اس کے حرم کو اس حصے میں آباد کیا جو معتدل ترین شمار ہوتا ہے۔ یہی علاقہ گرم پانی کا منطقہ یعنی Warm Water Belt بھی کہلاتا ہے:

(۲) دنیا کی تمام آبی گزرگاہیں بھی اسی علاقے میں ہیں۔

(۳) یہ علاقہ انسانی وسائل سے بھی مالا مال ہے۔

(۴) یہی خطہ خام مال اور توانائی کے خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔

شاید یہی سبب ہے کہ اس علاقے میں بے شمار جلیل القدر انبیاء آئے اور یہاں کی تاریخ معرکۂ خیر وشر سے کبھی خالی نہیں رہی۔

بات دوسری طرف نکل رہی ہے۔ ہم پھر اصل مضمون کی طرف لوٹتے ہیں وہ یہ کہ مغرب اسلام سے ایک ایسی جنگ لڑ رہا ہے جسے موت وحیات کی جنگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہمارے مادی وسائل اور قدرتی گزرگاہوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے لیکن ہم اللہ کی ذات اور اس کی رحمت سے اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اہل ایمان کو فتح وکامیابی سے سرخرو فرمائے گا۔ اسلام اور مغرب کی کشمکش کا نتیجہ ان شاء اللہ باطل کی شکست کی صورت میں نکلے گا۔

مغرب کی پشت پناہی سے فائدہ اُٹھا کر یہود جتنا بھی ظلم ڈھالیں اور مسلمان اس پر خاموش رہ کر ارض مقدس سے بے وفائی کا عذاب جتنا بھی سمیٹ لیں، یہ بات طے شدہ ہے کہ یہود کو اس دجّال نوازی کا حساب یہیں دینا ہوگا۔ آخری عدالت سے پہلے ایک عدالت سرزمین القدس پر لگے گی اور یہود نامی ہر چیز کو پتھروں اور درختوں کے پیچھے سے نکال نکال کر ٹپخ مارے گی۔ یہ بات پتھر پر لکھی حقیقت سے زیادہ پکی اور سچی ہے۔ فلسطینی مسلمانوں اور دنیا بھر سے یہودیوں کے معرکے کا انجام یہی ہونا ہے۔ لمحۂ فکریہ تو ان اہل اسلام کے لیے ہے جو حق و باطل کے اس عظیم معرکے میں دور کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کو القدس پر قربان ہوتے دیکھ کر بھی وہ یہ سمجھنے پر تیار نہیں کہ یہ قربانیاں درحقیقت تمام مسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ ہیں اور جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی اس سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے مگر اس نے اپنی اس شقاوت قلبی سے توبہ نہ کی تو یہودیوں اور یہود نوازوں پر برسنے والا کوڑا اس کی پیٹھ پر بھی برس کر رہے گا۔

قیامت کے سائے

اور بالآخر اس قیامت نے اپنے سائے پھیلانے شروع کر دیے ہیں جو سرزمین شام پر ۱۹۴۷ء سے منڈلا رہی تھی۔ (شام کسی زمانے میں ان چار علاقوں کا نام ہوا کرتا تھا: شام، اُردن، لبنان اور فلسطین۔ احادیث مبارکہ میں جب اس علاقے کے متعلق کوئی پیش گوئی وارد ہو یا تاریخ کی کتابوں میں شام کا لفظ آئے تو اس سے ان چار ملکوں پر مشتمل پورا علاقہ مراد ہوتا ہے جو کسی وقت چار صوبے ہوا کرتے تھے۔ اسرائیل کے جنونی صہیونی حکمران بھی اس پورے علاقے کو اپنا وراثتی ملک سمجھتے ہیں اور شام واُردن کے عیش پسند اور غیرت وحمیت سے محروم حکمران اپنی ذمہ داریوں سے جتنا بھی نظریں چرائیں اور چند دنوں تک جان بچے رہنے کے لیے جتنی بھی خوشامد کریں، یاد رکھیں کہ یہودی بیویاں گھر میں رکھ کر نیم عیسائی نیم یہودی نسل زیادہ دنوں تک نہ جنم دے سکیں گے، عنقریب صہیونیت کی خون آشام یلغار کا رُخ ان کی طرف ہونے والا ہے) اس قیامت کا آغاز درحقیقت آج سے ۹۰ سال قبل ۱۹۲۳ء میں اس وقت ہوگیا تھا جب ترکی میں Treaty of Versaille کے تحت خلافتِ عثمانیہ ختم کر کے جمہوریت قائم کردی گئی تھی (جمہوریت کے ایجادِ باطل ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ خلافت کے مقابلے میں وضع کی گئی ہے) اور خلافت کے زیرِ انتظام علاقوں پر لیگ آف نیشنز کے ''انتداب'' کا اعلان کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۰ء تک اُمت مسلمہ پر تین قیامتیں ٹوٹیں۔ ان میں سے ہر ایک قیامت دوسری کا راستہ ہموار کرتی رہی لیکن چونکہ اُمت کے مقتدر طبقے نے اس کا نوٹس نہ لیا بلکہ ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تو ایک حادثہ عظمیٰ کے بعد

دوسری قیامت عظمیٰ ٹوٹ ٹوٹ کر برستی رہی۔

☆ پہلی قیامت کی نقشہ کشی یوں ہوئی کہ صہیونی منصوبہ سازوں کو خلافت کی اہمیت کا علم تھا کہ درحقیقت وہ روئے زمین پر اللہ کی بادشاہی کے قیام کی ضامن ہوتی ہے جبکہ وہ ابلیس کی مدد سے دجّال کی بادشاہی کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے برطانیہ اور فرانس کے توسط سے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی کہ کوئی آزاد یا نیم آزاد مسلم ممالک عثمانی خلیفہ کو اپنے ہاں پناہ دے نہ ہی اپنے یہاں آنے اور نظام خلافت کو زندہ کرنے کی کوئی صورت بننے دے۔ عثمانی خلیفہ نے یہ کوشش کی کہ اگر کوئی مسلم ملک انہیں اپنے پاس پناہ دینے اور نظمِ خلافت کے احیا کی اجازت نہیں دیتا تو کم از کم یہ صورت پیدا ہوجائے کہ وہ سرزمین حجاز جاکر حرمین شریفین میں پناہ گزین ہوجائیں لیکن پہلے برطانیہ کے بدنام ترین ایجنٹ شریف مکہ نے (جو اُردن کے موجودہ حکمران کا پردادا تھا) اور پھر اس کے بعد ان کی جگہ لینے والے شاہ عبدالعزیز بن آل سعود نے انہیں اس کی بھی اجازت نہ دی کیونکہ اس سے اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی تھی جو خلافتِ عثمانیہ کو حرمین کی خدمت کے اعزاز سے محروم کرنے اور نجد وحجاز کو آل سعود کے سپرد کرنے کے حوالہ سے برطانیہ اور آل سعود کے درمیان ہوا تھا۔

خلافتِ عثمانیہ کا احیا جب ممکن نہ ہوا اور اس کا سقوط زمینی حقیقت سمجھا جانے لگا (آخری عثمانی خلیفہ کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ہوا جبکہ سقوط خلافت کا سانحۂ عظمیٰ ۱۹۲۳ء میں ہوا تھا۔ بیچ کے پندرہ سال فری میسن تحریک اور احیائے خلافت کی تحریک کے درمیان زبردست کشمکش رہی) تو اُمت مسلمہ کے صالح طبقے نے کوشش کی کہ کم از کم کوئی دوسری خلافت قائم ہوجائے لیکن International Zionist Plam (عالمی صہیونی منصوبہ) ترتیب دینے والوں نے خلافت اسلامیہ کو زندہ نہ ہونے دیا اور اس کے لیے کی جانے والی ہر کوشش پر گہری نظر رکھ کر اس کو ناکام بنانے کی بھرپور جدوجہد کی۔ یہ سلسلہ آج تک...... طالبان کی امارت اسلامیہ کے سقوط تک...... جاری ہے۔ انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں عرب وعجم کے علما ومشائخ اور مجاہدین سرتوڑ کوشش کررہے تھے کہ کسی طرح خلافت قائم ہوجائے اور اس کے

جھنڈے تلے مسلمانوں کو سایۂ عافیت نصیب ہو جائے لیکن تین شخصیتوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ ان میں سے دو کا کردار مثبت نما تھا اور ایک کا منفی نما۔ شریف مکہ اور آغا خان سوم مثبت قسم کی منفی کوششیں کر رہے تھے یعنی یہ کہ خلافت قائم ہو جائے لیکن خلیفہ وہ خود ہوں اور شاہ عبدالعزیز کی کوشش تھی کہ خلافت سرے سے قائم ہی نہ ہو۔ ان کے مطابق اس کی کوئی ضرورت ہی نہ کل تھی اور نہ آج۔ عالمی فری میسن کی پشت پناہی میں کی جانے والی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی بازیافت کی کوششیں ناکام ہوگئیں اور اس ناکامی میں جن جن کا حصہ تھا ان میں سے شریف مکہ کی اولاد ''المملکۃ الأردنیۃ الإسلامیۃ الهاشمیۃ'' کی سربراہ ہے اور شاہ عبدالعزیز کے وارث ''جلالۃ الملک وخادم الحرمین الشریفین'' ہیں۔ رہے آغا خان تو وہ ماشاء اللہ کل ''حاضر امام زمان'' تھے اور آج تو وہ ''خدا کا اوتار'' ہیں۔

☆ اُمت مسلمہ پر دوسری قیامت اس وقت ٹوٹی جب ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو روئے ارض کے خطۂ فلسطین میں ''اسرائیل'' کا قیام عمل میں آیا۔ ''اسرائیل'' کا روئے ارض اور وہ بھی ارض فلسطین میں قیام دراصل روئے ارض پر ''ابلیس اور دجّال کے ملک اور اتھارٹی'' کی عبوری نہیں بلکہ حقیقی اقامت تھا۔ یہ کسی خطے میں کسی قوم کا بسایا جانا نہ تھا، یہ ارض فلسطین میں بنی اسرائیل کی واپسی کا نقشہ بھی نہیں تھا، بلکہ روئے ارض پر ''خلافتِ اسلامیہ'' اور ''ملک اللہ'' کے باضابطہ خاتمے کے بعد ابلیس اور دجّال کے ملک کا باضابطہ قیام تھا۔

۱۹۴۸ء میں روئے ارض ''اسرائیل'' نام کی ''ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی'' کے باضابطہ قیام سے لے کر آج تک پوری دنیا میں عام طور پر چار طرح کے مسلم ممالک پائے جاتے ہیں۔

(۱) ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی کے قیام میں مدد کرنے والے ممالک۔

(۲) ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی کے قیام کے بعد اسے تسلیم کر لینے والے ممالک۔

(۳) ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی کے قیام کے بعد اسے خفیہ طور پر تسلیم کر لینے والے ممالک۔

(۴) ابلیس اور دجّال کی اتھارٹی کو خفیہ اور علانیہ ہر دو صورت میں تسلیم نہ کرنے والے یا تسلیم کر لینے کے بعد دوبارہ انکار کر دینے والے ممالک۔ یہ چوتھی قسم بہت کم ہے اور یہی وہ قسم

جو خدا اور رسول کی علانیہ بغاوت سے تا حال بچی ہوئی ہے۔

اس ابلیسی اور دجالی ''اتھارٹی'' نے اپنے قیام کے بعد اپنی قوت کو توسیع دیتے ہوئے ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر بھی قبضہ کرلیا اور مسجدِ اقصیٰ اور گنبدِ صخرہ پر عملاً ان کا اقتدار قائم ہوگیا۔ یہ دوسری قیامت کا نکتہ عروج تھا لیکن افسوس کہ مسلم اُمہ کی اکثریت اس معاملے کی سنگینی سے بے خبر رہی۔

☆ اُمت مسلمہ پر تیسری قیامت اس وقت ٹوٹی جب چار اگست ۱۹۹۰ء کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس سرزمین کے ایک حصے پر ''بالفعل'' دجالی طاقت کا قبضہ ہوگیا اور امریکی، برطانوی، فرانسیسی، آسٹریلوی فوجیں ''جزیرۃ العرب'' میں ہزاروں کی تعداد میں آکر جاگزیں ہوگئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سانحہ کے بعد یہ وہ سب سے بڑا سانحہ ہے جو اُمت کو پیش آیا۔ یہود و نصاریٰ کو یہاں آنے کی اجازت دے کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس میثاق کی تکمیل کی تھی اور جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مزید آگے بڑھایا اور استحکام بخشا تھا اور جس میثاق کو پورا کرنے اور قائم رکھنے کی قیامت تک اُمت مسلمہ محمدیہ ذمہ دار ہے، اس میثاق کو توڑ دیا گیا اور جب تک یہ ٹوٹا رہے گا ہماری حیثیت غداروں اور عہد شکنوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس میثاق کی ایک شق تھی: ''اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب'' (یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دو) ۱۹۹۰ء میں اس میثاق کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے دجالی قوتوں کو جزیرۃ العرب میں داخل ہونے دیا گیا اور اب جبکہ لبنان اور فلسطین میں دجال کے ہرکاروں نے قہر برپا کیا ہوا ہے، سعودی عرب ..... جس پر اس قضیے میں مظلوم مسلمانوں کی مدد کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے ..... نے اپنے نصاب میں تبدیلی کا اعلان کر کے اس المناک وقت میں دین کا ایک اور ستون گرا دیا ہے۔ اس اعلان کے مطابق وہ تمام آیات اور احادیث سعودیہ کے نصاب سے خارج کر دی جائیں گی جن میں اوپر ذکر کی گئی حدیث شریف کا مفہوم یا یہود و نصاریٰ کے خلاف کسی طرح کا مواد پایا جاتا ہو۔

جب کویت پر قبضہ کے بہانے یہودی، صیہونی اور دجالی فوجیں جزیرۃ العرب میں بالفعل

داخل ہوکر قابض ہوگئیں تو اپنی بے بسی اور مجبوریوں کے تحت سعودی حکمران اس آمد اور قبضہ کو اپنی جانب سے ''طلب کردہ مدد'' قرار دے رہے تھے لیکن اس سے بھی زیادہ عبرت ناک صورتِ حال یہ تھی کہ اس وقت کچھ علمائے سوء ایسے بھی تھے اور آج بھی ہیں جو قرآن واحادیث مبارکہ، اجماعِ امت اور تعاملِ اُمت سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جزیرۃ العرب میں یہود ونصاریٰ کے لانے کے حق میں دلائل فراہم کرر ہے تھے۔ غالبًا ایسا کر کے وہ اپنے خیال میں ''حرمین'' کی حفاظت کو یقینی بنا رہے تھے۔

ہماری جہالت وحماقت ہے کہ اسرائیل جب کسی فریق سے لڑتا ہے تو ہم اسے زمین کے ایک خطہ کی لڑائی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ زمین کی لڑائی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو ایمان وعقیدہ اور نظریہ کی جنگ ہے۔ یہ معرکۂ دجّال ہے۔ یہ ''جنگِ عظیم سوم'' (آرمیگاڈون، ہرمجدون) کا نقطۂ انفجار ہے۔ یہ ابلیس اور اس کے ہمنواؤں کا ''دجّال اکبر'' کے خروج کی شدید خواہش کا اظہار ہے۔ یہ سارے مل کر ابلیسی منصوبہ کو پورا کرنا چاہتے ہیں جبکہ اُمت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ربانی منصوبہ کو پورا کرے۔ یہ ہمارا اللہ سے کیا گیا وہ عہد ہے جس کے صلے میں ہمیں ''اُمت مجتبیٰ'' (منتخب اُمت) قرار دیا گیا تھا۔ اس میثاق کا مطلب ہے کہ روئے ارض پر ''ملک اللہ'' (اللہ رب العالمین کی بادشاہی) قائم کی جائے۔ جب تک اُمت اس جدوجہد میں لگی رہے گی وہ ''اجتبائیت'' کے مقام پر فائز رہے گی اور جب وہ اس جدوجہد سے دستبردار ہوجاتی ہے تو اس مقام اور اعزاز سے محروم کردی جاتی ہے اور پھر وہ ذلت وخواری اس کا مقدر ہوجاتی ہے جس کی دائمی اور ابدی مہر یہود پر لگ چکی ہے۔ عرب کے مالدار حکمران ہوں یا خوف سے تھرتھراتے عجم کے صاحبانِ اقتدار، اگر اسرائیل کے مقابلے میں مظلوم مسلمانوں کے حق میں زبان نہیں کھولتے تو انہیں چوتھی قیامت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ فیصلہ کن ہوگی اور دنیا کے وہ حقیر مزے جن کی خاطر انہوں نے زبان بند رکھی، ان سے چھین کر انہیں ابدی عذاب میں جکڑ لے گی۔ اس سے فقط وہی بچے گا جو آج فلسطین ولبنان کے مسلمانوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف، ان کے غم کو اپنا غم اور ان کے درد کو اپنا درد سمجھتا ہے۔ دنیا مانے یا نہ مانے! فتح بالآخر انہی نہتے اور

لاچار مسلمانوں کی ہونی ہے جو دجالی ٹینک کے مقابلے میں داؤ دی پتھر لیے میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ بس یہ ایمان والوں کا امتحان ہے کہ کون اپنے جذبات اور عمل کا رُخ کس طرف موڑے رکھتا ہے؟؟؟

اس خبر میں ''عدمِ رواداری'' سے مراد وہ آیات، احادیث اور واقعات ہیں جن میں یہود کی اہلِ اسلام سے غداری اور جزیرۃ العرب سے ان کی بے دخلی کا تذکرہ ہے۔ اس طرح کی ''اصلاحات'' آہستہ آہستہ سعودی عرب کو غیر ملکی افواج کے مقابلے میں مفلوج و بے بس کر چھوڑیں گی۔

ستم گروں کو کون سمجھائے؟

اسکول سے واپسی کے بعد دنیا میں اس کا ایک ہی شوق تھا۔ وہ بستہ رکھ کر کھانا کھاتا، آرام کرتا اور پھر کھرپی اور قینچی اُٹھا کر مکان کے پچھواڑے چل دیتا جہاں دنیا کا واحد شوق اس کا منتظر ہوتا۔

اس نے چھوٹے سے باغیچے میں کئی طرح کی کیاریاں بنا رکھی تھیں اور بساط بھر کوشش کی تھی کہ مقامی طور پر دستیاب تمام پودے اس کی ''نرسری'' میں موجود ہوں۔ وہ بھی جو اس نے دوستوں سے تبادلے میں جمع کیے اور وہ بھی جو اس نے پھولوں کی نمائش سے خریدے...... اگرچہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے کئی دن والدین کو منانے میں لگ گئے تھے۔

اس کی کُل کائنات یہ باغیچہ تھا۔ جنوبی لبنان کے سرحدی قصبے کی زرخیز زمین میں قائم یہ باغیچہ قسما قسم پھولوں اور پودوں سے اَٹا ہوا تھا۔ حسنِ ذوق اور حسنِ ترتیب کی اعلیٰ کوششوں پر مشتمل اس نمونہ کو جو بھی دیکھتا، ہشام العدوی نامی اس بچے کی محنت کی داد دیے بغیر نہ رہتا۔

اس کے والدین اور اساتذہ بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اس صحت مند سرگرمی کی راہ میں آڑے نہ آتے تھے.....اور پھر وہ خونیں دن آ گیا جب اس معصوم بچے نے کھرپی رکھ کر بندوق اُٹھالی اور پھولوں کی کیاریاں سینچنے کی بجائے آگ اور شعلوں سے کھیلنے کا مشغلہ اپنالیا۔

ہوا یوں کہ ہشام ایک دن بیمار تھا، وہ اسکول نہ جاسکا۔ اگلے دن اس کو بخار نے ایسا نڈھال کیا کہ وہ بستر سے لگ کر رہ گیا۔ اس نے کوشش کی کہ باغیچے سے ایک مرتبہ ہوآئے لیکن اس کا اَنگ اَنگ دُکھ رہا تھا۔ باوجود کوشش کے اس سے اُٹھا نہ گیا۔

اس کو غم تھا کہ پودے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پھول اس سے سرگوشیاں کرنے کو

بیتاب ہوں گے۔ ننھی کونپلیں اس کے قدموں کی آہٹ نہ سن کر پریشان ہوں گی۔

اس کے والد سے اس کی بے چینی دیکھی نہ گئی۔

اس نے ہشام کی کھرپی اُٹھائی اور اس کو اطمینان دلایا کہ تمہاری جگہ میں تمہارے ''دوستوں'' سے مل آتا ہوں۔

ہشام نے اپنی کھرپی والد کے ہاتھ میں دیکھی تو اس کو سکون آ گیا۔ اس نے تکیہ پر سر کو ڈھیلا چھوڑا اور آنکھیں موند لیں لیکن اس کو خبر نہ تھی کہ یہ اطمینان کی آخری نیند ہے۔

آج کے بعد اس کو نیند بھی آئے گی تو وہ شعلوں میں لپٹی ہوگی۔ پھولوں کی خوشبو کی بجائے بارود کی بو اور خون کی خنک اس کا شوق ہوگی۔ وہ سونے کی بجائے سونے والوں کو جھنجھوڑے گا اور انہیں ایک مقصد دے گا۔ وہ پھلواریاں اُگانے کی بجائے مذہب و وطن کے دفاع کے لیے صبح و شام برسرِ پیکار ہوگا۔

ہشام کی بیماری سے پہلے سرحد کے حالات خراب ہو گئے تھے۔ اکا دکا جھڑپوں کی اطلاعات تھیں۔ کبھی کبھار گولوں کے دھماکے بھی سنائی دیتے تھے۔ ہشام کی بیماری تک حالات مزید دگرگوں ہو گئے تھے اور اسرائیلی فوج کے حملوں کی افواہیں قصبے کے ہر باشندے کی زبان پر تھیں۔

جب اس کے والد کھرپی اُٹھا کر باہر نکلے تو اس کی اماں جان باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھیں۔ ابھی انہیں گئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی اور پھر پے در پے گولے برسنے شروع ہو گئے۔

پہلا دھماکا تو ایسا لگتا تھا کہ ان کا گھر اُڑا چھوڑے گا۔ ہشام اُچھل کر بستر سے گرا اور پھر اُٹھتے ہی باغیچے کی طرف بھاگا۔

اس کے والد خون میں لت پت ایک کیاری کے قریب پڑے ہوئے تھے۔ کھرپی ان کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور اسرائیلی گولے نے ان کو اتنا شدید زخمی کر دیا تھا کہ وہ دم پر تھے۔

ہشام کی ماں نے ان کا سر اُٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ ہشام ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ بارود بھرے گولے نے اس کا خوبصورت باغیچہ ہی تباہ نہ کیا تھا، اس کے

والد کی جان بھی لے لی تھی۔

وہ دردناک حالت میں جان دے رہے تھے اور ان کی یہ تکلیف دہ اور المناک کیفیت ہشام کے دماغ میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ جب انہوں نے آخری ہچکی لی تو ان کی آنکھیں ہشام کی کھرپی پر جمی ہوئی تھیں گویا کہہ رہی ہوں: ''بیٹا! میں نے تمہارا شوق پورا کرنے میں کوتاہی نہیں کی، تم میرا انتقام لینے میں کمزوری نہ دکھانا۔''

ہشام کی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں...... وہ معصوم سا لڑکا تھا...... لیکن اس دن وہ یکا یک اپنی عمر سے کئی سال آگے پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا خون اُترا کہ وہ انتقام کے علاوہ ہر چیز کو بھول گیا۔ اس کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے اور دماغ کے ہر خلیے ایک ہی صدا آ رہی تھی:

''انتقام، انتقام، انتقام......''

ہر اس پھول کا انتقام جسے عین بہار میں نوچا گیا۔

ہر اس کلی کا انتقام جسے بلاوجہ مسل ڈالا گیا۔

ان محترم بوڑھوں کا انتقام، موت کے وقت جن کی بےبس آنکھوں میں صرف انتقام کی تمنا تھی۔

ہر اس ماں بیٹی، بہن کا انتقام جسے بےعزت کیا گیا۔

ان بچوں، ضعیف العمر بزرگوں اور عورتوں کا انتقام جو بغیر کسی قصور کے صہیونی درندگی کا شکار ہوئے۔

ان بوڑھے ہاتھوں کا انتقام جنہوں نے مرتے دم بھی اپنے معصوم بچوں کی خواہش کے احترام میں کھرپی تھام رکھی تھی۔

اس دن سے ہشام سراپا انتقام بن گیا۔

اس نے سوچا: اگر میرے وطن کے نوجوانوں نے دفاع کی خاطر خون دینے اور لینے کا عہد نہ کیا تو:

خوب صورت پھلواریاں اسی طرح ویران ہوتی رہیں گی۔

قابلِ احترام بزرگیاں اسی طرح سسک سسک کر دم توڑیں گی۔

گھر اُجڑتے اور قبرستان آباد ہوتے رہیں گے۔

آزادی پامال اور عزتیں خراب کی جاتی رہیں گی۔

صہیونی دہشت گرد درندگی کا پیکر بن کر حملہ آور ہوں گے اور.....

کوئی بش صاحب ان کے لیے بموں اور میزائلوں کی کھیپ بھجوائیں گے۔

کوئی کونڈو صاحبہ آ کر ہمیں غیر مسلح کرنے کا مطالبہ کریں گی۔

عالمی برادری اسرائیل کو حملوں کی اجازت اور ہمیں ''دہشت گرد'' کا لقب دے گی۔

جب یہی ہونا ہے تو پھر......

کیوں نہ ہم سراپا آتش بن جائیں۔

وہ آگ جو انتقام کے بغیر ٹھنڈی نہیں ہوتی۔

وہ انتقام جو پورا ہوئے بغیر نہیں رُکتا۔

سو، اس دن سے اسرائیل کے دشمنوں میں ایک شعلہ صفت مجاہد کا اضافہ ہو گیا اور مجھے یقین ہے جب بھی اسرائیل کا گولہ کسی فلسطینی یا لبنانی مسلمان کے آنگن میں گرتا ہے تو ایک اور ہشام العدوی پیدا ہو جاتا ہے۔

معصوم بچے کھرپیاں رکھ کر کلاشن اُٹھا لیتے ہیں۔

پھولوں کی کیاریاں سینچنے کی بجائے آگ اور خون میں غوطہ زن تیراک بن جاتے ہیں۔

بے فکری کے مزے چھوڑ کر خود کش بمبار بن جاتے ہیں۔

عالمی برادری کو کون سمجھائے ''دہشت گرد'' کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

یہ ''دہشت گرد'' ان گولوں سے پیدا ہوتے ہیں جو کسی کا آنگن اُجاڑتے ہیں۔

یہ ان بموں اور میزائلوں سے جنم لیتے ہیں جو کسی معصوم شوق کا خون کرتے ہیں۔

اگر تمہیں امن چاہیے تو ستم گروں کو سمجھاؤ!

کسی کے ارمانوں کا خون نہ کریں .....

کسی کی آزادی پامال نہ کریں، عفت و عصمت سے نہ کھیلیں۔

محترم شخصیات اور مقدس مقامات کی توہین نہ کریں۔

ورنہ......

تم دہشت گردی، دہشت گردی پکارتے رہ جاؤ گے اور.....

ایک کے بعد ایک نامور دہشت گرد پیدا ہوتا رہے گا۔

زرقاوی، شامل، داداللہ اور عدوی جنم لیتے رہیں گے۔

اور غیرت و وفا کی تاریخ رقم کر کے امر ہوتے جائیں گے۔

آخری واپسی

محترم مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ آپ کی اور ''ضربِ مومن'' کی پوری ٹیم کی خیر وعافیت چاہتا ہے اور اللہ سے دُعا کرتا ہے کہ اللہ آپ کی عمر میں برکت کرے۔

بندہ ''بولتے نقشے'' نہایت غور سے پڑھتا ہے ''اقصیٰ کے آنسو'' از ''فلسطین کا ایک عاشق'' کے سلسلہ کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ جب یہ سلسلہ درمیان میں کافی عرصے تک منقطع ہو جاتا ہے تو یہ عرصہ بندہ کے لیے سوہانِ روح بنا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ارضِ فلسطین پر جو مضامین لکھ چکے اور لکھے جا رہے ہیں ان کو کتابی شکل دی جائے گی کہ نہیں؟

علاوہ ازیں چند سوالات جو بندہ کے ذہن میں ہر وقت گردش کرتے ہیں، انہی سوالات نے مجھے قلم اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔

ا...... یہودیوں کو کس طرح پتہ چلا کہ وہ اس ارضِ قدسی کے وارث ہیں؟

۲...... یہودی تو تورات پر یقین رکھتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی لیکن وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح بادشاہت چاہتے ہیں، آخر کیوں؟ ایسی عالمگیر بادشاہت کی چاہت ان میں کیونکر راسخ ہوگئی؟

۳...... یہودی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا گیا، عیسائی دنیا کا اس بارے میں کون سے عقیدے پر اعتقاد ہے؟ جبکہ ہم مسلمان تو آپ علیہ السلام کے

باحیات ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

۴......دجال کون ہے؟ پہلے پہل کون سے خطے پر نمودار ہوگا؟

۵......ایک اور بات یہ ہے کہ فزکس کے استاذ نے جب ہمیں آئن اسٹائن (جو کہ مذہبی لحاظ سے یہودی تھا) کے Special Theory of Relativity کے بارے میں بتایا کہ اس کا منبع شبِ معراج کا واقعہ ہے اور مزید استاذ نے بتایا کہ آئن اسٹائن نے کہا کوئی بھی مادی چیز Velocity of light (روشنی کی رفتار) سے تیز حرکت نہیں کرسکتی اور بقول استاذ ہمارے علمائے کرام یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روشنی کی رفتار سے بھی تیز اُٹھ کر چلے گئے تھے تو یہ کیا معمہ ہے؟ اس سلسلے میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔

والسلام

فخرالاسلام ورانوی خٹک

جواب:

۱......یوں کہیے کہ ان پر یہ وہم اور فاسد خیال کس طرح مسلط ہوا کہ اتنا دھتکارے جانے کے باوجود خود کو القدس جیسی مقدس سرزمین کا وارث سمجھتے ہیں؟ ہوا یوں کہ ان کے بڑوں کو اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں بسایا مگر انہوں نے اسے گناہوں سے بھر دیا۔ اس کی سزا میں ان پر ایک عراقی بادشاہ بخت نصر کو مسلط کیا گیا۔ اس نے ان کو بُری طرح پامال کیا اور لونڈی غلام بنا کر ساتھ عراق لے گیا۔ کافی عرصہ رونے دھونے اور توبہ تلافی کے بعد جب اس کی غلامی سے نکل کر واپس پہنچے تو کچھ عرصہ بعد پھر پرانی عادتیں لوٹ کر آگئیں اور سود، زنا، شراب، چوری، موسیقی جیسی حرکتوں میں گردن گردن دھنس گئے۔ ان کے انبیا ان کو سمجھاتے رہے مگر یہ مست سانڈ کی طرح گناہوں کی لذت میں ڈوب کر ان کی بے ادبی اور نافرمانی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو ان کم بختوں نے ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کو محض گناہوں پر ٹوکنے کی بنا پر پھانسی دینے کا منصوبہ بنایا اور اپنے تئیں دے بھی ڈالی، پھر اس سنگین حرکت پر نادم ہونے کی بجائے جشن بھی مناتے رہے۔ لہٰذا جب پیمانہ لبریز ہوگیا تو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے ستر سال بعد عذاب کا کوڑا پوری شدت سے برسا۔ ان پر رومی بادشاہ ٹائٹس مسلط ہوا جس نے ان کو بری طرح تباہ و برباد کیا۔ ہیکل سلیمانی ڈھادیا اور ان کو قتل و غارت کر کے یہاں سے نکال باہر کیا۔ یہ دنیا بھر میں تتر بتر ہو گئے۔ ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلت اور رسوائی کا ٹھپہ لگا دیا گیا۔ یہ لوگ دنیا میں یہاں وہاں ذلیل ہو کر وقت گزارنے لگے۔ ان کے جانے کے بعد عیسائیوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے ان سے چھڑا کر بیت المقدس فتح کر لیا۔ اس وقت سے فلسطین کی وراثت اور مسجدِ اقصیٰ کی تولیت مسلمانوں کے پاس ہے لیکن یہود کے دماغ سے خناس نکلا نہیں۔ یہ اپنے گناہوں سے توبہ کی بجائے اپنے بچوں کو یاد دلاتے رہے: ''اگلے سال یروشلم میں'' اس سے پہلے وہ دو مرتبہ یہاں سے دھتکارے جانے کے بعد واپس آئے تھے اور معافی تلافی کر کے آئے تھے اس لیے انہیں مہلت دے دی گئی لیکن اب کی مرتبہ تو وہ بدمعاشی اور غنڈہ گردی کرتے ہوئے آئے ہیں، اس لیے یہ ان کی آخری واپسی ہے۔ اس مرتبہ انہیں مہلت نہیں ملے گی۔ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے وقت انہوں نے انگریزوں کو رشوت دے کر یہ سرزمین لے لی اور فلسطینی مسلمانوں پر طاقت اور دولت کے بل بوتے پر ظلم و ستم ڈھا کر انہیں یہاں سے جلاوطن کر کے ان کی جگہ دنیا بھر سے یہودیوں کو لا لا کر بساتے رہے۔ ظلم و ستم کی یہ خونچکاں روداد ۱۹۱۷ء سے آج تک جاری ہے۔ اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک دنیا بھر کے خصوصاً پاکستان و افغانستان کے مسلمان فلسطینی بھائیوں کا ویسا ہی ساتھ نہیں دیتے جیسا دنیا بھر کے یہودی اسرائیلی یہودیوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔

ہم اس دور میں جی رہے ہیں جو اس اعتبار سے تاریخی عہد ہے کہ اس میں یہود کئی ہزار سال بعد بغیر توبہ کیے یہاں واپس آئے ہیں لہٰذا اب کہیں نہ جا سکیں گے، یہیں ختم ہوں گے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان یہ لوگ یہاں کی زمینیں مہنگے داموں خریدتے رہے۔ علمائے کرام منع فرماتے رہے کہ ان کو زمین کسی قیمت پر نہ بیچی جائے حتیٰ کہ ہندوستان میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے بھی فتویٰ منگوایا گیا جو امداد الفتاویٰ کی جلد سوم صفحہ ۵۹ پر درج

ہے لیکن دنیا پرستوں نے ان کی بات نہ سنی جیسا کہ آج کل سعودی عرب میں تبوک سے خیبر تک کے زمینی مالکان نہیں سن رہے اور جیسا کہ شمالی علاقہ جات میں مقامی لوگ آغا خان کو زمینیں بیچنے سے باز نہیں آرہے (اور اب باز آئیں بھی تو کیا؟) آخر کار ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ نے فلسطین کو مسلمانوں اور یہودیوں میں تقسیم کرنے کا نادر شاہی فیصلہ صادر کر دیا۔ اس فیصلے کے حق میں صرف تین ووٹ آئے تھے۔ شرط پورا کرنے کے لیے مزید تین ووٹ درکار تھے جو ہیٹی، فلپائن اور لائبیریا جیسے قلاش ملکوں پر دباؤ ڈال کر حاصل کیے گئے۔ اس جانبدارانہ تقسیم کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فی صد رقبہ صرف ۳۳ فی صد یہودیوں کو اور بقیہ ۴۵ فی صد رقبہ ۶۷ فی صد مسلمانوں کو دیا گیا حالانکہ اس وقت فلسطین کی زمین کا صرف ۶ فی صد حصہ یہودیوں کے قبضے میں تھا اور ان کا حقیقی تناسب ۳۳ فی صد بھی ہرگز نہ تھا۔ یہ تھا اقوامِ متحدہ کا انصاف!!! اور یہ تھا یہودیوں کا ''قومی وطن سے قومی ریاست تک'' کا سفر۔ اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ یہود کی طرح ان لوگوں کا انجام بھی انتہائی عبرت ناک ہوگا جو اس ظلم وستم پر بھی یہود کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ جب یہودی یہاں توبہ کر کے آئے تو بداعمالیوں پر نہ بخشے گئے، اب تو وہ دھوکا اور ظلم کے بل بوتے پر آئے ہیں اور ہر وقت یہاں اندھیر مچائے رکھتے ہیں تو کس طرح بخشے جا سکتے ہیں؟؟؟

جب ان کی حیثیت مستحکم ہوگئی اور انہوں نے فلسطین کی قابلِ ذکر زمین پر قبضہ کر لیا تو ۱۹۴۸ء میں اپنے مستقل ملک اسرائیل کا اعلان کر دیا۔ یہ ملک روئے زمین پر دجالی سلطنت قائم کیے جانے کی پہلی اینٹ تھا لیکن دنیا بھر کے مسلمانوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اسے فلسطینیوں اور عربوں کا مسئلہ سمجھتے رہے۔ یہود کی خفیہ سازشیں اور علانیہ پیش قدمی جاری رہی۔ یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھیلتے فلسطین کے دارالحکومت القدس تک جا پہنچے۔ جہاں مسجد اقصیٰ ہے اور جہاں اس مسجد کے صحن کے بیچ میں وہ مقدس چٹان ہے جس کی بے ادبی پر ان کو دھتکارا گیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق اس چٹان کے نیچے تورات کی تختیاں اور تابوت سکینہ دفن ہے جس میں انبیائے بنی اسرائیل کے نوادرات ہیں۔ اگر یہ نوادرات وہاں ہوں ابھی تو ان کے وارث مسلمان ہیں اس لیے کہ وہ ان انبیاء پر...... اگرچہ وہ ہم سے پہلے کے

ہیں...... پورا پورا ایمان لاتے اوران کا ادب کرتے ہیں۔ یہودیوں نے تو ان مقدس ہستیوں کی جو ان کی قوم سے تھیں، دکھ دے دے کر ستایا، گستاخی اور نافرمانی کی حتیٰ کہ ان کو شہید کیا۔ ان پر انہوں نے ان کے لیے بددعا کی۔ یہ کس منہ سے ان کے تبرکات کے قریب جانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

نومبر ۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷،۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۶۷ء میں القدس پر قبضے کے بعد سے مسجد اقصیٰ کو...... معاذ اللہ ثم معاذ اللہ...... ڈھانے کی کوششیں مسلسل جاری ہیں۔ نہتے فلسطینی مسلمان اپنے جسموں کی باڑ قائم کر کے اس مقدس مسجد کی حفاظت کر رہے ہیں اور پورا عالمِ اسلام ان کی قربانیوں سے بے خبر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔ اگر کسی کو زیادہ ہی درد اُٹھے تو یہ بحث چھیڑ لیتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کا مصداق وہ ہال ہے جو نماز کے لیے بنایا گیا یا وہ گنبد جو چٹان پر قائم کیا گیا؟ اب تو اسرائیلی ملاؤں اور صہیونیت زدہ اسکالروں نے مسجد اقصیٰ کو ڈھانے کے لیے جمع کیے جانے والے ڈالروں میں سے اپنے حصے کا راتب لینے کے بعد یہودی ربّیوں کی سکھائی ہوئی یہ بحث شروع کر دی ہے کہ فلسطین کی وراثت مسلمانوں کا حق ہے یا ان یہودیوں کا جن کو خود اللہ نے تین مرتبہ مہلت دینے کے بعد یہاں سے ہمیشہ کے لیے نکالا تھا۔ کبھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ بیت المقدس کی جگہ یہودیوں کی عبادت گاہ ہیکل سلیمانی تھی، لہٰذا وہ اقصیٰ جسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے ہزاروں شہادتیں نچھاور کر کے حاصل کیا تھا، وہ ہدیہ کی پلیٹ میں رکھ کر یہودیوں کو دے دینی چاہیے تا کہ عملاً اس بات کا اظہار ہو جائے کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ......... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے لے کر آج تک فاتحین اسلام نے اپنی پاکیزہ روحیں اور مقدس جانیں دے کر اس کی جو حفاظت کی تھی، وہ بے جا تھی اور برحق بات وہ ہے جو اسرائیل کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں یہودی فتنہ گروں کی مہمانی کا لطف اُٹھاتے ہوئے ان ایمان فروشوں نے اپنے یہودی آقاؤں سے سیکھی ہے۔

آپ کو یہ دکھڑا کہاں تک سنائیں؟ مسجد اقصیٰ کو ڈھانے کی جو جو کوشش ہو سکتی تھی،

یہودیوں نے کرلی ہے۔ جنونی یہودیوں کے جتھوں نے گھس کراس مقدس عبادت گاہ کوجلا دیا۔ اس کے نیچے ہر جانب سے بیسیوں فٹ طویل سرنگیں کھودیں۔ اس پر فضائی بمباری کا منصوبہ بنایا۔ بارود سے اُڑانے کی پلاننگ کی۔ مسلمانوں کے یہاں آنے کو محدود کر کے گردو پیش کی ساری عمارتیں اور زمینیں خرید کر محلے کے محلے متعصب یہودیوں سے بھر دیے۔ ان عمارتوں سے سرنگیں کھود کر مسجد کے نیچے لے گئے اور وہاں مشینوں کے ذریعے ارتعاش پیدا کر کے مصنوعی زلزلہ برپا کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک سوچا گیا کہ اس گنبد کو کس طریقے سے اُڑایا جائے کہ نیچے موجود چٹان کو...... جو مسلمانوں کا قبلۂ اول تھی...... نقصان نہ پہنچے۔ یہ بھی حساب لگایا گیا کہ اگر سفاک یہودی دہشت گردوں کی ٹیم مختلف مقامات سے حملہ کر کے اس کو گرائے تو ملبہ کتنے دور جائے گا؟ اور اسے سمیٹ کر یہاں سے غائب کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟ یہ باتیں افسانہ نہیں۔ ممتاز امریکی مصنفہ Grace Hal Sell جو صدر بش کی تقریر نویس بھی ہے اس نے اسرائیل کا دورہ کرنے کے بعد یہ تمام چشم دید حقائق لکھے ہیں۔ ان کی کتاب ''Forcing God's Hand'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے آنکھوں دیکھا حال لکھتے ہوئے کہا کہ یہودیوں نے خالص ریشم سے بنے گئے وہ لباس بھی تیار کر رکھے ہیں جو مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی اور گنبد صخرہ کی جگہ دجال کا قصر صدارت قائم ہونے کے بعد وہاں پہلی حاضری دینے والے یہودی ربّی پہنیں گے۔ وہ جماعت بھی اپنے مخصوص لباس کے ساتھ تیار ہے جو تخت داؤدی کو ملکہ برطانیہ کی کرسی سے نکال کر یہاں لا کر نصب کرے گی تا کہ اس پر داؤدی نسل سے آنے والا دنیا کا آخری بادشاہ ملک السلام المسیح الدجّال، کنگ آف دی ورلڈ بیٹھ کر نیو ورلڈ آرڈر کے تحت دنیا بھر پر حکمرانی کرے گا۔ ان کی عقل کو داد دینی چاہیے کہ یہ دجّال کو سیدنا حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی اولاد سے سمجھتے ہیں جبکہ وہ شیطانی قوتوں کا مالک حیوان نما انسانی جانور ہے۔ اسے حضرت داود علیہ السلام جیسی مبارک شخصیت سے کیا نسبت؟

کہاں تک لکھیں اور کہاں تک روئیں؟ پوری دنیا یہودیوں کی پشت پر اور پورے کے پورے یہودی اسرائیلی یہودیوں کی پشت پر ہے جبکہ دوسری طرف ایک بھی قابل ذکر مسلم

حمایت فلسطینیوں کے ساتھ نہیں۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ حماس دہشت گرد جماعت ہے، وہ فلسطینیوں کی نمایندہ نہیں۔ اس نے انتخابات جیت کر اپنی حیثیت منوالی تو اس کا ناطقہ بند کیا جارہا ہے۔ اسے پائی پائی کا محتاج بنانے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ ان پر زمین تنگ کی جارہی ہے۔ ان کے وزرا اور ارکانِ پارلیمنٹ کو ایک یہودی کے بدلے گرفتار کیا جارہا ہے جس کے متعلق پتا ہی نہیں کہ کس نے اسے اغوا کیا؟ کھلا ظلم ہے۔ اندھیر ہی اندھیر ہے۔ اندھے شیطان کی سی سفاکیت کے ساتھ دنیا بھر کے دیکھتے ہوئے، کروڑ روشن خیال انسانوں کے سامنے فلسطینی مسلمانوں سے زندہ رہنے کا حق چھینا جارہا ہے......مگر ایک آنکھ ایسی نہیں جو القدس کے لیے روئے، ایک دل ایسا نہیں جو فلسطینیوں کے درد کو اپنا درد سمجھے۔ ایک ہاتھ ایسا نہیں جو ان کی مدد کو بڑھے۔ الٹا ان کے زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے اس اسرائیل کو تسلیم کرنے کی باتیں ہوتی ہیں جو اللہ احکم الحاکمین، اس کے فرشتوں کو اور تکوینی امور پر مامور اس کے بندوں کو تسلیم نہیں۔ رہی سہی کسر ان شکم پرست دانش وروں نے نکال دی ہے جو اسرائیل کے حقِ تولیت پر مقالے لکھ رہے ہیں اور ان مقالوں کو یہودی ربّیوں سے منظور کروا کر اپنے ایمان کی قیمت لگارہے ہیں۔

ویسے ایک بات ہے۔ یہود کی ذلت کا اس سے بڑا عبرتناک منظر اور کیا ہوگا کہ انہیں اور کچھ نہ ملا تو فٹ بال ورلڈ کپ کے دوران گھانا جیسے غریب ملک کا ایک کھلاڑی خرید لیا۔ اس کالے بُھسو کا کام یہ تھا کہ تل ابیب میں یہودی حسیناؤں کی ایک جھلک کے عوض ورلڈ کپ کے میچ میں اسرائیل کا جھنڈا لہرائے۔ واہ میرے مولا واہ! دنیا بھر کی مالدار ترین کمیونٹی، سازشی ترین دماغ اور برتی ذلت کا یہ عالم کہ ایک کالے بکاؤ غلام کے علاوہ جھنڈا اُٹھانے والا کوئی ہاتھ نہیں آتا۔ ان تمام لوگوں کو مرتے وقت اس ذلت کا انتظار کرنا چاہیے جو مردود قوم کا ساتھ دینے والوں کے لیے مقدر ہے، چاہے وہ ایمان فروش ملا ہوں، ضمیر فرُوش دانش ور ہوں یا دنیا پرست اسکالر یا شہوت پرست غنڈے اور علمائے کرام کے قاتل ایجنٹ اور آخرت کا عذاب تو اس سے سوا ہے۔ اس کی تاب کون لاسکتا ہے؟

۲...... یہ ان کے دماغ کا فتور ہے کہ وہ دنیا میں صرف خود کو حکمرانی کے قابل سمجھتے ہیں کہ

ان کے نزدیک وہ اللہ کے بیٹے اور کچھ کیے کرائے بغیر اللہ رب العزت کے پسندیدہ لوگ ہیں جبکہ بقیہ مخلوق جانور (جنٹائل) ان کی غلامی اور خدمت کے لیے پیدا ہوتی ہے اور ان کے دنیا پرست رہنماؤں نے ان کے اس نسلی تفاخر کو ہوا دے کر جنون کی حد تک پہنچا دیا ہے اور بالآخر یہی حیوانی جنون ان کو لے ڈوبے گا۔

۳......افسوس کہ عیسائی دنیا کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے اور مذاق اُڑانے کے بعد انہیں پھانسی دینے میں کامیاب ہو گئے پھر جناب مسیح علیہ السلام تین دن ایک قبر میں مدفون رہے۔ بعدازاں ان کا جسم وہاں سے آسمانوں پر اُٹھا لیا گیا۔ اس عقیدے میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بے ادبی اور خود عیسائیوں کی بزدلی ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے زندہ ہوتے ہوئے ان کے پیغمبر کے دشمن ان تک پہنچ گئے (جبکہ مسلمانوں نے جب تک ایک آنکھ زندہ تھی سخت سے سخت دشمن کو پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نہیں پھٹکنے دیا) لیکن عیسائی وہ قابلِ رحم لوگ ہیں کہ اس اعلیٰ وارفع عقیدے کو نہیں سمجھ سکے جو اسلام نے انسانیت کو سکھایا ہے۔

قرآن مجید کی سچی اطلاع کے مطابق سیدنا حضرت عیسیٰ سچے مسیح علیہ السلام آسمانوں پر بحفاظت اُٹھا لیے گئے۔ یہود ان کا بال بیکا نہیں کر سکے۔ البتہ عیسائیوں نے چونکہ ان کی حفاظت کا فریضہ انجام نہ دیا جبکہ مسلمانوں نے اپنی کمزور جانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا کر کے غزوۂ احد کے دن ان کے گرد انسانی جسموں کی دیوار کھڑی کر دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحفاظت دشمن کے نرغے سے نکال لے گئے۔ اس لیے اس کے انعام واکرام میں یہود کی سرکوبی کا کام بھی اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے لے گا۔ چنانچہ قیامت کے قریب (اور قیامت تو دور ہی کتنی ہے؟) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے۔ مسلمان ان کے ساتھ مل کر ان کے دشمن یہودیوں سے جہاد کریں گے اور جیسا کہ مسلمانوں کے بڑوں کی روایت ہے ویسا جہاد کریں گے جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے دائیں لڑیں گے، بائیں لڑیں گے۔ ان کے آگے آگے لڑیں گے، پشت سے پشت ملا کر عقب سے دفاع کریں گے۔ اوپر سے آنے

والے تیر سے بھی حفاظت کریں گے اور نیچے ان کے قدموں میں اپنے زخمی جسم بچھا کران کا تحفظ اپنے گرم گرم خون سے ویسے کریں گے جیسا کہ محمدیوں کی روایت ہے۔ وہ روایت جو بدر واحد میں پیارے صحابہ نے قائم کی اور آج تک خوش نصیب اہل ایمان نے اسے زندہ رکھا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان یہودیوں کو جو آپ کے دوبارہ آجانے کے بعد بھی آپ کو نہ مانیں گے اور الٹا پھر آپ کے قتل کے درپے ہوں گے، ان کے قائد، شیطان اکبر، دجّال اعور (عربی میں ''اعور'' کانے کو کہتے ہیں) سمیت قتل کر ڈالیں گے اور آج فلسطینی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے سنگدل یہود اس دن تل ابیب اور حیفا کی سڑکوں پر ایسے پڑے ہوں گے جیسے سمندر مردار مچھلیوں کو باہر پھینک دیتا ہے اور پھر پتا نہیں چلتا کہ ان میں سے کون سی پہلے مری اور کون سی بعد میں سڑی۔

۴......اس پر ہلکا پھلکا تمہیدی قسم کا مضمون لکھا جا چکا ہے اور تہلکہ خیز مضمون کا ارادہ ہے۔

۵......آئن اسٹائن ہی نہیں، اور بھی کئی مشہور سائنس دان یہودی تھے۔ یہودیوں نے سائنس پر خصوصاً جینیٹک سائنس پر بہت کام کیا ہے۔ اس وقت ۷۵ یہودی سائنس دان نوبل انعام لے چکے ہیں جبکہ مسلمانوں کو کرکٹ کا ریکارڈ گننے اور بھارتی فلموں کے گانوں پر سر دھننے سے فرصت نہیں۔ باقی یہ معمہ نہیں، معجزہ ہے۔ معجزہ کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو اللہ کے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو اور تکوینی قانون میں جکڑی اس دنیا میں کوئی اور ایسا نہ کر سکے۔ جب اور کوئی معجزہ انجام نہیں دے سکتا تو ہمیں معجزوں کا انتظار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ مسلسل محنت ہی معجزہ ہے۔ وفا اور غیرت ہی معجزوں کو جنم دیتی ہے۔ ایمان اور عمل ہی اصل معجزہ ہے۔ اگر ہم محض اتنی سی بات سمجھ لیں تو آج بھی نہایت قلیل عرصے میں بہت لمبا فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔ اتنا لمبا کہ آئن اسٹائن کی تھیوری دور کھڑی منہ دیکھتی رہ جائے گی۔

مغربی ممالک پورے فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ چاہتے ہیں

گفتگو: شیخ محمد عصام، خطیب جامع مسجد اقصیٰ
انٹرویو: مفتی ابولبابہ شاہ منصور

ضربِ مؤمن: پاکستانی قوم مسجدِ اقصیٰ کے خطیب و امام شیخ عصام کو اپنے درمیان خوش آمدید کہتی ہے اور مسجدِ اقصیٰ اور فلسطینی بھائیوں کے حالات جاننے کے لیے بے چین ہے۔ پاکستانی قوم مسئلہ فلسطین کو تمام پہلوؤں سے بغور دیکھنا چاہتی ہے، اپنے فلسطینی بھائیوں سے اظہارِ یکجہتی کر رہی ہے اور یہ بتانا چاہتی ہے کہ پاکستانیوں کے دل اور ان کی جانیں اپنے فلسطینی بھائیوں کے دلوں اور جانوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ حقیقتاً ہمارے مہمان کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن چونکہ ہم ان کا تعارف پاکستانی قوم سے کرا رہے ہیں اس لیے کیا آپ اپنا تعارف کرائیں گے؟

شیخ عصام: میں فلسطینی مہاجر ہوں، میرا نام محمد عصام ہے، مسئلہ فلسطین اور مسجد اقصیٰ کو اجاگر کرانے اور مسلمانوں کے سامنے بیان کرنے کے لیے ان دنوں میں دنیا کے مختلف ملکوں کے دورے پر ہوں۔

ضربِ مؤمن: پاکستان میں زیادہ تر اخبارات نے یہ خبر شائع کی ہے کہ ہمارے معزز مہمان مسجدِ اقصیٰ کے امام ہیں اور جامعۃ الاقصیٰ کے نائب رئیس بھی، کیا آپ اس حوالے سے اپنے تعارف میں کوئی اضافہ کریں گے؟

شیخ عصام: جی ہاں! میں مسجدِ اقصیٰ کا امام ہوں، جامعۃ الاقصیٰ کا مسئول اور قائم مقام

رئیس کا عہدہ بھی میں نے سنبھالا ہوا ہے، اس وجہ سے کہ وہاں کوئی رئیس نہیں تھا، کیونکہ جامعۃ الاقصیٰ کے رئیس کو یہودیوں نے ملک بدر کردیا تھا اور یہ ان کی عادت ہے کہ جو بھی ان کی مخالفت کرتا ہے یا ان کے خلاف برسر پیکار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اسے ملک بدر کیا جاتا ہے، اسی کالے قانون اور صہیونی پروٹوکول کے تحت ہمارے جامعۃ کے مدیر کو بھی کئی سال سے ملک سے بے دخل کردیا گیا، نتیجتاً مجھے ان کے نائب کی حیثیت سے ان کی تمام ذمہ داریاں اٹھانی پڑیں۔

ضربِ مؤمن: اسلامی دنیا کے کالم اور تجزیہ نگاروں نے مسئلہ فلسطین، اس کے بدلتے حالات اور اس پر گزرے ہوئے ادوار کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ کیا آپ فلسطینی قوم پر گزرے ہوئے تاریخی مراحل کے بارے میں مختصراً کچھ بتائیں گے؟

شیخ عصام: فلسطین زمین کے ایک مقدس ٹکڑے کا نام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مبارک سرزمین کے بارے میں بہت سے انبیاء پر وحی نازل فرمائی ہے۔ یہ زمین حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کا گھر ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی بنیاد ڈالنے کا حکم فرمایا، اسی طرح ان کو مسجدِ اقصیٰ کے علاقے کی طرف رہنمائی بھی کی، پس انہوں نے وہاں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دو اہم جگہوں پر عبادت کی، ایک بیت اللہ اور دوسرا مسجدِ اقصیٰ کا علاقہ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے بعد دن گزرتے گئے، حالات بدلتے گئے اور فلسطین ان حالات کے مدوجزر میں جھولے کھاتا رہا، کبھی فارس کا قبضہ تو کبھی روم کا قبضہ، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "اسراء" کے واقعہ میں مسجدِ اقصیٰ کی سیر کرائی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مسجدِ اقصیٰ کا ذکر فرمایا کہ اس کے اردگرد ہم نے برکت ڈالی ہے، مطلب یہ ہوا کہ یہ پورا علاقہ (ارضِ فلسطین) مبارک ہے۔ مسجدِ اقصیٰ مسلمانوں کا پہلا قبلہ بھی رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے تقریباً ۱۷ ماہ تک اس کی طرف رخ کرکے نمازیں پڑھی ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ معراج کے واقعہ میں بھی ایک ممتاز اور منفرد مرکز واقع ہوا، خصوصاً اس حیثیت سے کہ معراج کے واقعہ میں نماز فرض ہوئی ہے۔ اس

کے بعد ۱۵ ہجری میں اللہ جل شانہٗ نے چاہا کہ یہ سارا علاقہ اسلام کے پرچم تلے آ جائے اور مسلمان مسجدِ اقصیٰ کو فتح کر لیں۔

مسجدِ اقصیٰ کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فلسطین کے نصاریٰ کو جان کی امان دی، اس زمانہ میں کوئی بھی یہودی اس علاقہ میں نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین قسم کے لوگوں کے لیے مسجدِ اقصیٰ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں داخلے پر پابندی لگا دی:

۱۔ رومی، جو کہ مسجدِ اقصیٰ پر قبضہ کرنے والے تھے، ان کے لیے اس مقدس سرزمین پر کوئی جگہ نہیں ہے، ان کو چاہیے کہ اپنے ملک کی طرف کوچ کر جائیں۔

۲۔ چور اور لٹیرے، کیونکہ یہ علاقہ مقدس ہے۔

۳۔ یہود، یہودیوں کا داخلہ قطعاً ممنوع ہے۔

اور اصلاً بھی کوئی یہودی القدس کے علاقہ میں موجود نہ تھا۔ اس کے بعد کئی ادوار تک مسلمان اس علاقے کے تقدس کی حفاظت کرتے رہے۔

تقریباً ستر سال گزرنے کے بعد خلفاء بنو امیہ نے مسجدِ اقصیٰ کی تعمیرِ نو کی اور وہاں پر قبۃ الصخرہ کی بھی تعمیر کی جو کہ آپ کے سامنے ہے کیونکہ یہاں پر مستطیل شکل کی ایک مقدس چٹان ہے جو کہ زمین سے ڈیڑھ میٹر اوپر ہے اور ۶x۱۰ میٹر اس کا حجم ہے، انبیاء علیہم السلام کے زمانوں میں یہاں پر قربانیوں کا ذبح ہونا اور لوگوں کا یہاں پر عبادت کے لیے آنا ثابت ہے، اس پر مسلمانوں نے ایک گنبد تعمیر کیا جسے ہم آپ کے لیے ہوئے ''ضربِ مؤمن'' کے صفحہ پر دیکھ رہے ہیں۔

پھر مسلمان کمزور پڑ گئے تو صلیبیوں نے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور مسجدِ اقصیٰ کے اندر مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک ہوا کہ اس میں ۷۵ ہزار مسلمان ذبح کیے گئے جنہوں نے صلیبیوں کے ظلم اور استبداد سے بچنے کے لیے وہاں پر پناہ لی تھی۔

پھر زمانے نے پلٹا کھایا اور مسلمانوں نے صلیبیوں کو وہاں سے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں مار بھگایا۔

اس کے بعد مسلمانوں نے بڑی مدت تک القدس کی تقدیس کی حفاظت کی۔ یہاں تک

کہ مبغوض برطانوی سامراج ۱۹۱۷ء میں آیا اور اس دن سے مسجدِ اقصیٰ پر قبضے کا تیسرا دور شروع ہوا جس کے ذمہ دار صہیونی یہودی اور ان کے پشت پناہ انگریز تھے۔

اس دور کے شروع ہوتے ہی برطانیہ، امریکا اور مغربی ممالک نے دنیا کے امیر ترین یہودیوں کو سرزمین مقدس میں لا بسایا جو کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی عہد و پیماں کی پروا نہیں رکھتے، انہوں نے مسلمانوں کے علاقوں پر ناجائز تسلط قائم کر کے اپنی حکومت کا اعلان کیا اور وہاں کے باسیوں کو اپنے ملک سے بے دخل کر دیا گیا۔

ضربِ مؤمن: آپ کا مطلب یہ ہے کہ برطانیہ، امریکا اور مغربی دنیا نے یہودیوں کو غاصبانہ قبضہ دلایا، یہودیوں نے بزورِ بازو قبضہ نہیں کیا؟

شیخ عصام: جی ہاں! یہ سرزمین (فلسطین) سلطنتِ عثمانیہ کا ایک حصہ تھی اور جب پہلی عالمی جنگ میں سلطنتِ عثمانیہ کا سقوط ہوا تو انگریز اور اس کے حلیفوں نے فلسطین پر اپنا قبضہ جما لیا اور انہوں نے یہاں صہیونی مملکت بنانے کا فیصلہ کر کے یہودیوں کو دنیا کے کونے کونے سے فلسطین میں جمع کرنا شروع کیا اور پھر وہاں پر ان کی یہودی ریاست کا اعلان کر دیا، نتیجتاً ۴ ملین فلسطینیوں کو جلاوطن کر دیا گیا (جبکہ ان کی کل آبادی ۷ ملین ہے) جو دربدر ہو کر مختلف عرب ممالک، یورپ اور امریکا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ صرف دو علاقے (غزہ اور مغربی کنارہ) باقی ہیں جن پر اب تک صہیونی تسلط نہ ہو سکنے کی وجہ سے فلسطینیوں کو کچھ امید ہے کہ اس میں ان کے لیے ایک آزاد مملکت قائم ہو سکے گی، لیکن کسی نے بھی اس بارے میں ان کی امداد نہ کی، نہ اقوامِ متحدہ اور نہ کسی اور نے۔ اقوامِ متحدہ کی ڈھیروں قراردادوں کے باوجود فلسطینی قوم اب تک اپنے لیے آزاد مملکت کا اعلان نہ کر سکی بلکہ وہ سب کچھ محض کاغذ پر روشنائی تھی، بالکل اسی طرح جیسے کہ کشمیر سے متعلق اقوامِ متحدہ کی قراردادیں ہیں۔ جس طرح اقوامِ متحدہ نے قراردادوں کے ذریعے کشمیر کو آزادی اور استقلال کا حق دے دیا لیکن صرف اور صرف کاغذ کی حد تک، ان قراردادوں میں سے کسی ایک کی بھی تعمیل نہ ہو سکی، مقابلے میں ہندوستان کو کشمیر میں سب کچھ کرنے کا حق واقعتاً دیا، اسی طریقے سے فلسطین کے متعلق قراردادیں سب کاغذ کی

حدود ہی میں رہیں اور اسرائیل کے متعلق قراردادوں کو واقعی حقیقی اور عملی جامہ پہنایا گیا، بالکل جو کچھ کشمیر میں ہوا وہی کچھ فلسطین میں ہوا۔

ضربِ مؤمن: معذرت کے ساتھ، یہ جو دو ٹکڑوں پر اب تک صہیونی قبضہ نہیں ہوا کیا وہ اس پر قبضہ نہ کر سکے یا وہ سرے سے ان علاقوں پر قبضہ کرنا ہی نہیں چاہتے؟

شیخ عصام: حقیقت تو یہ ہے کہ مغربی ممالک یہودیوں کو پورے فلسطین پر قبضہ کرانا چاہتے تھے، ۱۹۴۸ء میں اس لیے انہوں نے پیش قدمی روکی لیکن یہ دو ٹکڑے چھوڑ دیے جن میں سے غزہ میں ایک ملین فلسطینی جمع تھے (جبکہ رقبہ صرف ۳۶۰ مربع کلومیٹر ہے) پس اگر وہ غزہ پر قبضہ کرتے بھی تو خاص استفادہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہاں کی آبادی پہلے سے زیادہ تھی اور دوسرا ٹکڑا مغربی کنارہ ہے جو کہ خالصتاً ایک پہاڑی علاقہ ہے، وہاں پر بھی ایک ملین فلسطینی آباد تھے لیکن ۱۹۶۸ میں یہود نے ان دو علاقوں پر بھی قبضہ کیا اور وہاں سے اردنی اور مصری فوجیوں کو بھگایا جو ان دونوں علاقوں کی حفاظت پر مامور تھے، اس وقت سے بلکہ ۱۹۴۸ء سے فلسطینی قوم اس انتظار میں ہے کہ کوئی ان کو انصاف دلائے لیکن اب تک نہ عرب ممالک میں سے کسی نے اور نہ اقوام متحدہ نے ان کو اپنا حق حاصل کرنے میں مدد دی۔ آخر کار یہ قوم پھٹ پڑی اور تحریکِ انتفاضہ کو عملی شکل دے دی جن میں سے ۱۹۸۷ء میں پہلی انتفاضہ ہے جو کہ سات سال تک جاری رہی، ان سات سال میں فلسطینیوں نے یہودیوں کو کڑوے گھونٹ پلائے، یہاں تک کہ امریکا اس بات کے لیے مجبور ہوا، وہ عرب ممالک پر ایک سلامتی کونسل بنانے کے لیے دباؤ ڈالے۔ اس بہانے کہ یہ کونسل فلسطینی قوم کی معاونت کرے گی اور ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کرے گی۔

اس سلامتی کونسل کا ۱۹۹۳ء کا اجلاس کیا حقیقت پر مبنی تھا؟ کیا وہ واقعتاً فلسطینیوں کو بچانے اور ان کو اپنے حقوق دلانے کے لیے بلایا گیا تھا؟ نہیں! بلکہ وہ دراصل یہودیوں کو فلسطینیوں کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے بلایا گیا تھا، اس اجلاس میں انہوں نے یہ قرارداد پاس کی کہ فلسطینیوں کو کچھ نہ کچھ دیا جائے گا اور ان کے کچھ گرفتار اشخاص رہا کر دیے جائیں گے...... لیکن یہ سب کچھ اس لیے مضحکہ خیز تھا کہ یہ فلسطینی حکومت اور یہ فلسطینی قانون نافذ کرنے والے

دراصل اسرائیلیوں کو فلسطینی فدائیوں سے بچانے کے لیے ایک دیوار ثابت ہوئے کیونکہ یہی پولیس مجاہدین کی نقل وحرکت اور ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتی تھی جیسے کہ کشمیر میں بعض خائن نام نہاد مسلمان ہندوستانی حکومت کے ساتھ مل کر مجاہدین اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے کام کر رہے ہیں اور جیسے کہ افغانستان میں بہت سے غدار امریکیوں سے مل کر مجاہدین کے خلاف سرگرم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ انہوں نے فلسطین میں بھی ایک کرزئی کو کرسی پر لا بٹھایا اور اس کرزئی (یعنی عرفات) کو مسلمان فلسطینی قوم پر مسلط کر دیا لیکن وہ مجاہدین جو صرف اللہ سے ڈرتے ہیں وہ نہ اسرائیل کی پرواکرتے ہیں اور نہ عرفات کے قوانین کی پاسداری کرتے ہیں گویا کہ امریکا کا سب کیا ہوا مجاہدین کے سامنے ہیچ ثابت ہوا جس کی وجہ سے امریکا نے عرفات کو تبدیل کرنے یا اس کے ساتھ اس سے زیادہ غداری کرنے والے (ابو مازن محمود عباس) کو مقرر کرنے پر غور شروع کر دیا، پس انہوں نے محمود عباس کے لیے ایک ایسی حکومت بنانی چاہی جو ان کا مطلوبہ کردار ادا کر سکے اور مجاہدین کو سرگرم عمل رہنے سے باز رکھے۔

ضربِ مؤمن: میڈیا پر حفاظتی دیوار (حائل باڑ) نے کافی شور برپا کر دیا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے اور اسرائیلی حکومت نے اس کا سہارا کیوں لیا ہے؟

شیخ عصام: مغربی کنارہ اور غزہ چونکہ جہادی سرگرمیوں کے اہم مراکز ہیں اس لیے یہودیوں نے سوچا کہ اردنی بارڈر کے پاس ایک ایسی دیوار تعمیر کی جائے جو مغربی کنارہ کو ایک بڑے اور وسیع جیل کی مانند بنا دے تاکہ یہودی پورے ملک میں آزاد پھریں اور فلسطینی اس دیوار سے باہر نہ نکل سکیں نہ اردن اور شام کی طرف اور نہ فلسطین کی طرف۔ یہ اس دیوار کی حقیقت ہے۔ باقی غزہ کے لیے کسی دیوار کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایک طرف مصری حدود ہیں جن پر اسرائیلی فوج کی سخت سیکورٹی ہوتی ہے، دوسری طرف سمندر ہے اور باقی اطراف میں اسرائیلی فوجوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی ہے، جو کہ کسی بھی قسم کی دراندازی کی روک تھام کے لیے کافی ہیں۔ اس باڑ کی تعمیر پر پوری دنیا نے احتجاج شروع کیا، امریکا نے بھی رسمی احتجاج کیا لیکن یہ احتجاج حقیقی نہیں ہے کیونکہ امریکا خود اس باڑ کی تعمیر کے لیے فنڈز فراہم کرتا ہے۔

ضربِ مؤمن: بعض لوگوں کو یہ اشکال ہے کہ جب مجاہدین یہودیوں پر حملہ کرتے ہیں تو یہودی ان کے گھروں کو مسمار کر دیتے ہیں، بچوں اور عورتوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں، اس طریقہ سے تو مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے؟

شیخ عصام: اس بات سے تو فلسطینیوں سے ہمدردی کے تاثرات ملتے ہیں، یہی سب کچھ کشمیر اور چیچنیا میں ہو رہا ہے، وہاں کے بارے میں اس اشکال کرنے والوں کی کیا رائے ہے؟ افغانستان میں مجاہدین نے اپنی کارروائیاں بند کیں، امریکا نے اپنی بمباری اب تک کیوں بند نہیں کی؟ چند دن پہلے امریکی طیاروں نے شہری آبادی پر بمباری کی اور ۶ بچوں سمیت ۱۶ افغان شہید کیے، کیا یہ بچے مجاہد تھے؟ دشمن بمباری کرتا رہے گا خواہ مجاہدوں نے کوئی کارروائی کی ہو یا نہ۔ آپ نے نہیں سنا کہ فلسطینی مجاہدین نے ۵۰ دن کی جنگ بندی کا اعلان کیا، لیکن یہودیوں نے اپنی کارروائیاں نہیں چھوڑیں بلکہ انہوں نے جرائم کا پرانا ریکارڈ ان ۵۰ دنوں کے دوران توڑ دیا۔ یہ اشکال کرنے والوں نے کبھی بھی یاسر عرفات کے فلسطینی حقوق سے دستبردار ہونے پر اعتراض نہیں کیا! آپ سوچیں کہ ہمیں ہمارے حقوق کون دلائے گا؟ اور کون لوگوں کو فلسطینی قضیہ کے بارے میں آگاہ کرے گا؟ دنیا کے لوگ تو تحریکِ جہاد سے پہلے فلسطینی قضیے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

ضربِ مؤمن: عراق پر امریکی قبضہ سے فلسطینی قضیہ میں کیا نتائج برآمد ہوں گے؟ کیا اس قضیہ سے دنیا فلسطینی قضیہ بھول جائے گی؟ یا اس سے مسلمان (بالخصوص عرب ممالک) میں بیداری کی لہر پیدا ہوگی؟

شیخ عصام: اسلامی اُمّت اپنے ان رہنماؤں اور حکام کے ہوتے ہوئے کبھی بھی بیدار نہ ہوگی یعنی آپ مطمئن ہو جائیں، ان حکام کے دور میں تو بیداری کا کوئی امکان نہیں کیونکہ جب بھی اُمّت میں بیداری کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو یہ حکام اس کو خواب آور دوا اور انجکشن لگا دیتے ہیں تاکہ یہ پھر سے خوابِ غفلت کے سمندر میں غرق ہو جائیں۔

عراقی قضیہ کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کے لیے جہاد کا ایک نیا میدان

وجود میں آیا، امریکا جواب تک مسلمانوں سے کھیلتا تھا اب وہ خود اس چکی میں پس رہا ہے۔
دوسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ امریکا کے عراق پر چڑھ دوڑنے سے عراقی قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہوئی۔ آپ نے دیکھا کہ عراقیوں نے بھی مزاحمتی مسلح تحریک شروع کی ہے اور فلسطینیوں اور عراقیوں کی یہ بیداری شاید پوری عرب قوم بھی جگائے اور وہ غیرت، دینی حمیت اور اپنے مسلمان بھائیوں کی پکار کی وجہ سے امریکا اور مغرب کے سامنے متحد ہو کر کھڑی ہو جائے۔ یہ سارے مثبت پہلو ہیں، رہے منفی پہلو تو ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس حملے نے اسرائیل کا دل بڑھایا کہ وہ اپنے مجرمانہ اور قاتلانہ حملوں کو تیز تر کر دے اور دوسرا منفی نتیجہ یہ ہے کہ عرب رہنما تو امریکا کے ڈر سے پہلے کانپتے تھے، اب چونکہ امریکا اور نزدیک ہو گیا تو ان کا خوف اور بڑھ گیا، گویا اب ان کو امریکی اشارہ کافی ہوتا ہے جبکہ پہلے حکم سے کام چلتا تھا، اب صرف اشارہ کافی ہے لیکن اس منفی اثر کے مقابلے میں ایک مثبت اثر بھی پیدا ہوا ہے اور وہ یہ کہ امریکی بہت تیزی سے مسلم ممالک پر قبضے کرتے جا رہے تھے، پہلے فلسطین پھر افغانستان اور عراق، عراق کے بعد ایران اور پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک ان کی زد میں تھے...... لیکن افغانستان اور عراق میں امریکی ایسے پھنسے کہ اب ان کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہو گیا۔ اب یہ اس گاڑی کی مانند ہیں جو سپر ہائی وے جیسی سڑک پر تیز دوڑتے ہوئے ایک گڑھے میں جا گری ہو۔

ضربِ مؤمن: مسلمانوں کی رگوں میں فلسطینیوں کی خاطر خون جوش مار رہا ہے اور مسلمان نوجوان فلسطینی قضیہ کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں چونکہ فلسطین مسلمانوں کے عقیدے کا ایک لاینفک جز ہے اس لیے مسلمان اسے یہودیوں کا صرف جغرافیائی قبضہ نہیں سمجھ رہے ہیں بلکہ اس کو عقیدہ اور اسلام کے خلاف ناقابل معافی جرم بھی سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ (فلسطینی قضیہ کے سفیر کی حیثیت سے) ان مسلمانوں کے لیے کیا نصیحت کرتے ہیں؟ اور ان کی رہنمائی کس لائحہ عمل کی طرف کرتے ہیں؟ تاکہ وہ مکمل اور یقینی طریقے سے فلسطین کی آزادی کے لیے کام کر سکیں۔

شیخ عصام: سب سے پہلے میں فلسطینی اتھارٹی کے ان سفیروں سے جو اسلامی اور

غیر اسلامی ممالک میں مقیم ہیں بھرپور احتجاج کرتا ہوں کہ وہ ان ممالک میں کرتے کیا ہیں؟ فلسطینی سفیر پاکستان میں کون سے فرائض انجام دے رہے ہیں؟ وہ فلسطینی مسئلہ میں فلسطینیوں کی حمایت کے لیے کیوں جلسے منعقد نہیں کرتے؟ ان کی اتھارٹی خائن اور غدار ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی خائن اور غدار ہوں گے، ان کے لیے فلسطینی مسئلہ کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا، ان کا سروکار ان چیزوں سے ہے جو فلسطینی قوم کے لیے جمع ہوتی ہیں، ان کا مقصد تو اپنا پیٹ بھرنا ہے۔ بھارت میں فلسطینی سفیر اسرائیل کے مفادات کے لیے کام کرتا ہے اور ہندوؤں پر دباؤ ڈالتا رہتا ہے کہ وہ اسرائیل سے اچھے تعلقات استوار کریں۔ باقی عرب ممالک میں جو فلسطینی سفیر مقیم ہیں وہ بھی اپنے ملک کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر فلسطینی سفیر روزانہ یا کم از کم میڈیا پر ہفتہ وار بیان دیتا اور ان بیانات میں اپنی قوم کے حقوق اور جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو آگاہ کرتا...... ایک سفیر کے لیے یہ کام بہت کٹھن اور مشکل ہے...... لیکن مسلمان نوجوانوں کے لیے یہ کام آسان ہے، وہ اس جہاد میں بآسانی حصہ لے سکتے ہیں، مجاہدین کی خبریں نشر کرنا جہاد ہے اور پاکستانی قوم کے ایٹمی ہتھیار اور اسلامی وحدت فلسطینی مجاہدین کے لیے ایک سپورٹ دینے والی طاقت کی حیثیت رکھتی ہے اور پاکستانیوں کا بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجلاسوں میں فلسطینیوں کا ساتھ دینا یہ بھی مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتا اور ان کی ہمت بندھاتا ہے۔

وہ نوجوان جن کی رگوں میں گرم خون دوڑنے لگا ہے فلسطین کی محبت اور جہاد سے لگاؤ کی وجہ سے ان سے میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اللہ سے یہ دعا مانگیں کہ ہمارے درمیان غداروں کی ٹولی کو ختم کردے اور ان کو یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ فلسطینی آخری سانس تک لڑتے رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی اس جہاد کو دوام دینا چاہتی ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ پیدا ہونے والے نر بچے فلسطین میں پیدا ہوتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہمیں مجاہدین کا عوض اور بدل دینا چاہتا ہے اور وہ فلسطینیوں سے اس جہاد پر راضی ہے۔

آخر میں ''ضربِ مؤمن'' اخبار کے ادارہ کی فلسطینی مسئلہ کو اجاگر کرنے کی کوششوں کو سراہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

نئی صدی میں عالمِ اسلام کو درپیش چیلنج

اس عالم میں جہاں ثبات فقط تغیر کو ہے، ہر آنے والا لمحہ اپنے ساتھ نئے تقاضے لے کر آتا ہے، اور اب تو دنیا اتنی تیز رفتار ہوگئی ہے کہ ہر دن، ہر ساعت انسان سے نئے عزم و عمل کی متقاضی ہوتی ہے۔ وقت کے تقاضے اور زمانے کی طلب کو سمجھ کر اسباب مہیا کرنے اور اپنے وسائل اور صلاحیتوں کو مقصد کے حصول کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیے بغیر اس مشینی دور میں کامیابی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ نئی صدی ہم سے دور بینی و دور اندیشی، بلند ہمتی اور حسنِ کارکردگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس وقت جبکہ عالم کفر مادی ترقی کے اعتبار سے اوجِ کمال کو پہنچا ہوا ہے، مسلمانوں کو اپنی عزت و حرمت کی حفاظت اور بقا و ترقی کے لیے نہایت فہم و فراست کے ساتھ عمل پیہم اور جہدِ مسلسل کی ضرورت ہے۔ امت مسلمہ میں ایسے دماغوں، باصلاحیت افراد اور قابل نوجوانوں کی کمی نہیں جو اپنے عزم و کردار سے، قربانیوں اور مجاہدے سے اسلام کو غالب اور کفر کو مغلوب کر سکتے ہیں...... لیکن افسوس کہ مقصد حیات واضح اور عمل کی سمت متعین نہ ہونے کی وجہ سے صلاحیتیں وہاں نہیں لگ رہیں جہاں انہیں استعمال ہونا چاہیے تھا۔ ذہن کی قوت اور بازوؤں کی طاقت اس مصرف میں خرچ نہیں ہو رہی جہاں اس کا حق ہے۔ مادیت کے پرستار، ہوس میں گرفتار، وحی الٰہی کی تعلیمات سے محروم، اللہ کی رحمت سے مایوس، ایمان کی روشنی سے محروم کفر کے سرغنے نئی صدی کی آمد کا جشن منا کر خاموشی سے نہیں بیٹھ گئے بلکہ وہ اسلام سے بھرپور معرکے کی تیاری اور مسلمانوں کو مٹا دینے یا جھکا دینے کی مکمل منصوبہ بندی کے بعد مناسب وقت اور سازگار حالات کا انتظار کر رہے ہیں۔ صاف لگ رہا ہے کہ رواں صدی میں کفر و اسلام کا ایسا بھرپور ٹکراؤ ہوگا۔ اس لیے مسلمانوں کو رجوع الی اللہ پر عمل پیرا ہو کے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری شروع کر دینی

چاہیے۔نئی صدی میں عالمِ اسلام کو جو چیلنج درپیش ہیں ان میں سرفہرست درج ذیل چیزیں آتی ہیں، ہراس شخص کا جسے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور قیامت کے دن کی جواب دہی پر یقین ہے،فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے بقدر اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے میں حصہ ڈالے۔

۱-احیائے خلافت:

سب سے پہلی ذمہ داری جس کو پورا کیے بغیر مسلمان بے آسرا یتیم کی طرح ہیں، نظام خلافت کا قیام واستحکام ہے۔خلافت کے ادارے سے محروم ہونے کے بعد ہماری حالت کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہے جس پر جھپٹنا ہر کوئی اپنا حق سمجھتا ہے۔یہ ادارہ مسلمانوں کی مرکزیت کا نشان، ان کی یکجہتی ویگانگت کی علامت اور مہربان سرپرست کی طرح تھا۔کفر خصوصاً یہود کی پیہم سازشوں سے اس نگہبان اور سرپرست کے خاتمے کے بعد دنیا بھر میں بکھرے ہوئے مسلمان ان بے سہارا یتیموں کی طرح ہیں جنہیں قدرت کی آزمائش نے کسی بخیل کے دسترخوان پر لا جمع کیا ہو، یا کسی تندخونگراں کی سرپرستی میں دے دیا ہو۔دنیا میں اس وقت ہر قوم وملت، ہر مذہب ونظریے سے وابستہ شخص کے حق میں کوئی نہ کوئی آواز اُٹھانے والا ہے لیکن ایک مسلمان ہیں جن کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا، جن کے درد کا کوئی مداوا کرنے والا اور جن پر ہوتے ظلم کو دیکھ کر کوئی غیرت کھانے والا نہیں...... اس لیے کہ ان کے سر سے خلافت کا سائبان اور امیر المؤمنین کا مہربان سایہ گزشتہ صدی کی تیسری دہائی (۱۹۲۳ء) میں چھین لیا گیا تھا۔اس کے بعد سے مسلمانانِ عالم شیر کے ان بچوں کی طرح ہیں جو اندھیری رات میں ماں سے بچھڑ کر درندوں سے بھرے جنگل میں گم ہوگئے ہوں۔اے قابلِ فخر اسلاف کے فرزندو! اس نظام کو دوبارہ زندہ کرنے اور اپنے حقوق کے اس محافظ کو پھر سے وجود بخشنے کی فکر کرو۔امارتِ اسلامیہ کی ترقی واستحکام کے لیے کام کرو، عزت وعظمت رفتہ دوبارہ پا جاؤ گے۔

۲-نظام قضاء کا اجرا:

خلافت کے ادارے سے محروم ہونے کے جہاں اور بہت سے نقصان ہوئے، وہاں سب سے بڑی آفت یہ ہوئی کہ اللہ کے اُتارے ہوئے قانون کی جگہ ابلیس کے سکھائے ہوئے

طریقوں کی حکمرانی ہوگئی۔ صورتِ حال یہ ہے کہ فیصلہ چاہنے والا بھی مسلمان اور فیصلہ کرنے والا بھی مسلمان؛ حاکم ومحکوم، مدعی ومدعیٰ علیہ سب کلمہ گو ہیں، لیکن ان کے درمیان فیصلہ عیسائیوں اور یہودیوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت ہو رہا ہے۔ خلافتِ اسلامیہ کا اولین فرض ہوتا تھا کہ اپنی مملکت کی حدود میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا سلسلہ جاری اور احکامِ الٰہیہ کے نفاذ کی نگرانی کرے۔ جب خلافت ساقط ہوگئی تو اب کفر کی فطری وذہنی یلغار کے سامنے کوئی بند باندھنے والا نہیں۔ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں شریعت کی نہیں، راندۂ درگاہ یہودیوں اور دشمن اسلام عیسائیوں سے مستعار مانگے ہوئے قانون کی بالادستی ہے۔ سب چاہتے ہیں کہ شریعت مطہرہ کی حکمرانی ہو لیکن کسی کو نہیں خبر کہ ان پر غیروں کے قوانین کس طرح مسلط کردیے گئے ہیں؟ اے میرے نادان بھائیو! یہ سب خلافت اسلامیہ سے محرومی کا نتیجہ ہے۔ علماء حق نے افتاء کا جو نظم قائم کر رکھا ہے، یہ نجی طور پر شریعت کے نفاذ کے ہم معنی ہے لیکن دینی اداروں میں دارالافتاء کی طرح دارالقضاء کے قیام کی بھی ضرورت ہے۔ کیسا ستم ہے کہ فریقین اللہ کی مبارک شریعت پر فیصلہ کروانا چاہتے ہوں اور ملک بھر میں ایسا ادارہ نہ ہو جو ان کی یہ اہم ترین شرعی ضرورت پوری کر سکے۔ یہ علمائے کرام ومفتیانِ عظام کی ذمہ داری ہے کہ اپنے اپنے اداروں میں قضاء کے نظم کو متعارف کروائیں۔ افتاء کے نظم کو وسعت دے کر قضاء شرعی کو وجود بخشنا چنداں مشکل نہیں۔ نئی صدی میں نظامِ قضاء کا اجرا ایک ایسا چیلنج ہے جس کا سامنا حضرات علمائے کرام کو کرنا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس سے کس طرح اور کتنی جلد عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب فریقین کو شرعی مسئلہ بتایا جاسکتا ہے تو ان کے درمیان شرعی فیصلہ کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ نجانے اس اہم شعبے کے قیام اور اس شرعی ذمہ داری کا احساس ہم سے کیوں ختم ہوگیا؟ حکومتوں کے ذریعے عدالتوں کا فرنگی نظام ختم نہیں ہوسکتا تو ہم ان سے مطالبہ کرنے کی بجائے وقت کے مطالبے کو سمجھتے ہوئے خود سے شرعی عدالتیں کیوں قائم نہیں کر سکتے؟

۳۔ بلادِ حرمین سے غیر مسلم افواج کا اخراج:

گزشتہ دہائی میں مسلمانوں کے تین بڑے دشمن امریکا، برطانیہ اور فرانس ایک زبردست

حیلے اور انتہائی مکارانہ سازش کے تحت ہمارے مقدس مقامات میں بھاری سامان حرب کے ساتھ داخل ہو گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا المیہ اور اتنا افسوس ناک واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد اتنا بڑا کوئی اور سانحہ رونما نہیں ہوا۔ رونا صرف اس بات کا نہیں کہ دشمن نے گھر میں گھس کر مورچہ بنالیا ہے، دہائی اس پر ہے کہ اہل ملت اس نقب زنی سے بے خبر ہیں۔ جاننے والے خلق کا سارا زور خرچ کر کے پکار رہے ہیں کہ ابرہہ کالشکر قریب آپہنچا ہے لیکن فرزندانِ اسلام ان کے واویلے پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں۔

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اگر کسی مسجد کے نمازیوں کو بھنک پڑ جائے کہ مسجد کے قبلہ کی سمت کچھ منحرف ہے تو اگرچہ اس کا انحراف اتنا نہ ہو کہ نماز کی صحت پر اثر ڈالے لیکن اکثر نمازی نماز خراب ہونے کے وسوسے میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہاں حال یہ ہے کہ کعبۃ اللہ، مسجد نبوی، شعائرِ اسلام اور پوری ارضِ حرم پر ایک منصوبے کے تحت، غاصبانہ نیت کے ساتھ، مکمل تیاری کر کے یہود ونصاریٰ کی عالمی قوتیں اپنا تسلط حاصل کرنے کے آخری مراحل کو آپہنچی ہیں اور سوا ارب مسلمان ان کو اپنا محافظ، خیر خواہ اور ہمدرد سمجھے بیٹھے ہیں۔

مسلمان کس طرح اپنے ان مقدس اور متبرک ترین مقامات کا تحفظ کرتے ہیں اور کب جہاد وقتال کے حکم الٰہی وسنت نبوی کو اختیار کر کے ان بھیڑیے نما محافظوں کو دارالکفر میں واپس بھیجتے ہیں، یہ نئی صدی کا وہ چیلنج ہے جو عنقریب اپنی تمام تر شدت کے ساتھ عالمِ اسلام کے سامنے آکھڑا ہوگا۔ اے کعبہ کے پاسبانو! حرم کے تقدس کی قسم کھانے والو! کیا تم نے اس کے لیے کوئی تیاری کی ہے؟ ایسے معرکے کے لیے کوئی سامان کیا ہے؟ جس کی گرمی میں گھسے بغیر اب کوئی چارہ نہیں رہا۔

۴۔ بیت المقدس اور بابری مسجد کی واگذاری:

اندلس کی مسجد قرطبہ کا غم ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ بیت المقدس کے ہاتھ سے جاتے رہنے کا صدمہ امت مسلمہ کو برداشت کرنا پڑا۔ اور بیت المقدس کا صدمہ ابھی ہلکا نہ ہوا تھا کہ بابری مسجد

ڈھا دیے جانے کی قیامت دیکھنا پڑی۔ جامع قرطبہ کے مینار دُہائی دیتے رہے، ہم دنیا پرستی میں مست رہے، یہاں تک کہ کفر کے ناپاک قدم مسجدِ اقصیٰ کی دہلیز تک آ پہنچے۔ مسجد اقصیٰ کا گنبد ہماری بے حسی کا نوحہ کرتا رہا، ہم بے سدھ پڑے رہے، یہاں تک کہ بابری مسجد کا سانحہ پیش آ گیا۔ اور اب اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے نبرد آزما ہو کے اللہ تعالیٰ کو راضی نہ کیا تو نجانے کتنی قیامتیں ہمارے سروں پر آئی کھڑی ہیں۔ اندلس کے عیسائیوں، اسرائیل کے یہودیوں اور بھارت کے ہندوؤں نے اسلام سے دشمنی کرنے اور مسلمانوں کو نیچا دکھانے میں کسر نہیں چھوڑی۔ اب مسلمانوں کی باری ہے کہ وہ ان کے چیلنج کا جواب کس انداز میں دیتے ہیں؟ اے قرطبہ کے مینارو! ہم تمہیں گواہ بنا کے رب ذوالجلال سے عہد کرتے ہیں کہ تمہیں ایک بار پھر تکبیر کی زمزمہ بار صداؤں سے آباد کریں گے۔ اے مسجد اقصیٰ کے گنبد! تیری عظمت اور تقدس کی پاسبانی ہم اپنا خون دل دے کے کریں گے۔ اے بابری مسجد! تیری ہر اینٹ جب تک اپنی جگہ نہ لگ جائے یہ زندگی ہم پر بوجھ ہے۔ تیرے شہید ہو جانے والے منبر و محراب میں بیان کی جانے والی عظمت الٰہی کی قسم! تو دیکھے گی کہ تیرے بیٹے، تیرے جانباز کس طرح تیرا بدلہ لیتے ہیں۔ اے نوجوانانِ اسلام بے غیرتی کی زندگی کی تہمت کب تک اپنی گردنوں پر اُٹھائے پھرو گے؟ اب اٹھ پڑو! ایمان و عزیمت کے ایک نئے سفر کا آغاز کرو، جس کی ابتدا بابری مسجد کی واگذاری سے اور انتہا بیت المقدس کی واپسی اور قرطبہ کی آزادی سے ہو۔

۵۔ مقبوضہ مسلم خطوں کی آزادی:

شریعت کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ جو جگہ مسلمانوں کی زیر نگیں ہو پھر کفر اس پر تسلط جما لے تو اس کے ایک ایک انچ کو چھڑانا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی سنگین جرم ہے۔ افسوس کہ ہم میں وہ مذہبی غیرت نہ رہی جس کے سبب مقبوضہ مسلم خطوں کی آزادی کے بغیر ہم جینے کو عار سمجھتے۔ تعجب ہے کہ گندی مٹی سے بنائے گئے ننگے بتوں کو پوجنے والا بنیا اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھتا ہے جبکہ اس کی جھولی میں سوائے رسوائی کے دھبوں اور شکست کے داغوں کے کچھ نہیں...... اور ہم اتنی درخشاں تاریخ اور شاندار ماضی رکھتے ہوئے اکھنڈ پاکستان

کے مشن سے لاتعلق ہیں۔ کیا پہلے راس کماری سے خیبر تک اور مالا بار کے ساحل سے ہمالیہ کے پہاڑوں تک سارے کا سارا خطہ مسلمانوں کا نہ تھا؟ جب پورا برصغیر مسلمانوں کا تھا تو ہم کشمیر پر اکتفا کیوں کریں؟ ہمیں کشمیر سے دہلی تک اور گروزنی سے غزہ تک سارے مقبوضہ علاقوں کو چھڑانا ہے۔ اگر اسلامی سلطنت کے پرچم تلے ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی جگہ رہی ہے اور اس میں سے ایک چپہ بھی ہندو کے قبضے میں ہے تو ہماری ذمہ داری پوری نہ ہوگی اور اس کی فکر نہ کرنے پر روزِ قیامت ہماری پکڑ ہوگی۔ ان خطوں کی آزادی نئی صدی کا بہت بڑا چیلنج ہے۔

تلواروں کے سائے تلے سے:

برادران اسلام! نئی صدی بہت سے چیلنج اپنے دامن میں لے کے آئی ہے۔ ان سے نمٹنے کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ ہم تقویٰ وطہارت کے ذریعے اپنے ظاہر وباطن کی گندگیاں دور کرلیں۔ ذکر وعبادت سے خود کو آراستہ کریں۔ تزکیہ قلب اور تعلق مع اللہ کی دولت حاصل کریں اور ان صفات کو لے کر اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبے کے لیے جہاد وقتال کے مبارک ومقدس راستے پر گامزن ہو جائیں۔ ہمیں اب لوحِ قلب پر نقش کرلینا چاہیے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راستہ تلوار کے سائے تلے سے ہو کر جاتا ہے۔

صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟

زمیں حیران ہے ساکت آسمان ہے — فضاؤں سے بھی تاریکی عیاں ہے
تأسف کا تحیر کا سماں ہے — سراپا مسجد اقصیٰ فغاں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
جسے خیبر سے دھتکارا وہی ہے — یہی ہے دشمن مسلم یہی ہے
متاعِ دیں وایماں لٹ رہی ہے — مگر غافل حرم کا پاسباں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
ہے موقع دامن عصیاں کو دھولو — اگرچہ کڑوی ہو حق بات بولو
مسلمانو! خدارا آنکھیں کھولو — سنو! القدس سے تم کو اذاں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
بہت دشوار اُمّت پر گھڑی ہے — تباہی اس کے دروازے کھڑی ہے
حکمرانوں کو سیاست کی پڑی ہے — مگن کھیلوں میں اپنا نوجواں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
عرب کے پاس دولت کا ذخیرہ — عجم کے پاس ایٹم بم کا ہیرہ
یہی کیا اہل حق کا ہے وطیرہ — زباں رکھتے ہوئے بھی بے زباں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
نہتوں پر مظالم ڈھا رہا ہے — یہودی بزدلی دکھلا رہا ہے
یہ گیدڑ شہر کی سمت آرہا ہے — خود اپنی موت کی جانب رواں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟
فقط باتوں کا کوئی پھل نہیں ہے — اثرؔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے
مسلمانوں کی جبیں پر بل نہیں ہے — یہ کیا ناواقفِ سود وزیاں ہے
صلاح الدین ایوبی کہاں ہے؟

شاہین اقبال اثرؔ

اے ارضِ فلسطین

کافر کا وجود ارضِ مقدس کی ہے توہین
مدت سے تری پیٹھ پہ ہے ظلم کی تمرین
جب تک کہ نہ ہو زیرِ زمیں ظلم کی تدفین
ہوسکتی نہیں ہے دلِ مجروح کو تسکین
اے ارضِ فلسطین

تو ارضِ مقدس ہے کرامات کا مخزن
اعلیٰ ہے تری شان تو نبیوں کا ہے مسکن
تجھ سے ہی تر و تازہ ہے ایمان کا گلشن
ہم لوگ کریں گے تری اب خون سے تزئین
اے ارضِ فلسطین

مسلم کو مٹانے کا تقاضا لیے دل میں
جیتے ہیں فقط بُغض کا سودا لیے دل میں
صہیونی ریاست کی تمنا لیے دل میں
دنیا سے چلے جائیں گے بدمذہب و بددین
اے ارضِ فلسطین

گو امن کا دنیا میں تو بنتا ہے پرندہ
حالانکہ تری پیٹھ پہ ہے دستِ درندہ
تو اس کی فقط چشمِ عنایت سے زندہ
دنیا کو جو کرتا ہے فقط صبر کی تلقین
اے ارضِ فلسطین

مانا کہ تو مجبور ہے مقہور ہے فی الحال
چھن جاتے ہیں فرزند ترے سینکڑوں ہر سال
پر لائقِ صد رشک ہیں واللہ ترے لال
ہیں تیرے فدائی بھی عجب قابلِ تحسین
اے ارضِ فلسطین

پھونکوں سے دیا حق کا تو مدھم نہیں ہوتا
اس ظلم سے یہ ذوقِ جنوں کم نہیں ہوتا
ہاں پنجۂ کرگس میں کوئی دم نہیں ہوتا
آزاد کرائیں گے تجھے اب مرے شاہین
اے ارضِ فلسطین

ہم وقت کی آواز کا ادراک کریں گے
گو دست و گریباں کو بھی چاک کریں گے
صہیونی غلاظت سے زمیں پاک کریں گے
جذبہ یہ حقیقت بنے کہہ دو ذرا آمین!
اے ارضِ فلسطین

حاصل تمنائی

فلسطینی مسلمانوں کا جنگی ترانہ

سَنَخُوضُ مَعَارِکَنَا مَعَهُمْ — وَسَنَمْضِی جُمُوعاً نَرْدَعُهُمْ
ہم دشمن کے خلاف میدانِ کارزار میں کود پڑیں گے — اور ہم لشکروں کی صورت ان پر جا پڑیں گے

وَنُعِیدُ الْحَقَّ الْمُغْتَصَبَ — وَبِکُلِّ الْقُوَّةِ نَدْفَعُهُمْ
ہم اپنا غصب شدہ حق چھین لیں گے — اور پوری قوت کے ساتھ ہم دشمن کو پسپا کریں گے

بِسِلَاحِ الْحَقِّ الْبَتَّارِ — سَنُحَرِّرُ أَرْضَ الْأَحْرَارِ
حق کی حمایت میں تیز دھار اسلحے کے ساتھ — ہم آزاد لوگوں کی سرزمین کو چھڑوا کر دم لیں گے

وَنُعِیدُ الطُّهْرَ إِلَی الْقُدْسِ — مِنْ بَعْدِ الذُّلِّ وَذَا الْعَارِ
اور ہم بیت المقدس کی حرمت واپس دلائیں گے — اس کے چھین لیے جانے کی ذلت اور رسوائی کے انتقام میں

وَسَنَمْضِی نَدُکُّ مَعَاقِلَهُمْ — بِدَوِیٍّ دَامٍ یُقْلِقُهُمْ
اور ہم دشمن کی پناہ گاہوں کو زمین بوس کر دیں گے — ایسی زوردار ضرب کے ساتھ جو ہڈیوں تک کو ہلا ڈالے گی

وَسَنَمْحُو الْعَارَ بِأَیْدِینَا — وَبِکُلِّ الْقُوَّةِ نَرْدَعُهُمْ
اور ہم جلد ہی عار کے داغ کو اپنے ہاتھوں سے مٹادیں گے — اور بھرپور قوت کے ساتھ دشمن کو نکال بھگائیں گے

لَنْ نَرْضَ بِجُزْءٍ مُّحْتَلٍّ — لَنْ نَتْرُکَ شِبْرًا لِلذُّلِّ
ہم ارض مقدس کے کسی حصے پر قبضہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے — اور کسی صورت میں ایک بالشت زمین بھی یہود کے قبضے میں نہیں چھوڑیں گے

سَتَمُوْرُ الْأَرْضُ وَتَحْرِقُهُمْ — فِی الْأَرْضِ بَرَاکِینٌ تَغْلِی
عنقریب زمین لاوا اگلے گی اور دشمن کو پھونک ڈالے گی — (ہمارے سینوں کی) زمین میں بہت سے آتش فشاں ہیں جو دہک رہے ہیں

بیت المقدس کی تلاش

15ویں صدی ہجری، ان شاء اللہ اسلام کی صدی ہوگی
لیکن اس بات کا فیصلہ بیت المقدس میں ہوگا

کیفؔ بنارسی

تجلیوں کا سراپا تلاش کرتا ہوں نیازِ پیکرِ جلوا تلاش کرتا ہوں
شعار و طرزِ وفا تلاش کرتا ہوں سرشتِ دل کا تقاضا تلاش کرتا ہوں
کبھی مٹا نہ سکے جس کو نشۂ صہبا خلش کچھ ایسی، غم ایسا تلاش کرتا ہوں
سکون روح کو اِک لمحہ بھی نصیب نہ ہو کچھ ایسی شورشِ برپا تلاش کرتا ہوں
سماں وہ ہو کہ دہل جائے ہر حریف کا دل اِک حشر خیز نظارا تلاش کرتا ہوں
نثار جس پہ ہوں رنگینیاں بہاروں کی وہ اِک تبسمِ سادہ تلاش کرتا ہوں
قدم قدم پہ کھلا دے جو آرزو کے چمن وہ رنگ و بوئے شگفتہ تلاش کرتا ہوں
بہادے نور کے دریا میں موجِ ہستی کو وہ دل نواز اشارا تلاش کرتا ہوں
سجا رہا ہوں میں تابانیاں تصور میں جمالِ شاہدِ رعنا تلاش کرتا ہوں
یہ چند پھول بھلا کس کے کام آئیں گے چمن بدوش نظارا تلاش کرتا ہوں
مہ و نجوم کی تابندگی سے کیا ہوگا دل و نظر کا اُجالا تلاش کرتا ہوں

کسی بہارِ مجسم کی جستجو ہے مجھے — کوئی جمیل سراپا تلاش کرتا ہوں
ہزار پردوں میں بھی حق نہ چُھپ سکے جس سے — وہ نورِ دیدۂ بینا تلاش کرتا ہوں!
ہر ابتداء میں نظر انتہا پہ رہتی ہے — ہر اِک عمل کا نتیجہ تلاش کرتا ہوں
صدا یہ آتی ہے دِل کے قریب سے کیسی — مجھے یہ کس نے پکارا تلاش کرتا ہوں
نگارِ وقت کی تاریخ لکھ رہا ہوں میں — شکوہِ عظمتِ رفتہ تلاش کرتا ہوں
جہاں ہے بے ادبی حسنِ انجمن کی دلیل — وہاں ادب کا سلیقہ تلاش کرتا ہوں
شریک جس میں ہو دنیا وہ درد ہی کیا ہے — وہ غم جو صرف ہو اپنا تلاش کرتا ہوں
ریا و حرص کا جس جا کبھی گزر بھی نہ ہو — جہاں میں ایسا ٹھکانہ تلاش کرتا ہوں
وہ نقش ہائے محبت جنہیں کسی صورت — مٹا سکے نہ زمانہ تلاش کرتا ہوں
جو سوزِ درد سے گرما دے اہلِ محفل کو — لبِ وفا پہ وہ نغمہ تلاش کرتا ہوں
برائے حق جسے سقراط نے پیا تھا کبھی — وہ زہرِ غم کا پیالہ تلاش کرتا ہوں
جو دوسروں کے لیے بے قرار ہو ہر دم — وہ مشتِ خاک وہ پارا تلاش کرتا ہوں
تمام گردشِ دوراں سمیٹنے کے لیے — دل فراخ و کشادہ تلاش کرتا ہوں
لبوں میں اب نہیں باقی مجالِ گویائی — مگر خلوص کا نعرہ تلاش کرتا ہوں
خیالِ دوست، غمِ شوق، آنسوؤں کے چراغ — وفا کی راہ میں کیا کیا تلاش کرتا ہوں
وہ سوزِ درد جو مردہ دلوں کو زندہ کرے — نفس نفس میں مچلتا تلاش کرتا ہوں
مِرے حبیب، مِرے دِل کو روشنی ہو عطا — تیرے خیال کی دنیا تلاش کرتا ہوں
کسی کی آہ مسلسل سنائی دیتی ہے — جو ساز پر کوئی نغمہ تلاش کرتا ہوں
بہت دنوں سے تخجل شوقِ جبہ سائی ہے — کہاں گیا درِ کعبہ تلاش کرتا ہوں

بہت دنوں سے صدائے اذاں نہیں آئی — جو اُڑ گیا ہے وہ نغمہ تلاش کرتا ہوں
جہاں پہ ظلمتِ دوراں ہوئی ہے سایہ فگن — وہاں دلوں کا اُجالا تلاش کرتا ہوں
شبِ دراز اَلم کا جہاں تسلط ہے — وہاں میں نور کا تڑکا تلاش کرتا ہوں
ہوا کے رخ پہ جلاتا ہوں آرزو کے چراغ — اندھیری شب میں سویرا تلاش کرتا ہوں
وہ گلستانِ تمنا، وہ آرزو کا چمن — لہو سے جس کو سنوارا تلاش کرتا ہوں
بھٹک رہا ہوں بگولوں کی طرح صحرا میں — کسی کا نقشِ کفِ پا تلاش کرتا ہوں
وہ جس کے لٹنے پہ غیرت نہ آئی ملت کو — وہ نقشِ مسجد اقصیٰ تلاش کرتا ہوں
غمِ حیات، غمِ دوجہاں ہیں ناکافی — کچھ اور ان کے علاوہ تلاش کرتا ہوں
جو کشتگانِ رہِ حق کو زندگی بخشے — وہی دوا و مسیحا تلاش کرتا ہوں
ضیاء سے جس کی فروزاں ہو سینۂ ملت — وہ لو، وہ سوز، وہ شعلہ تلاش کرتا ہوں
حقیقتِ ابدی جس کا بن گیا عنوان — وہ لازوال فسانہ تلاش کرتا ہوں
الٰہی قوتِ پرواز بخش دے مجھ کو — بلند عزم و ارادہ تلاش کرتا ہوں
الٰہی بیتِ مقدس کی جستجو کے سوا — تجھے خبر ہے کہ میں کیا تلاش کرتا ہوں
جہانِ کفر کی یورش ہے اہلِ ایماں پر — میں ان بلاؤں کا صدقہ تلاش کرتا ہوں
جو دست و بازوئے باطل کو موڑ کر رکھ دے — وہ ایک آہنی پنجہ تلاش کرتا ہوں
کبھی خلوص کے موتی پروئے تھے جس میں — وہ اتحاد کی مالا تلاش کرتا ہوں
اُٹھا رہے ہیں سر، اس دور میں نئے فرعون — عصائے حضرت موسیٰ تلاش کرتا ہوں
تمام عالمِ اسلام کو جو تڑپا دے — میں سازِ دل میں وہ نغمہ تلاش کرتا ہوں
اجل بھی آئے تو پیغامِ زندگی لائے — جہاد کا وہ قرینہ تلاش کرتا ہوں

چمن چمن ہے کہ مقتل ہے آرزوؤں کا گلوں میں خونِ تمنا تلاش کرتا ہوں
کہاں ہیں مفتیِ دینِ مبین و شرعِ متین جہادِ شوق کا فتویٰ تلاش کرتا ہوں
بتائیں راہ مجھے واعظانِ ذوالاکرام میں اپنا قبلۂ اولیٰ تلاش کرتا ہوں
بجائے خون، بھری ہے رگوں میں آتش شوق ہر ایک موج میں شعلہ تلاش کرتا ہوں
چراغِ طور لیے پھر رہا ہوں صحرا میں نشانِ ملت بیضا تلاش کرتا ہوں
وفا کی راہ میں چھائی ہوئی ہے گردِ جفا میں اس غبار میں کعبہ تلاش کرتا ہوں
کہاں ہیں ناصر و انصار کچھ تو بتلائیں میں کب سے مسجدِ صحرا تلاش کرتا ہوں
زوال پر ہے عرب، اوج پر ہے اسرائیل مگر ہے اس کا سبب کیا تلاش کرتا ہوں
کہیں قیادتِ اعلیٰ کا تو قصور نہیں؟ سبب شکست کا ہے کیا تلاش کرتا ہوں
کہیں کمی تو نہ تھی جذبۂ جہاد میں کچھ گریز پائی کا نقشہ تلاش کرتا ہوں
دمِ جدال یہ ہتھیار کند کیوں نکلے فریب کاریٔ دنیا تلاش کرتا ہوں
شکستِ فاش کی ذلت اُٹھائی ملت نے شعورِ رہبرِ دانا تلاش کرتا ہوں
قدم قدم پہ جلاتا ہوں آگہی کے چراغ کہاں کہاں ہے اندھیرا تلاش کرتا ہوں
یہ کشمکش، یہ لڑائی، یہ باہمی رنجش ہوا جو گھر تہ و بالا تلاش کرتا ہوں
تمام عالمِ اسلام کیوں نہیں اُٹھتا فریبِ وعدۂ فردا تلاش کرتا ہوں
یہ آسماں سے لہو کس لیے نہیں برسا رموزِ عالمِ بالا تلاش کرتا ہوں
ہزار مرحلۂ مرگ و زیست کی زد میں فقط خدا کا سہارا تلاش کرتا ہوں
نہیں یہ ہوش کہ اپنے مکاں کی فکر کروں ابھی تو خانۂ کعبہ تلاش کرتا ہوں
عدو سے چھین لے بڑھ کر جو قبلۂ اوّل وہ مردِ حر، وہ جیالا تلاش کرتا ہوں

جلا کے خاک جو کردے غرورِ اعداء کو
وہ اضطراب کا شعلہ تلاش کرتا ہوں

یہیں سے مجھ کو ملے گا نشانِ منزل کا
کلامِ حق کا صحیفہ تلاش کرتا ہوں

کدھر چلے گئے دنیا میں عاشقانِ رسول
فضائے یثرب و بطحا تلاش کرتا ہوں

خدا کے نام کی اس دور میں جو لاج رکھے
کہاں چھپا ہے وہ بندہ تلاش کرتا ہوں

تمام عالمِ اسلام جس میں شامل ہو
اِک ایسی جنگ کا نقشہ تلاش کرتا ہوں

سیاہ کر کے رہوں گا جہانِ اسرائیل
تجلیِ یدِ بیضا تلاش کرتا ہوں

جو بدر و خیبر و خندق میں مردِ میداں تھے
وہ سرفروش دوبارا تلاش کرتا ہوں

عروجِ ثاقب و زہرہ کی کیا حقیقت ہے
کہ اوجِ مسجدِ اقصیٰ تلاش کرتا ہوں

کل انبیا کی نمازوں کا جو امین رہا
وہ انبیا کا مصلیٰ تلاش کرتا ہوں

خدا کی راہ میں مرنا ہے زندگی کی دلیل
شہادتِ رہِ مولا تلاش کرتا ہوں

وہ مردِ مومن و مردِ مجاہدِ ملت
بدل سکے جو زمانہ تلاش کرتا ہوں

خدا نے خود جسے عنوانِ جاوداں بخشا
وہی شہادتِ عظمیٰ تلاش کرتا ہوں

وہ آرزوئے شہادت جو زندگی کی ہے روح
وہی ہے دل میں تمنا تلاش کرتا ہوں

فغاں کہ ارضِ مقدس کا غم بڑا غم ہے
غلافِ خانۂ کعبہ تلاش کرتا ہوں

دھواں بنا کے اُڑانا ہے فوجِ اعدا کو
جلالِ خالقِ یکتا تلاش کرتا ہوں

الٰہی ارضِ مقدس ہو اور جبینِ نیاز
مقامِ در خورِ سجدہ تلاش کرتا ہوں

دُعائے کیفؔ حزیں مستجاب ہوجائے
رسولِ حق کا وسیلہ تلاش کرتا ہوں
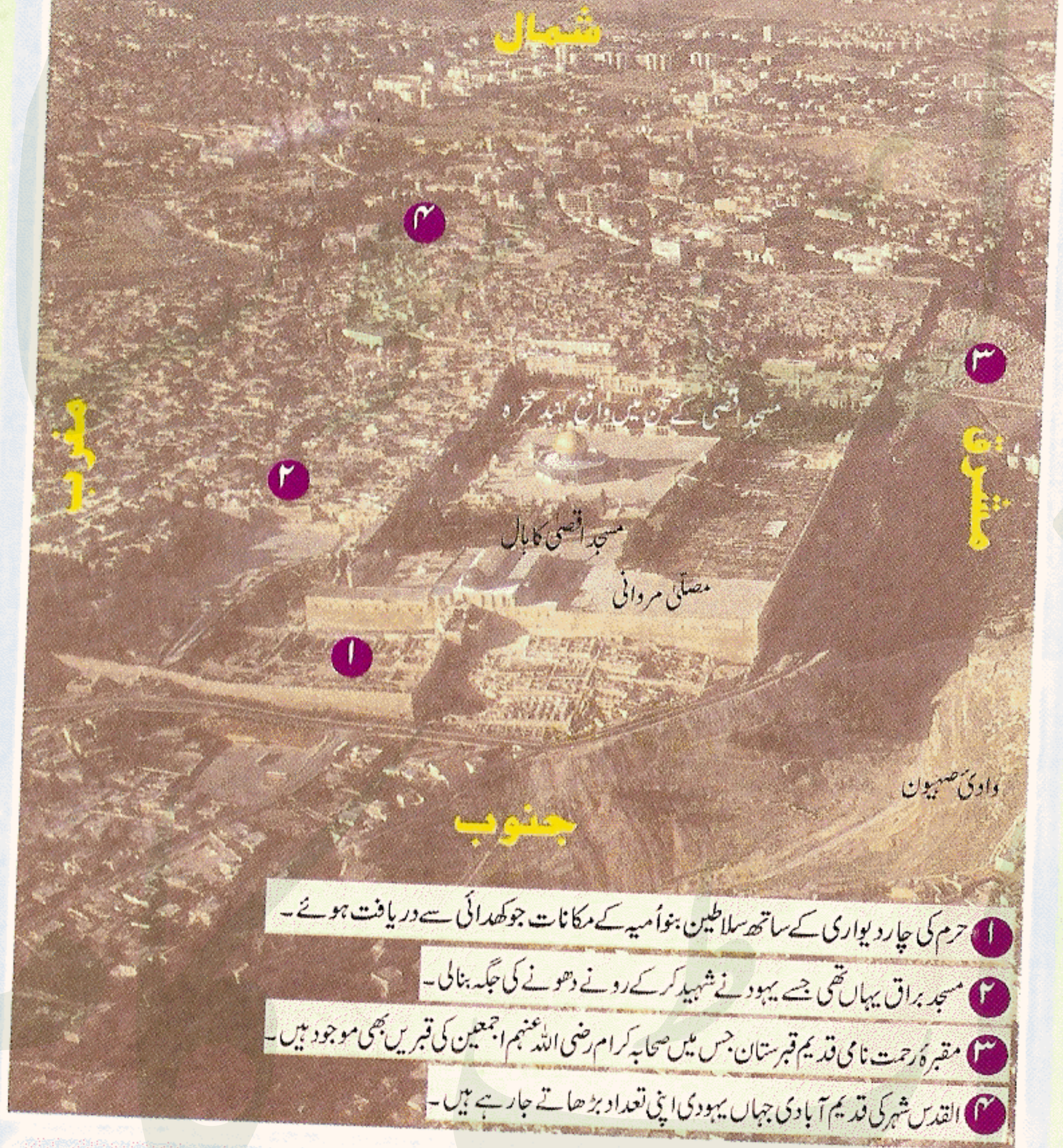
ایک شاہکار تصویر جس میں حرم قدسی سے متعلق کچھ بنیادی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہ مسجد مسلمانوں کی عزت و غیرت کی علامت ہے لیکن عام طور پر مسلمان اس کی تفصیلات سے ناواقف ہیں۔ اس قسم کی تصاویر کی اشاعت کا اصل مقصد نوجوان نسل کو ان کا فرض (یعنی مسجد اقصیٰ کی بازیابی) یاد دلاتے رہنا ہے۔

تصویر کا اشاریہ: (۱) مسجد اقصیٰ کا ہال (۲) مسجد اقصیٰ کے صحن میں موجود چٹان پر قائم گنبد صخرہ (۳) دیوار براق (دیوارِ گریہ) (۴) قدیم شہر کے گرد قائم فصیل، القدس اس وقت دنیا کا واحد قدیم شہر ہے جس کے گرد قدیم فصیل آج بھی اصلی حالت میں قائم ہے۔ (۵) یہودی غاصبوں کی نئی آبادی
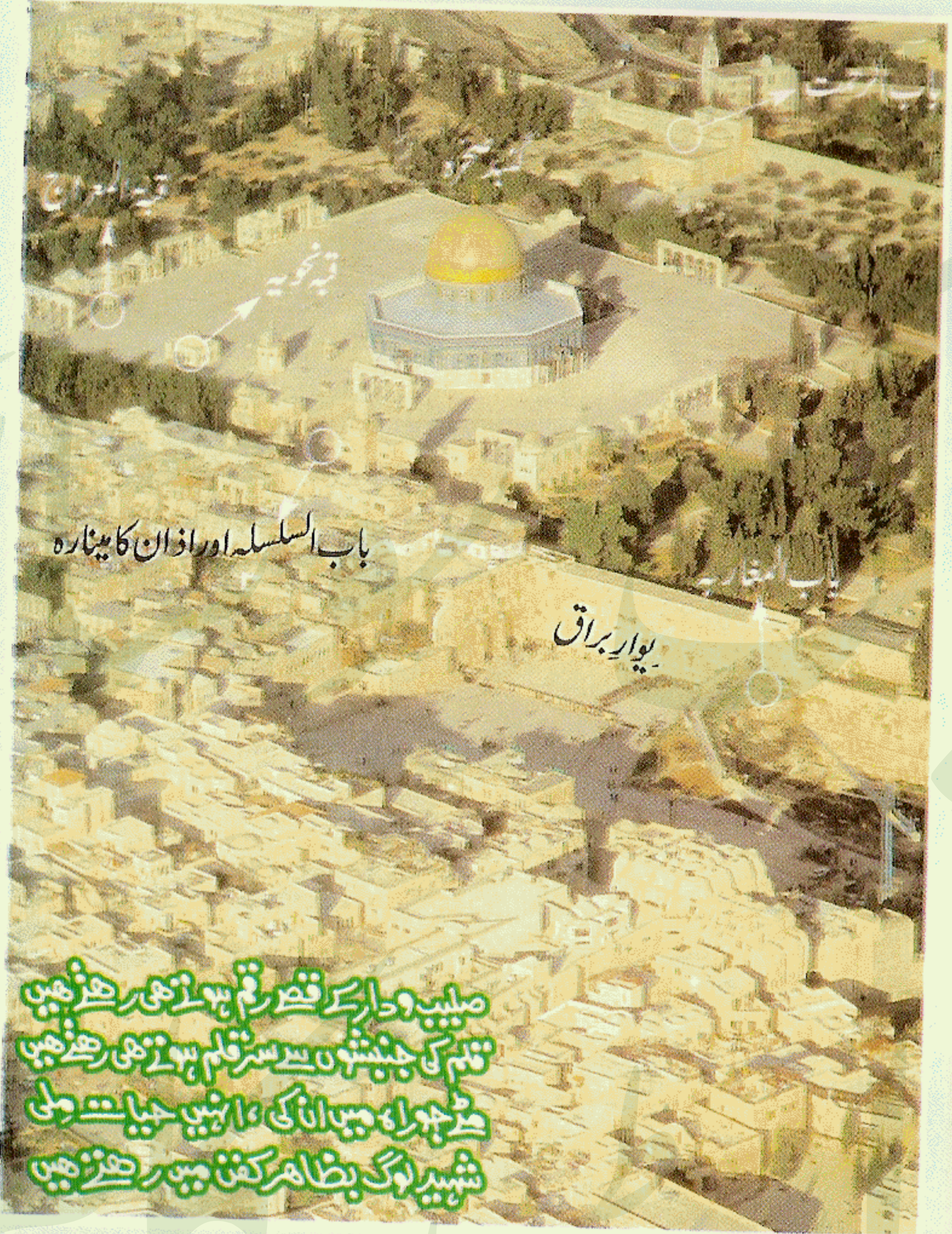
حرم قدسی (جسے مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس بھی کہتے ہیں) ایک اور زاویے سے۔ مسجد کی وہ دیوار بھی صاف نظر آ رہی ہے جسے یہودیوں نے دیوار گریہ قرار دے کر مسجد پر قبضے کی ابتدا کی کوشش کی ہے۔
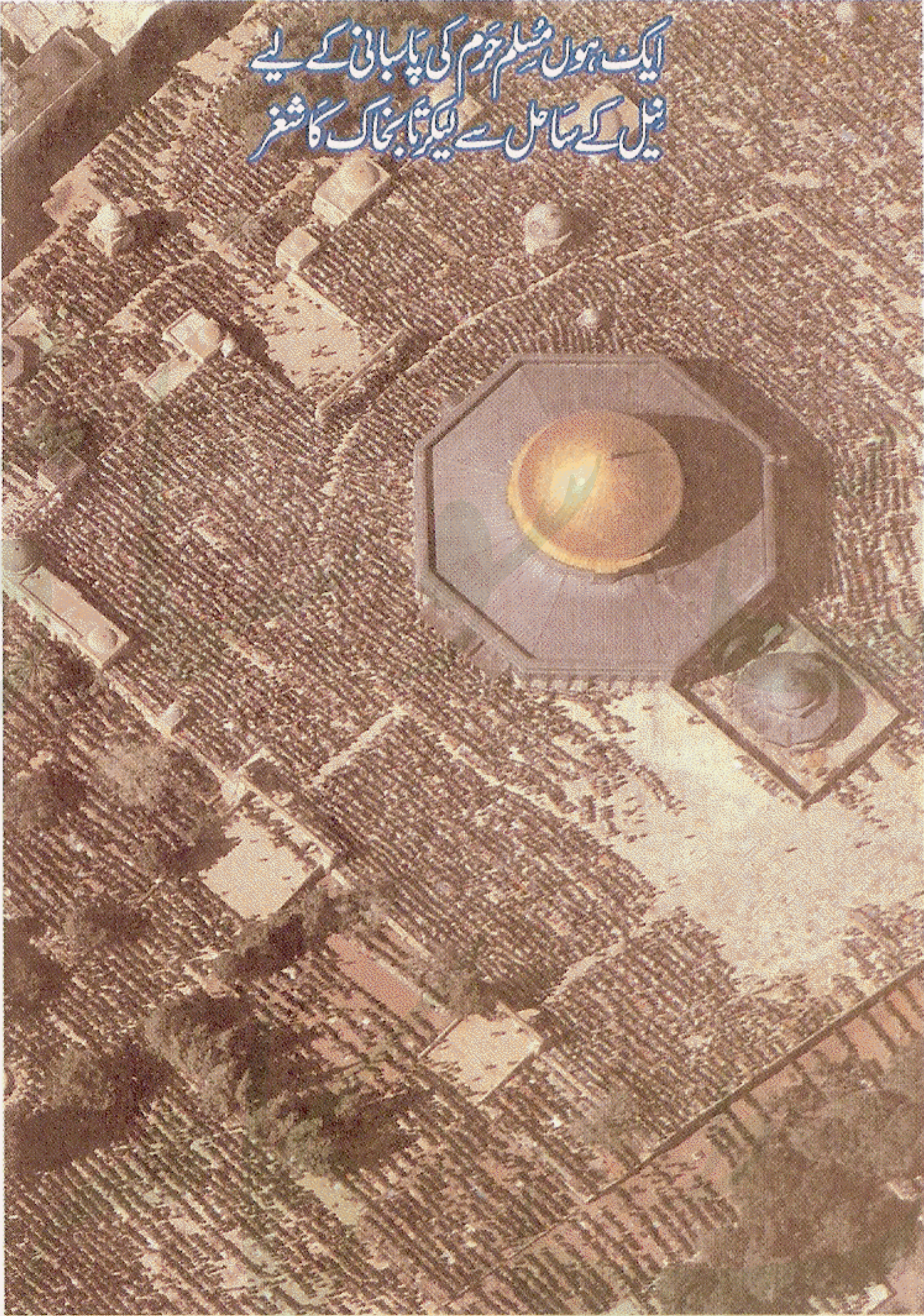
مسجد اقصیٰ کے صحن میں نمازِ جمعہ کے ادائیگی کے لیے شمع توحید کے پروانوں کا ایمان افروز اجتماع۔ مسلمانانِ فلسطین اس بات پر پوری امت کی طرف سے شکریے اور خرج تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود قبلۂ اول کے تحفظ کے لیے قربانیاں دینے میں کسر نہیں چھوڑی۔
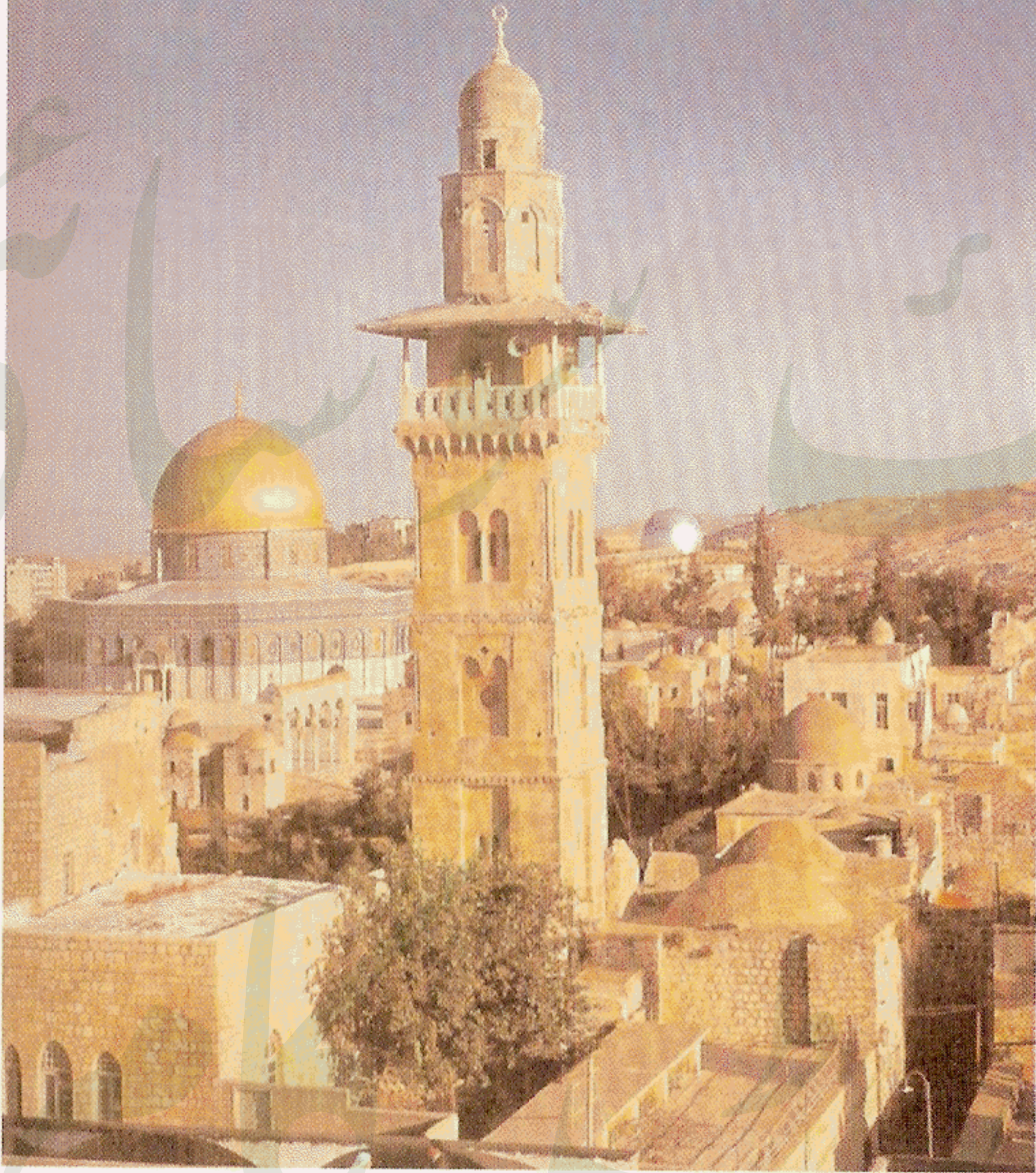
باب المغاربہ کی جانب سے ایک خوبصورت زاویہ۔ مینار مغاربہ کے دائیں طرف مسجد کے ہال پر قائم چھوٹا سبز گنبد
اور بائیں جانب مسجد کے صحن میں واقع بڑا زرد گنبد دکھائی دے رہا ہے۔

مسجد اقصیٰ کے ہال کا بیرونی اور اندرونی منظر۔ ہر چیز پر حزن وملال اور تاسف والم کی کیفیات محسوس کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ دل میں ایمان اور سینے میں غیرت ایمانی کے جذبات موجزن ہوں۔

مسجد اقصیٰ کا محراب جہاں تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے امام الانبیاء علیہ الصلاۃ والسلام کی اقتدا میں نماز ادا کی۔
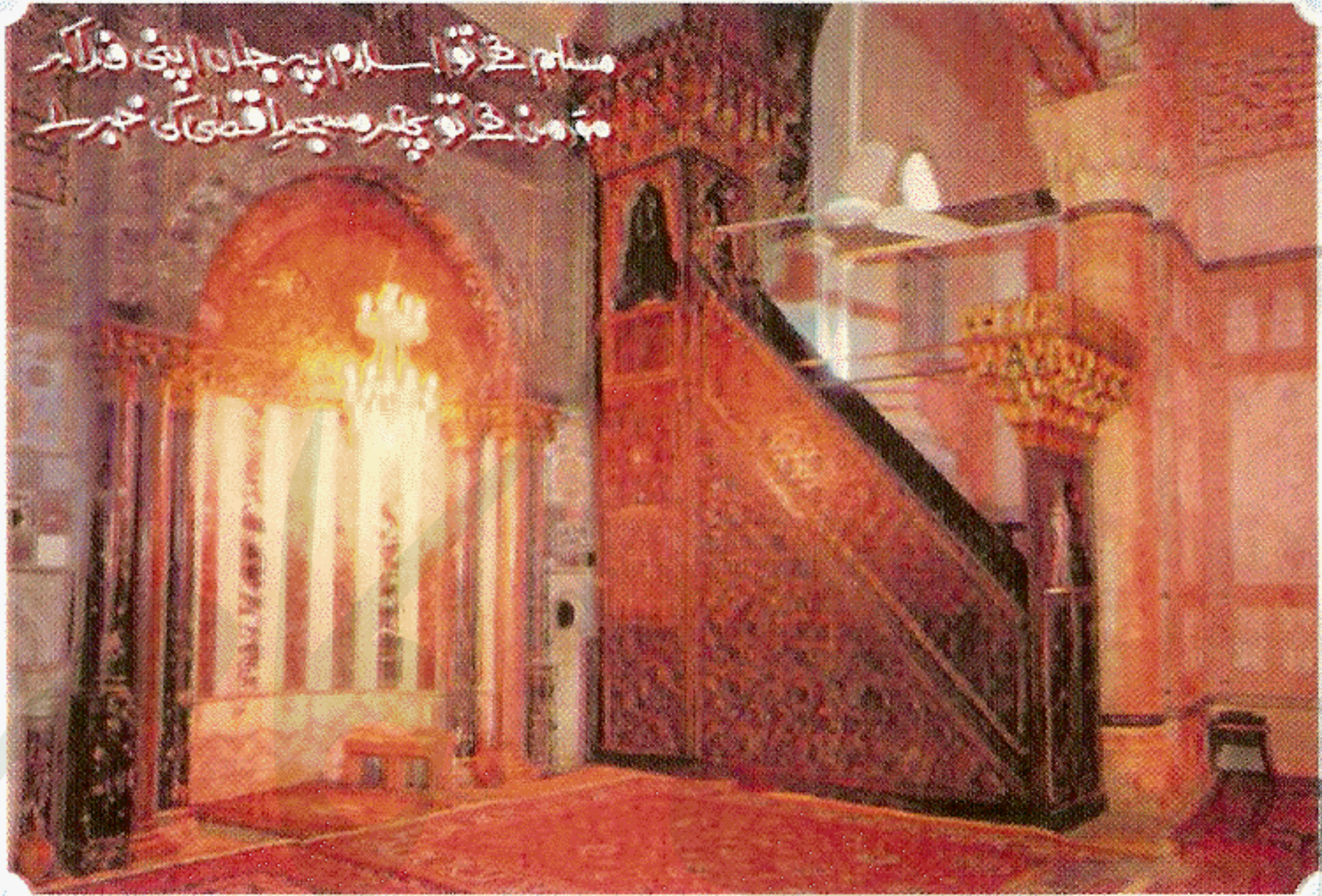
وہ تاریخی منبر جسے سلطان نورالدین زنگی نے تیار کروایا تھا اور پھر اس کے جانشین سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں اس منبر کی نظیر نہ تھی۔ یہودیوں نے اپنے خبث باطن کا ثبوت دیتے ہوئے ۱۹۶۷ء میں اس نایاب تاریخی یادگار کو جلا دیا۔
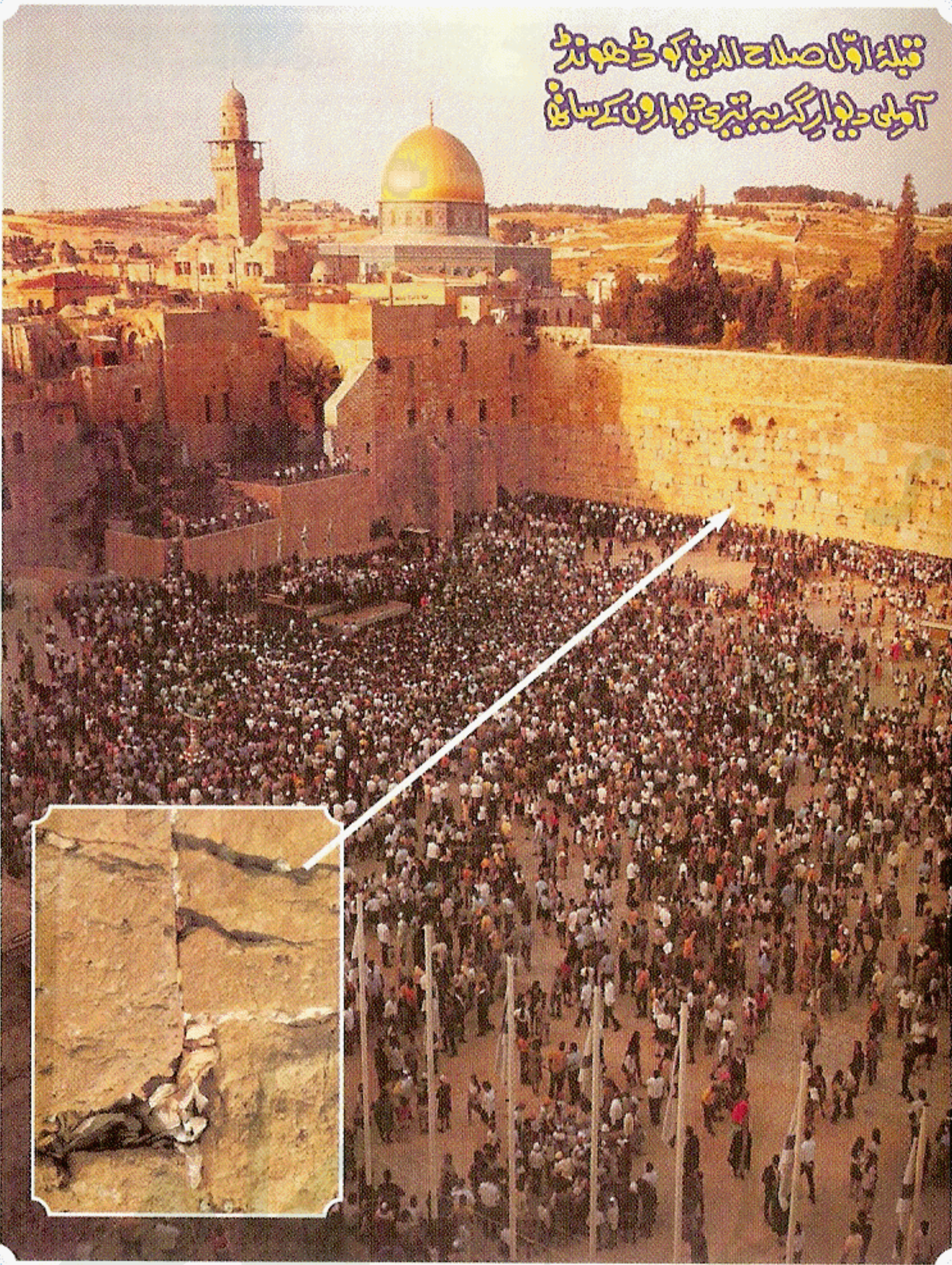
تصویر میں نظر آنے والی کھلی دیوار کو اہل اسلام "دیوارِ براق" کہتے ہیں۔ جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات مسجد میں داخلے کے وقت یہاں اپنی سواری "براق" کو باندھا تھا۔ یہودیوں نے یہاں قائم مسجد براق اور مسلمانوں کے مکانات گرا گرا اپنے رونے دھونے کی جگہ بنالی ہے۔ وہ دیوار کی درزوں میں اپنے مسیحائے منتظر (دجال اکبر) کے نام درخواستیں اڑستے رہتے ہیں (دیکھیے: چھوٹی تصویر) ان کی تقلید میں عالمی میڈیا اسے "دیوارِ گریہ" کے نام سے پکارتا ہے۔ مسلمانوں کو اس نام کی بجائے اصل نام "دیوارِ براق" سے پکارنا چاہیے۔

کہتی تجھ کو دنیا لہو رنگ فلسطین ہے
فی الحقیقت تو جنت کا اِک گل رنگین ہے

مسجد اقصیٰ کی ایک قدیم یادگار تصویر جس میں دیوار براق کے باہر مسلمانوں کے مکانات اور (دائرے میں) مسجد براق بھی نظر آ رہی ہے جسے بعد میں شہید کر دیا گیا۔
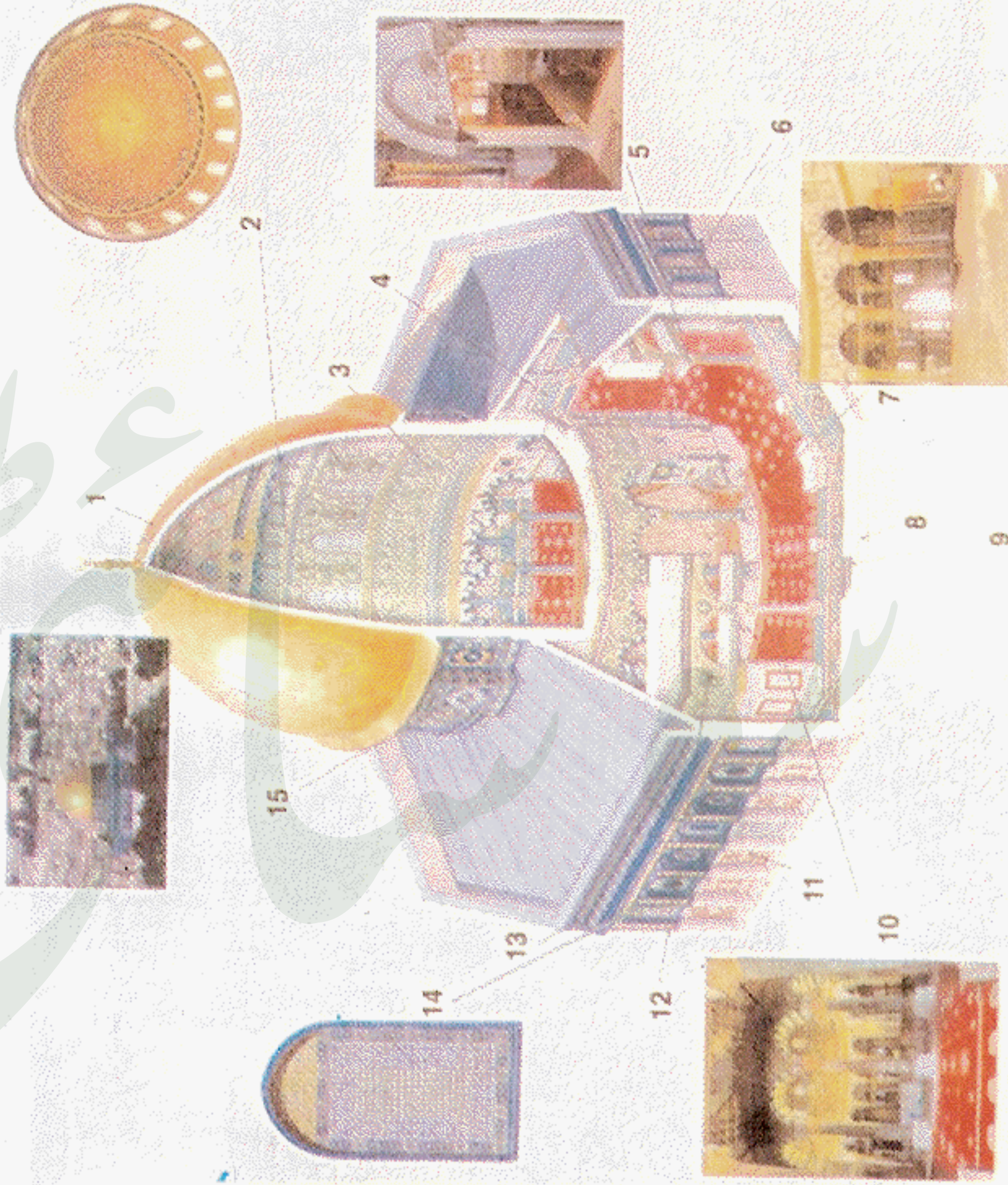
گنبد صخرہ کی تفصیلی معلومات

(۱) **گنبد کا بیرونی حصہ**: اصل میں گنبد تانبے کا بنا ہوا ہے۔ اس پر سونے کی ایک باریک تہہ چڑھا دی گئی ہے۔

(۲) **گنبد کا اندرونی حصہ**: یہ حصہ نہایت دلکش پھول کاری کے ڈیزائن اور خطاطی سے مزین ہے۔

(۳) گنبد کے نچلے حصے میں سبز اور سنہری ٹائلیں۔

(۴) بیرونی راہداری۔

(۵) یہ زینہ صخرہ معراج کے نیچے موجود غار کی طرف جاتا ہے۔

(۶) رنگین شیشوں والی کھڑکیاں۔

(۷) **معراج کا پتھر**: یہ وہ مقدس چٹان ہے جہاں سے ایک روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر لے جایا گیا تھا جب معراج کا معجزہ واقع ہوا تھا۔

(۸) بیرونی دیوار کا حصہ ۲۰٫۴ میٹر لمبا ہے۔ اس کی لمبائی بالکل گنبد کے قطر کے برابر ہے اور گنبد کی اونچائی کی پیمائش بھی اس کے برابر ہے۔

(۹) جنوبی داخلی راستہ۔

(۱۰) اندرونی راہداری۔

(۱۱) سنگ مرمر سے مزین حصہ۔

(۱۲) **آٹھ کونوں والی محرابی راہداری**: یہ حصہ اصل ٹائلوں سے سجا ہوا ہے اور اس پر کندہ اعلیٰ درجے کی اسلامی خطاطی عیسائیوں کو اسلام کی حقانیت قبول کرنے کا درس دیتی ہے۔

(۱۳) قرآنی آیات کی خوبصورت خطاطی۔

(۱۴) **ٹائلوں سے مزین حصہ**: اس میں مختلف رنگوں کے ٹائل لگے ہوئے ہیں۔

(۱۵) یہ حصہ بھی ٹائلوں سے سجا ہوا ہے جس پر قرآن مجید کی سترہویں سورت (سورہ اسراء) کی پہلی آیت لکھی ہوئی ہے۔

مسجد اقصیٰ کے صحن میں وہ مقدس چٹان واقع ہے جو مسلمانوں کا قبلۂ اول تھی۔ خلیفۃ المسلمین ولید بن عبد الملک نے اس پر وہ خوبصورت گنبد تعمیر کروایا جو خوبصورتی اور پائیداری میں اپنی مثال آپ ہے۔ دیے گئے خاکہ میں اس گنبد کے مختلف حصوں کا تعارف دیا گیا ہے۔

گنبد صخرہ نامی اس لافانی اور لازوال شاہکار کا رات کے وقت حسین منظر جسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔
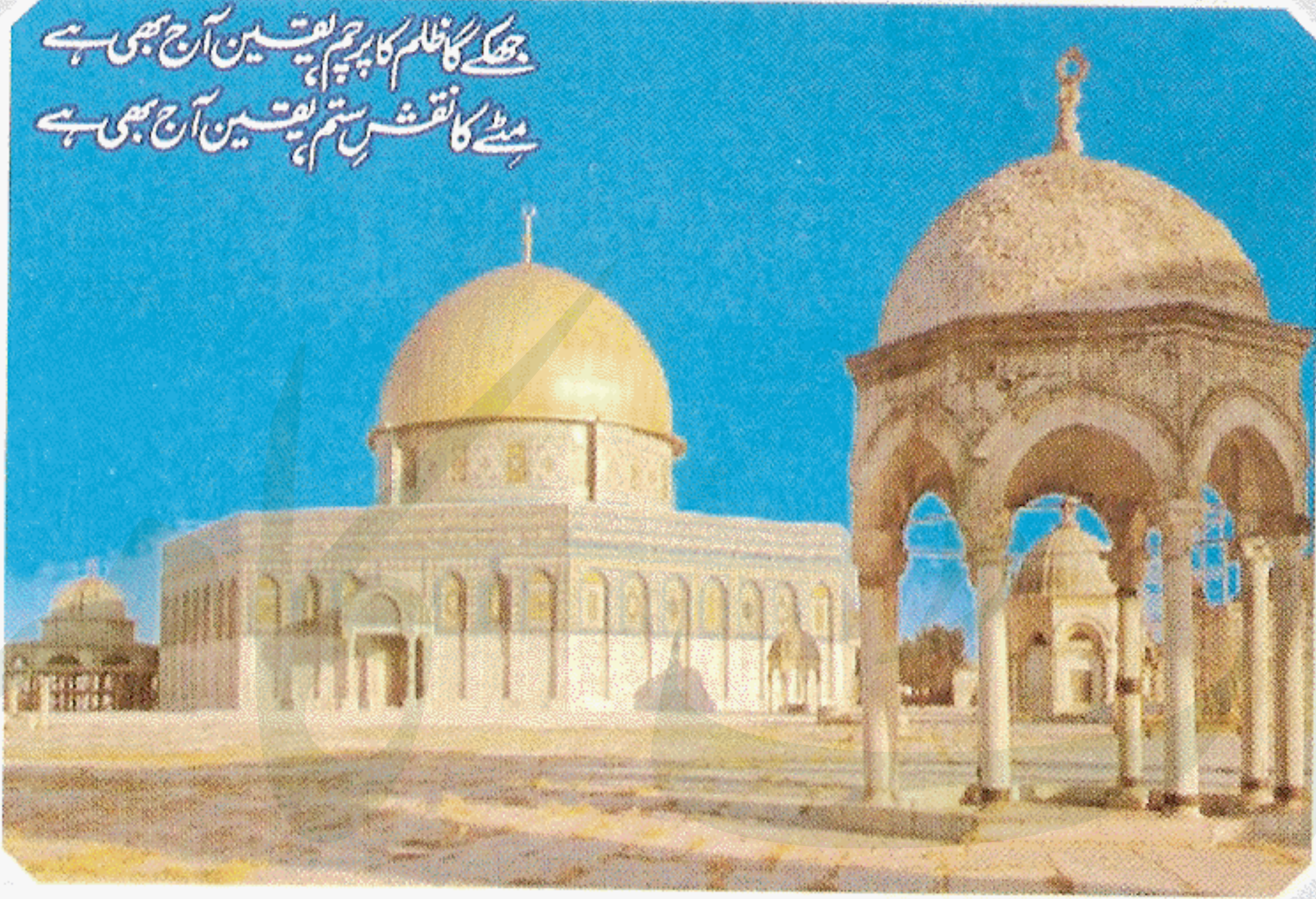
مسلمانوں کا مذہبی اور تاریخی ورثہ جس پر یہود کے قبضے کی وجہ سے چھائی اداسی اور سوگواری صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

ایک نایاب اور شاہکار تصویر جس میں مسجد اقصیٰ کے صحن میں قائم ایک قبے کے نیچے سے گنبد صخرہ کو فوکس کیا گیا ہے۔ تصویر میں نظر آنے والی ٹوٹ پھوٹ اور ویرانی بیک وقت یہود کی سنگدلی، فلسطینی مسلمانوں کی بے بسی اور امت مسلمہ کی بے حسی کی المناک کہانی سنا رہی ہے۔
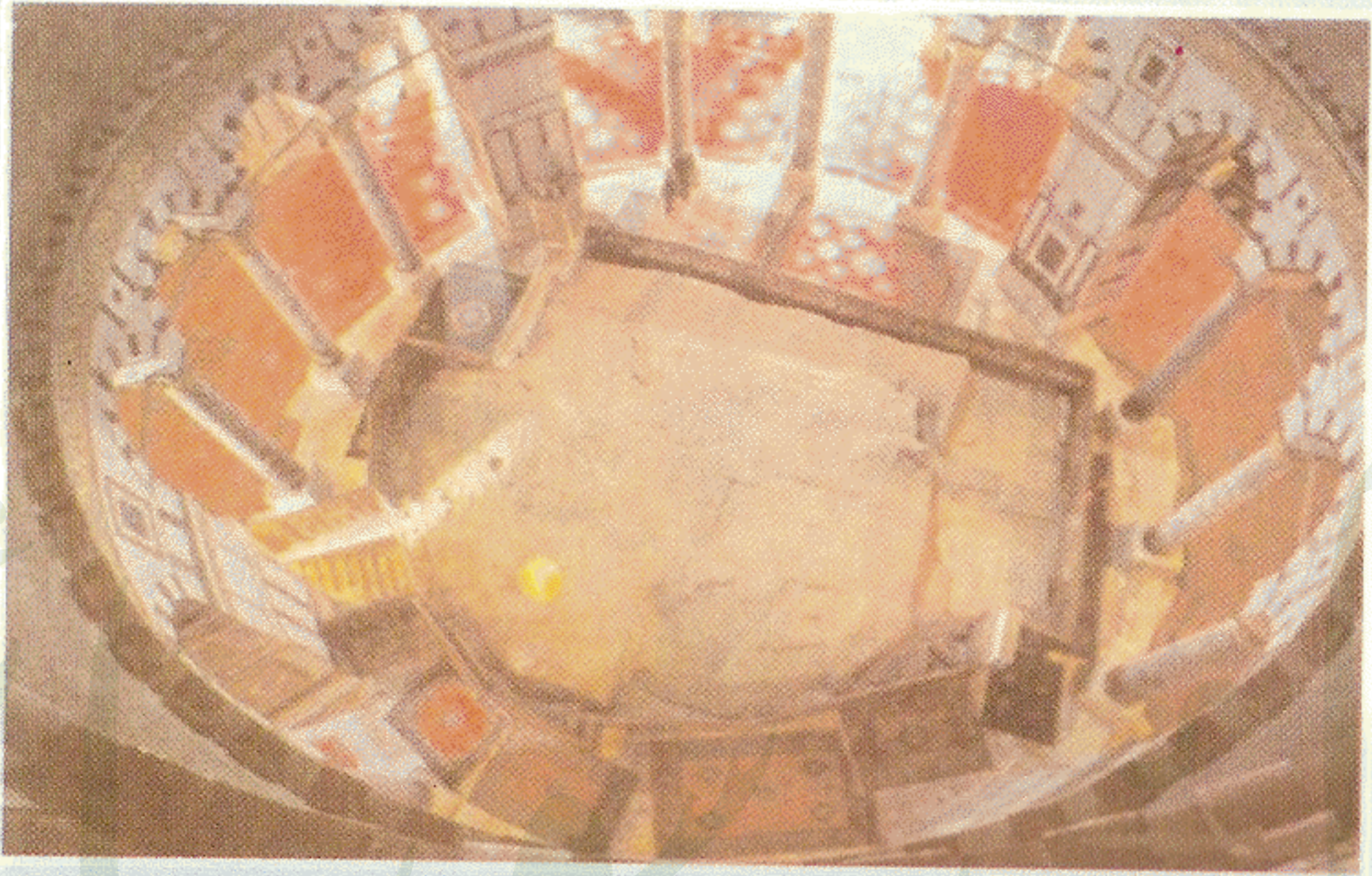
یہ وہ مقدس چٹان ہے جو مسلمانوں کا قبلہ اول رہی ہے۔الٹے ہاتھ پر چٹان میں واقع سوراخ اور وہ سیڑھیاں ہیں جو چٹان کے نیچے واقع قدرتی غار کی طرف جا رہی ہیں۔

مقدس چٹان کے نیچے واقع قدرتی غار جہاں مسلمان نماز اور تلاوت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ یہودیوں کی مذہبی داستانوں کے مطابق تورات کی اصل تختیاں اور تابوتِ سکینہ وغیرہ یہاں کہیں مدفون ہیں۔
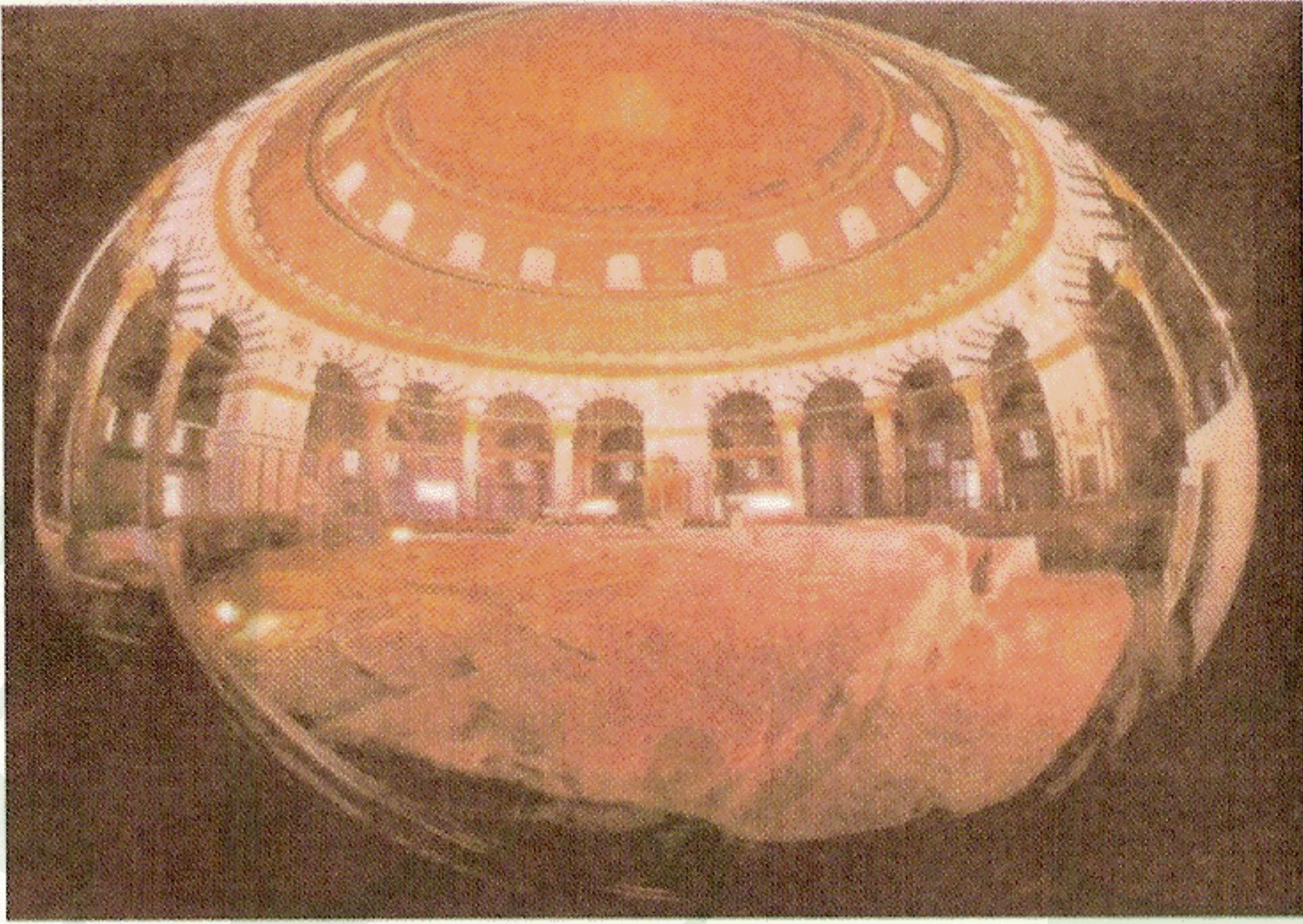
ایک فوٹوگرافر کے حسنِ ذوق نے مقدس چٹان اور اس پر قائم خوبصورت گنبد کو قیمتی نگینے کی طرح محفوظ کر دیا ہے۔

یہ چٹان مسلمانوں کے لیے حجر اسود کی طرح قابل احترام ہے۔ ایک مستند حدیث کے مطابق حجر اسود اور یہ چٹان دونوں جنت سے آئے ہیں۔

دنیا کے تین مشہور براعظموں کے سنگم پر ''گریٹر اسرائیل'' کے نام سے دجال اکبر کی سربراہی میں پورے روئے ارض پر حکومت کرنے والی یہودی ریاست کا نقشہ۔ مسلمانوں کی غیرت کو جھنجھوڑنے والی بات یہ ہے کہ مدینہ منورہ سمیت ارض حرمین کا بہت سا حصہ اس نقشے میں شامل ہے۔

یہودیوں کی خیالی ریاست کا خاکہ

ذلت و خواری کی ماری ہوئی قوم کا خیالی پلاؤ

دریائے نیل کا طاس (ڈیلٹا)

اسکندریہ
پورٹ سعید
فلسطین
لبنان
بیروت
دمشق
شام
حیفا
تل ابیب
القدس
اردن
معان
عقبہ
سامراء
بغداد
کربلا
عراق
دریائے دجلہ
دریائے فرات
کرمنشاہ
ہمدان
خرم آباد
کویت
نہر سویز
صحرائے سینا
کوہ طور
تبوک
بحر احمر
صحرائے نفوذ
سعودی عرب
حائل
رفعا
صحرائے دھناء
تیماء
مدینہ منورہ
مصر
دریائے نیل

اسرائیل کا جھنڈا
نیلی لکیریں (دریاؤں) کے وسط میں ستارۂ داؤدی

لبنان کا جھنڈا
جس پر صنوبر کا درخت بنا ہوا ہے

یہودیوں کی خیالی ریاست کی حدود اربعہ

یہودیوں کے منصوبے کے مطابق اسرائیل کی اصل حدود لمبائی میں صنوبر کے درخت والی زمین (لبنان) سے کھجور کے درخت والی زمین (مدینہ منورہ) تک، اور چوڑائی میں دریائے دجلہ سے دریائے نیل تک ہے۔ درج بالا نقشے میں اس خفیہ منصوبے کو آشکار کیا گیا ہے۔

صہیونی ریاست کا مجوزہ منصوبہ: درجہ بہ درجہ قدم بقدم

عظیم تک اسرائیل
درجہ بہ درجہ پیش قدمی
مقبوضہ فلسطین (اسرائیل کی موجودہ حدود)
شہر
حدود مملکت
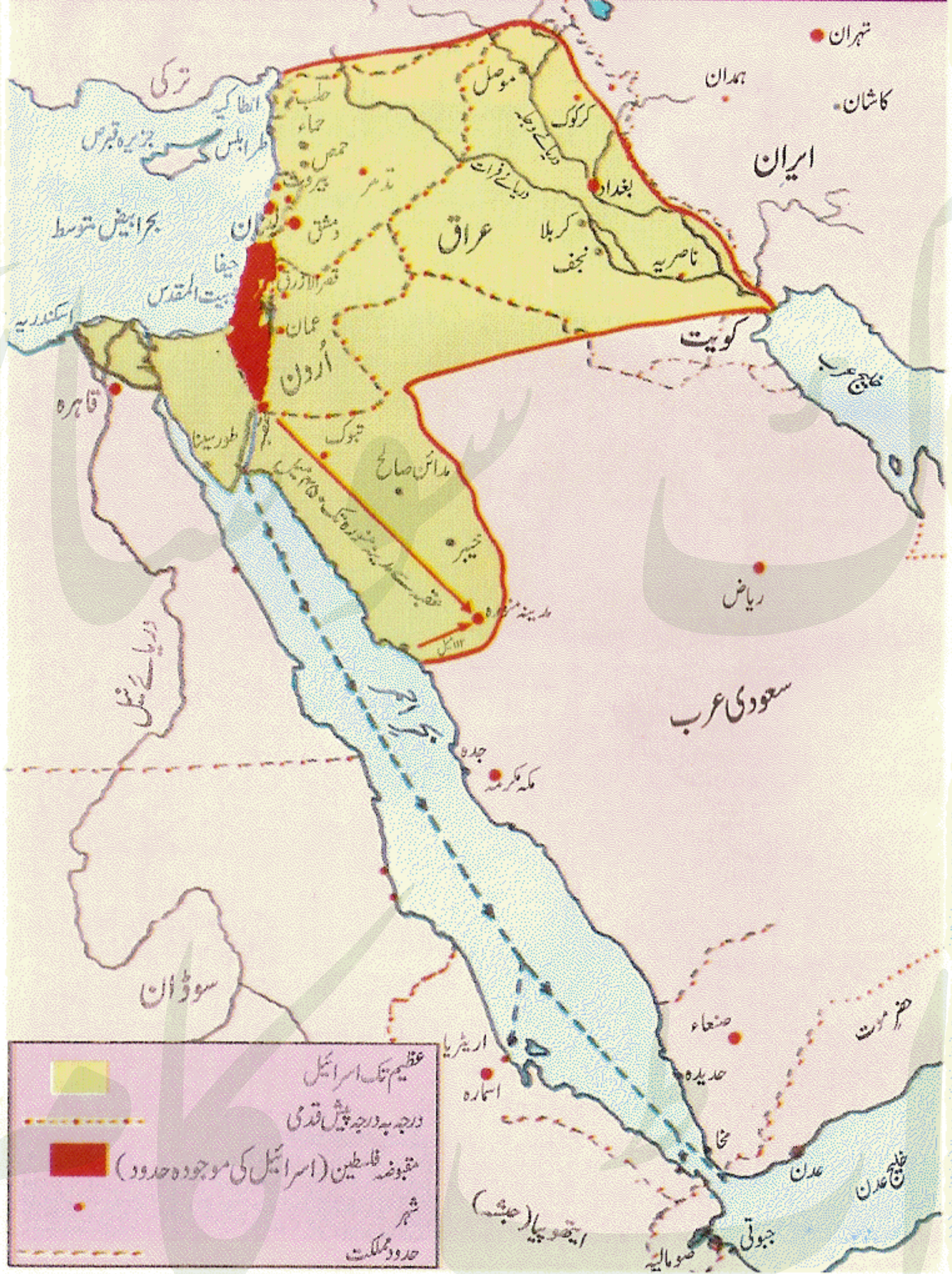
اس نقشے میں دکھایا گیا ہے کہ یہود اپنے سازشی ذہن اور بے تحاشا سرمائے کے بل بوتے پر اپنے ناپاک مقصد کے لیے قدم بہ قدم پیش قدمی جاری رکھے ہوئے ہیں جبکہ مسلمانانِ عالم ان کے ارادوں سے غافل اور القدس سے لاتعلق ہیں۔

دیے گئے نقشے سے معلوم ہو رہا ہے کہ عالمِ اسلام کے تینوں مقدس مقامات کے چاروں طرف امریکا اور یورپ کی اہم فوجی طاقتیں براجمان ہیں۔ یہ طاقتیں عظیم تر اسرائیلی ریاست کے قیام میں اسرائیل کو مدد دینے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ یہ صورتحال سارے عالمِ اسلام کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

اسرائیلی پارلیمنٹ کا اندرونی منظر۔ اسپیکر کی پشت پر موجود پتھر کی سِل میں گریٹر اسرائیل کا نقشہ کندہ ہے۔ اسرائیل دنیا کا وہ واحد ملک ہے جو علی الاعلان دوسرے ملکوں پر قبضے کی باتیں کرتا ہے اور کھلم کھلا ان دعوؤں کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ عراق پر قبضے اسرائیل نے اپنے مشن کی طرف ایک اور قدم بڑھالیا ہے اور افسوس کہ ان قدموں کو پیچھے دھکیلنے کی ذمہ داری جن پر تھی وہ اس دجالی ریاست کی مدد پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ہمیں اس وقت سے ڈرنا چاہیے جب روزِ قیامت ہمارا نام بھی ان لوگوں میں پکارا جائے جو کسی حوالے سے ان شیطانی منصوبوں کا حصہ تھے۔
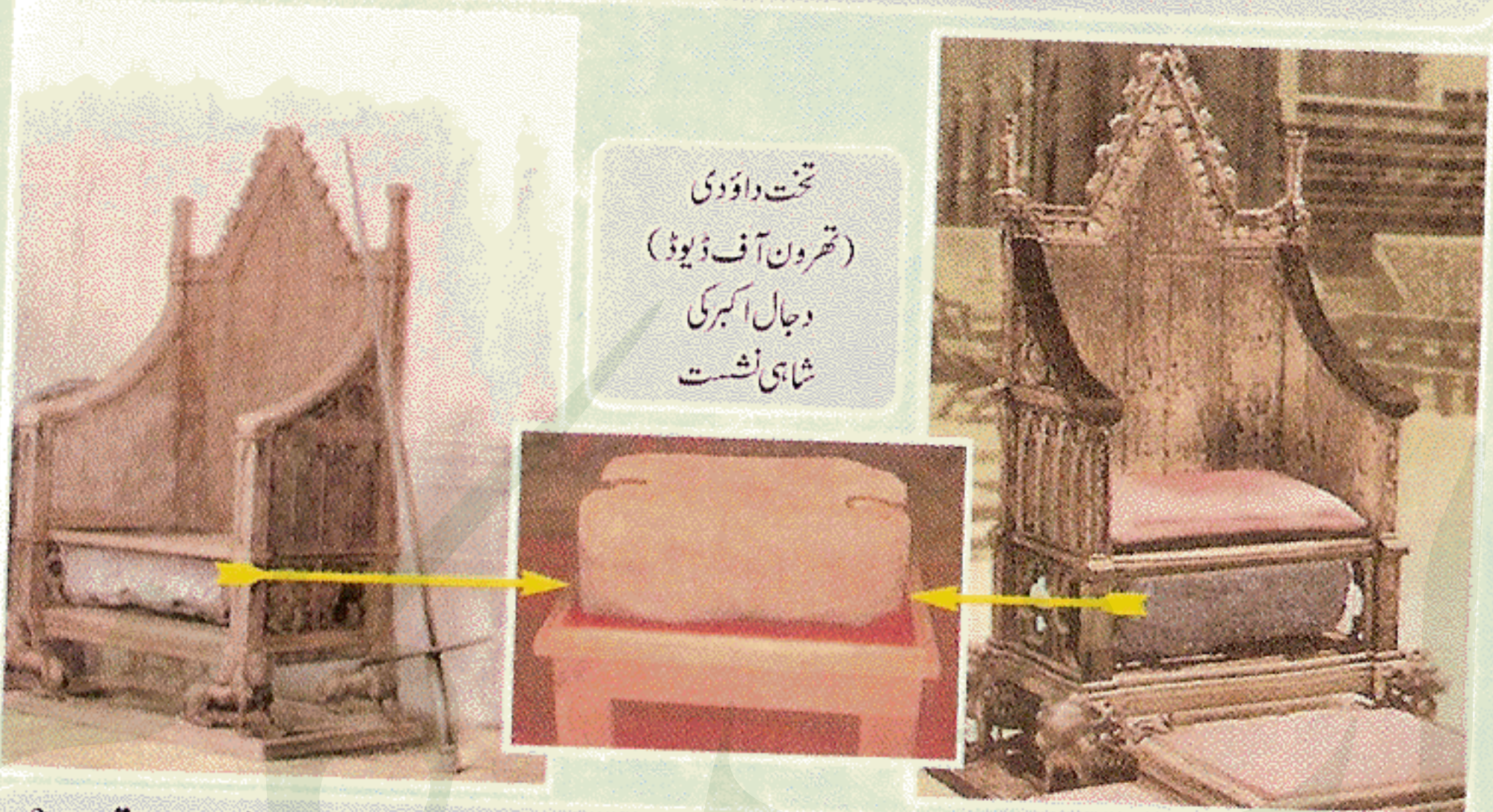
تخت داؤدی
(تھرون آف ڈیوڈ)
دجال اکبر کی
شاہی نشست

یہودیوں کی مذہبی داستان کے مطابق تخت داؤدی (تھرون آف ڈیوڈ) سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام سے منسوب وہ پتھر ہے جس پر بیٹھ کر نسل داؤدی کا آخری عالمی حکمران ''دجال'' حکومت کرے گا۔ یہ پتھر آج کل ملکۂ برطانیہ کی شاہی کرسی میں نصب ہے۔ برطانیہ کے عیسائیوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ جس قوم کی مدد کر رہے ہیں وہ ان کے تخت شاہی کے درپے ہے۔ اس کی پہلی تصویر حقیقی ہے، دوسری آرٹ ورک۔ درمیان میں یہ پتھر الگ سے دکھایا گیا ہے۔ شاہی کرسی کے پائے چار شیروں کی پشت پر ٹکے ہوئے ہیں، ساتھ میں صلیب کی شکل کا عصا دھرا نظر آ رہا ہے جو اہل برطانیہ کے ''غیر متعصب'' ہونے کا بھرپور ثبوت ہے۔
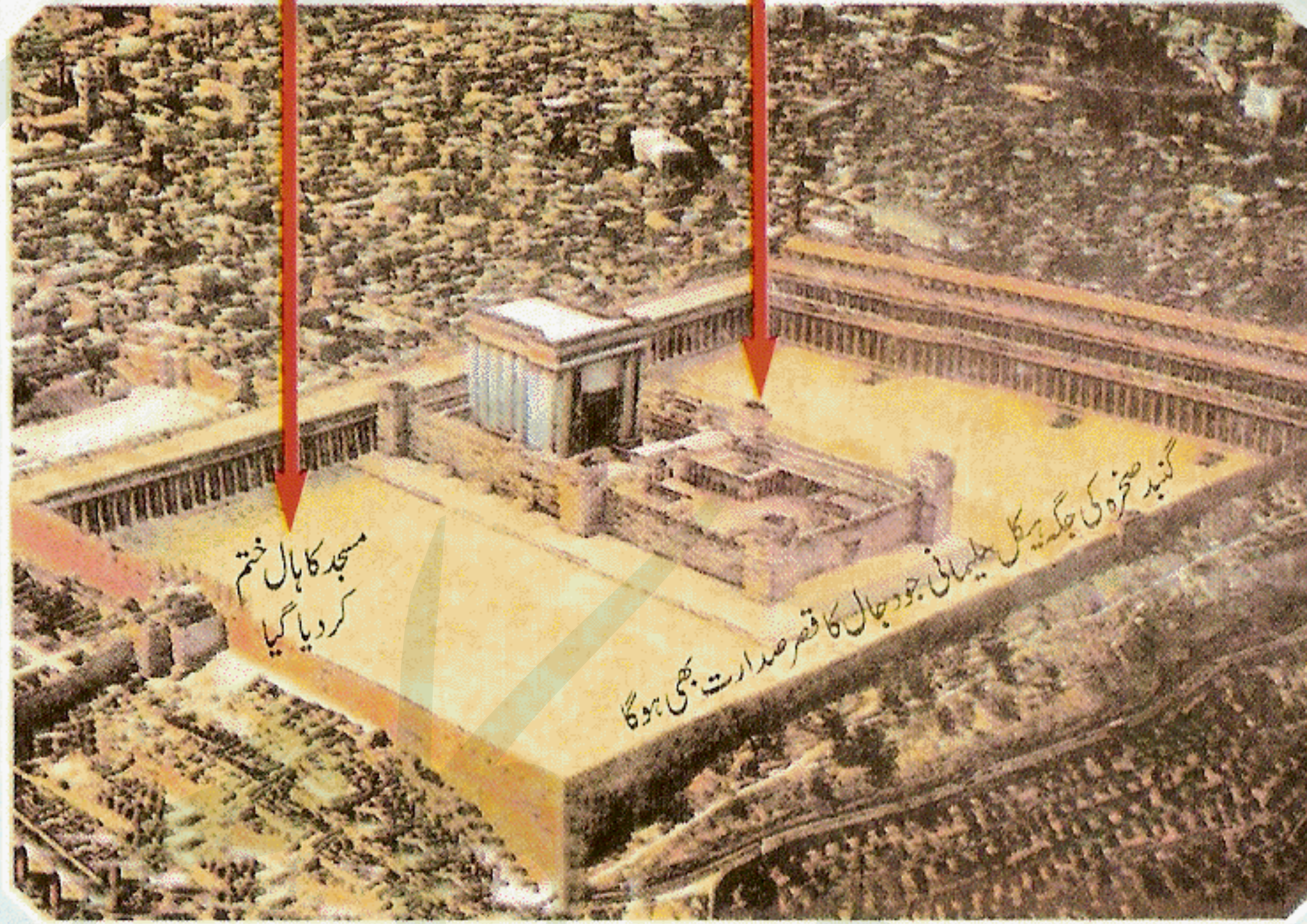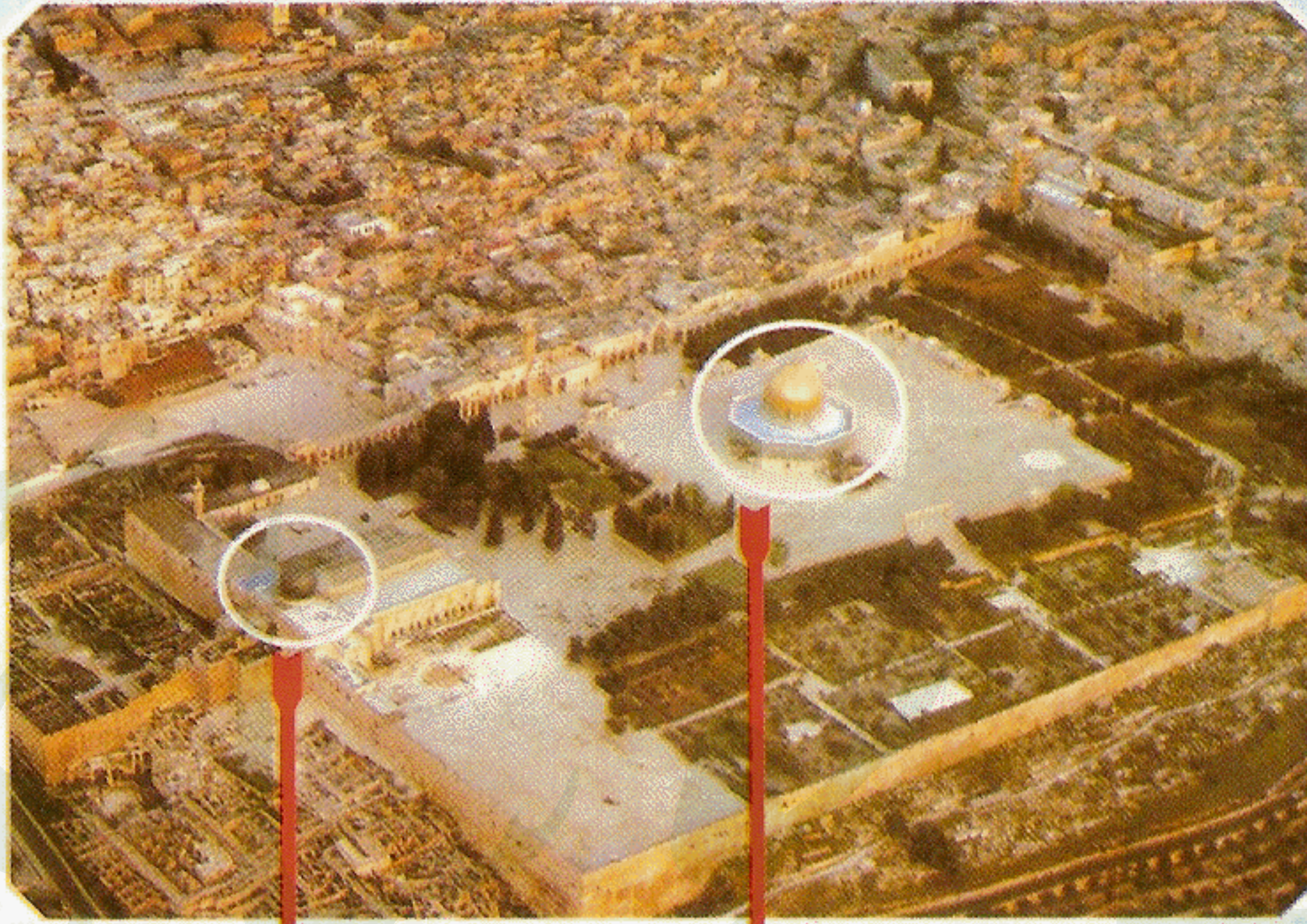
اوپر مسجد اقصیٰ کا روایتی حسن اپنی آب وتاب اور رعنائی و جمال کے ساتھ جلوہ گر نظر آ رہا ہے۔ نیچے ''ہیکل سلیمانی'' (سولومن ٹیمپل) کا وہ خیالی ماڈل جسے مسجد اقصیٰ کی مبارک جگہ پر قائم کرنے کے لیے یہود اپنا پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ اے اہل اسلام! اس صورتحال کا علاج ترکِ منکرات اور جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ کیونکر ممکن ہے؟
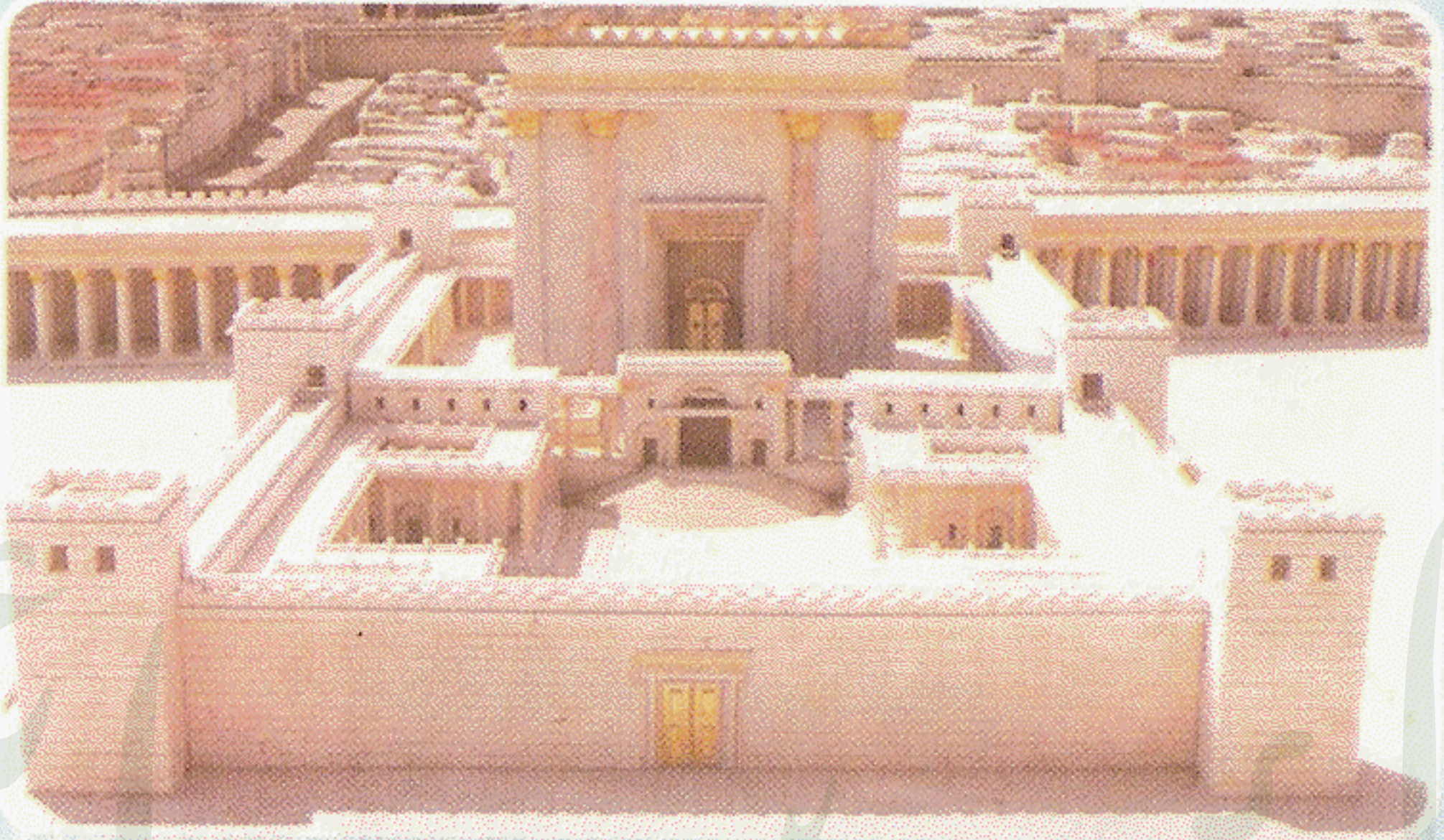
یہود کے خیالی منصوبے ''ہیکل سلیمانی'' کا ماڈل۔ اس مہم کے لیے بیسیوں تنظیمیں امریکا و یورپ میں چندہ کر رہی ہیں اور درجنوں دہشت گرد گروپ طرح طرح کے منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان کی راہ میں دو ہی رکاوٹیں تھیں ایک تو دینی مدارس جو امت کو روحانی غذا فراہم کر کے بے دینی کی یلغار سے بچاتے اور اسلام کی طرف کھینچ کھینچ کر لاتے تھے۔ دوسرے مجاہدین جو ''القتال'' کا فرض زندہ کر کے دشمن کے دانت کھٹے کرتے اور اسے جامے میں رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ اب مجاہدین کو دہشت گردی کے الزام اور مدارس کو ''اصلاح'' کے بہانے راستے سے ہٹانے کی مہم جاری ہے جو مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔

یہودیوں کا درخت جسے عربی میں ''غرقد'' اور انگلش میں ''Boxthron'' کہتے ہیں۔ یہ پندرہ سال میں پورا جوان ہو جاتا ہے اور اسے قریب قریب لگایا جائے تو دیوار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا پھل بدمزہ اور نہایت بدنما ہوتا ہے۔ یہودی حکومت نے گزشتہ سالوں میں بڑے پیمانے پر اس کو کاشت کیا ہے کیونکہ حدیث شریف کے مطابق قیامت کے قریب یہودیوں کے قتل عام کے وقت یہ درخت ان کو پناہ دے گا...... لیکن افسوس کہ یہودیوں نے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سچی پیش گوئی کے حاصل مطلب پر غور نہیں کیا کہ جو یہودی ایمان نہ

دریائے اردن کا دلفریب نظارہ۔ یہ وہی دریا ہے جس سے گذرتے وقت حضرت طالوت کے لشکر کا امتحان ہوا تھا۔ اللہ کا حکم پورا کرنے والے تین سو تیرہ افراد نے اسے پار کرکے جالوت کے ٹڈی دل لشکر پر فتح پائی اور اللہ تعالی کا حکم توڑنے والے اپنی جگہ پڑے رہ گئے۔

''لُدّ'' نامی مقام پر اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب کے قریب بن گوریان انٹرنیشنل ایئرپورٹ۔ ایک صحیح حدیث شریف کے مطابق دجال 'لُدّ' کے دروازے کے قریب مارا جائے گا۔ آج کل ایئرپورٹ کسی شہر کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔

ایک ڈالر کے امریکی نوٹ پر جو نشانیاں اور علامات ہیں ان سے متعلق Freemasonry نامی کتاب کا یہودی مصنف W. Kirk لکھتا ہے: ''انقلابی زمانے کے محبّ وطن امریکیوں کا تعلق زیادہ تر فری میسن سے تھا۔ امریکا کی عظیم مہر ایک ڈالر کے نوٹ پر چھپی ہوئی ہے جس سے فری میسن کے کئی اصولوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک ڈالر کے نوٹ کے دائیں جانب ایک شاندار جاگیرداروں کے نشان کی نمایندگی کرتا ہے جو کہ یونانی دیوتاؤں سے متعلق ہے۔ اس کے نیچے ایک کتاب بنی ہوئی ہے جو کہ روح یا عالم ارواح کا نشان ہے۔ اس کے بالکل نیچے سدا بہار درخت کی ایک بالی ہے جو کہ امن کی یاد دلاتی ہے اور دوسری طرف تیروں کا ایک گچھا ہے جو کہ لڑائی یا جنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عقاب کے دونوں بازوں پر جس قسم کی حکومت ہے اس کو ظاہر کرتی ہے یعنی حکومت کس نوعیت کی ہے؟ اس مہر کی مخالف سمت میں چار سطحوں یا ادوار کو واضح کیا گیا ہے۔ نوٹ کے دوسری بائیں جانب اس قوت کا مقصد اور نصب العین لکھا ہوا ہے۔ یہ مقصد بتاتا ہے کہ کس طرح سے اس نے ترقی کی؟ ترقی کو انہوں نے ایک مخروطی شکل سے ظاہر کیا ہے۔ مخروطی شکل Pyramid کی انتہائی اونچائی پر ایک آنکھ کی تصویر ہے جو کہ اس قوت کا (یعنی دجالی طاقتوں کا۔ مترجم) سرچشمہ ہے اور صحیح معنوں میں یہ لادینیت کی نئی ترتیب کی طرف ترغیب دیتی ہے اور یہی متحدہ امریکا کی سب سے بڑی مہر کہلاتی ہے۔'' ان علامت پر لکھے گئے حروف ایک غیر معروف اور نامانوس زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ باشعور کہلانے والے امریکی عوام بھی نہیں جانتے کہ ان کا مطلب کیا ہے؟ ان کا مطلب جاننے کے لیے کتاب میں موجود صفحہ نمبر ۱۴۲ پر مضمون ''پُراسرار حروف'' ملاحظہ کیجیے۔

You are personally invited to A PUBLIC BIBLE ADDRESS
in the VICTORIA HALL, Akeman Street, TRING
SATURDAY, APRIL 13th, 1968 at 7.30 p.m.
entitled:-
The Miracle of Israel's Survival in The Middle East
The Hand of God in the Holy Land
Jerusalem, trodden down until THE TIMES OF THE GENTILES should be fulfilled (Luke 21). NOW DELIVERED.
A sign that Jesus Christ is soon to return to reign from Jerusalem as King over all the earth (Ps. 110).
Its importance upon your life!
Speaker Mr. F. E. Grimes
ENTIRELY FREE

☐ یہ ایک دعوت نامہ ہے جو ۱۳ اپریل ۱۹۶۸ء کو انگلستان کے ایک یہودی ادارے نے ایک تقریب کے سلسلے میں بڑی تعداد میں جاری کیا تھا۔ کارڈ کے ایک طرف مشرقِ وسطیٰ کے دو نقشے دیئے گئے ہیں، بائیں طرف والے نقشے کے اوپر تحریر ہے: ''اسرائیل ۱۹۶۷ء تک'' دوسرے نقشے کا عنوان ہے ''اسرائیل عنقریب'' اس دوسرے نقشے میں تمام مشرقِ وسطیٰ بالخصوص سارا جزیرہ نمائے عرب بشمول مکۂ معظّمہ اور مدینہ منورہ تا عدن اور خلیج فارس، اسرائیل کے زیرِ نگیں دکھایا گیا ہے۔ یہ درحقیقت ساری دنیا کے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ یہود اس جنگ میں مسلمانوں کے خلاف مسلمانوں سے ہی کام لینا چاہتے ہیں۔

☐ کارڈ پر جو عبارت تحریر ہے اس میں کہا گیا ہے: ''موجودہ نسلِ انسانی غیر یہودی (جینٹائل یعنی جانوروں کے) ادوارِ حکومت کے خاتمہ کا خود مشاہدہ کرلے گی۔ علاوہ ازیں یہودی کتب ''مقدسہ'' کے حوالے سے یہ وعید سنائی جارہی ہے: ''خدا ایک ایسی قوم کو اٹھانے والا ہے جو سخت تند و تلخ مزاج ہے اور جو بہت عجلت پسند واقع ہوئی ہے۔''

☐ دعوت نامے میں کہا گیا ہے: ''بروز ہفتہ بتاریخ ۱۳ اپریل ۱۹۶۸ء شام کو ساڑھے سات بجے وکٹوریہ ہال ایکمن اسٹریٹ بمقام ٹرنگ ایک جلسۂ عام منعقد ہورہا ہے فاتنگھم کے مسٹر گرائم تقریر کریں گے۔ تقریر کا عنوان ہوگا: ''مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل کی معجزانہ بقا و حیات'' ....ارضِ پاک (اسرائیل) پر خدا کا ہاتھ ہے۔ یروشلم اب تک غیر یہودی ادوار کے مظالم اور استیلاء کے تحت کراہتا رہا ہے۔ اب اس کی نجات کا وقت آ گیا ہے۔ مسیح نازل ہونے والے ہیں تاکہ وہ ساری دنیا پر بادشاہت کرسکیں۔ مسیح آ کر اسرائیل کی حقیقی توقعات کو اس دنیا میں عملاً جاری و ساری کریں گے، تمام دیگر مذاہب ملیامیٹ کردیئے جائیں گے اور قیامِ امن کا وہ خواب جسے آج تک کوئی حقیقت کا جامہ نہ پہنا سکا غیر یہودی دور کے خاتمہ کے بعد ایک زندہ و جاوید حقیقت بن کر سامنے آجائے گا۔''
یہ کارڈ یہودیوں کے درونِ خانہ پکنے والی کھچڑی کے اُبال کی شدت کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔
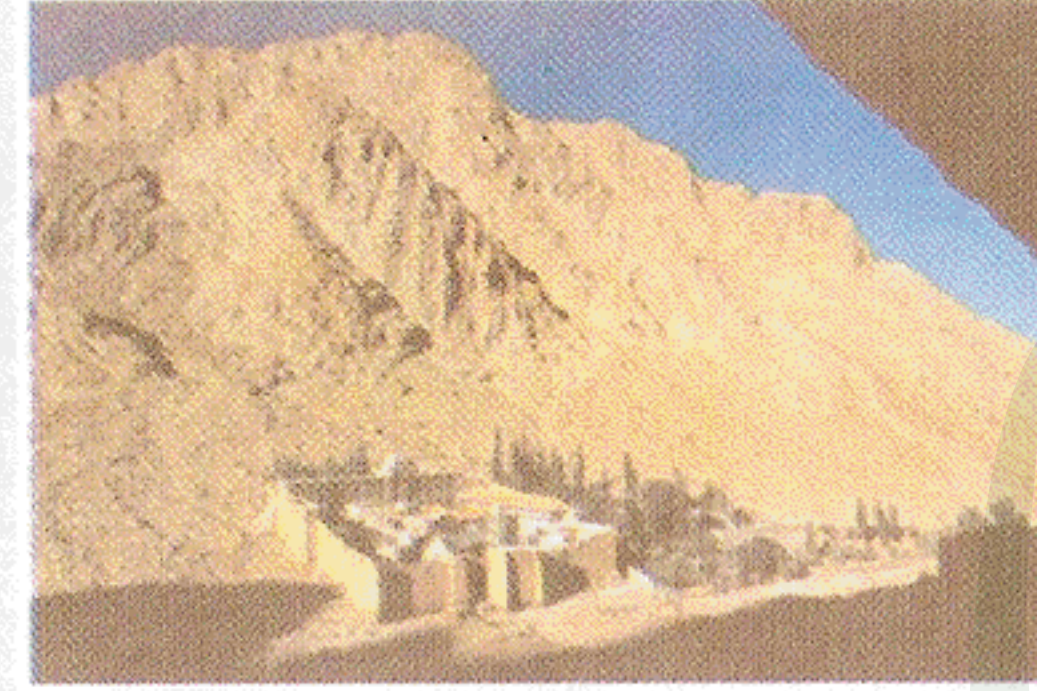
نقشے میں فلسطین اور مصر کے درمیان واقع ''صحرائے سینا'' دکھایا گیا ہے جس میں ''کوہِ طور'' واقع ہے۔ یہ وہی صحرا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ''من وسلویٰ'' نازل کیا، پتھر سے پانی کے بارہ چشمے نکالے، سائے کے لیے بادلوں کا انتظام کیا لیکن اس قوم نے پھر بھی جہاد سے انکار کیا اور اس کی پاداش میں چالیس سال تک اسی لق و دق صحرا میں بھٹکتی رہی۔ دوسری تصویر میں کوہِ طور کا ایک حصہ ''جبل موسیٰ'' نظر آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جناب موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام سے یہاں گفتگو فرمائی تھی۔ پہاڑ کے دامن میں ایک عبادت گاہ بھی نظر آ رہی ہے۔

اسرائیل کے جھنڈے پر دو نیلی لکیریں اسرائیل کی حدود کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان سے مراد دریائے دجلہ اور دریائے نیل ہیں۔ ان کے وسط میں ستارۂ داؤدی عظیم تر اسرائیلی ریاست کی علامت کے طور پر ہے۔

ایک فلسطینی بچہ اپنے پیاروں کا گرا ہوا خون دیکھ رہا ہے۔ اس کی معصوم آنکھوں میں پوشیدہ نادیدہ جذبہ یہود کے لیے موت کا پیغام ہے۔

یہودیوں کی خاص مذہبی اور سیاسی علامت ''ستارۂ داؤدی''۔ یہ دو تکونوں کو ملانے سے بنتا ہے۔ یہودیوں کے فرضی عقائد کے مطابق سیدھی تکون سے ''خدا، انسان اور دنیا'' جبکہ الٹی تکون سے ''وحی، مخلوق اور نجات'' مراد ہے۔

میرے بچے میں شرمندہ ہوں
مرے بچے تُو میری بے حسی کو درگزر کردے
کہ میں ہر روز خبروں میں
ترے پیاروں کو مرتے دیکھتا ہوں
اور میں کچھ نہیں کر سکتا
مری آنکھوں میں ہے منظر
کسی کے زندہ جلنے کا، کسی بوڑھی کے گرنے کا، کسی ماں کے بلکنے کا
کسی اک باپ کی آغوش میں بچے کے مرنے کا
ہر اک منظر کھٹکتا ہے مرے دل میں
مگر میں کچھ نہیں کر سکتا
مرے بچے تُو میری بے حسی کو درگزر کردے
بہت شرمندہ ہوں میں سامنے تیرے
میں اپنے کشت وخوں میں اس قدر مصروف ہوں ہر دم
کہ میں تیری حمایت میں دشمن سے لڑ نہیں سکتا
مری اپنی ہی جنگیں ہیں، مرے اپنے ہی قضیے ہیں
لسانی جھگڑے
علاقائی تعصب
فرقہ بندی کی کشاکش، سیاسی حکمت عملی
معاشی تنگ ودو
ہزاروں میرے جھگڑے ہیں
جو مجھ کو باندھ رکھتے ہیں
سو میں ہر روز خبروں میں
ترے پیاروں کو مرتے دیکھتا ہوں
اور میں کچھ کر نہیں سکتا
مگر مجھ کو یقیں ہے کہ
مرے بچے، تو یہ جنگ جیت ہی لے گا
دشمن کی گولیوں راکٹ بموں کے باوجود اک دن
فتح تیرا مقدر ہے!
تجھے مجھ جیسے لوگوں کے سہارے کی ضرورت ہی کیا؟
بڑی طاقت کے سب جالوت خود ہی تجھ سے ڈرتے ہیں
وہ یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ
تو اپنے دور کا داؤد ہے اور تیرے ہاتھوں میں
وہی تاریخی پتھر ہے!